# "پھر ہوا حرفِ حق سنگ زن"

تاریخ کشمیر سے متعلق چند تاثرات



سید تصدق حسین

# "پھر ہوا حرفِ حق
# سنگ زن"

تاریخ کشمیر سے متعلق چند تاثرات

مصنّف

سید تصدق حسین

پبلیشرز

کتاب محل

پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

| | | |
|---|---|---|
| ناشر | : | کتاب محل (رجسٹرڈ) |
| نام کتاب | : | "پھر ہوا حرفِ حق سنگ زن" |
| نام مصنف | : | سید تصدق حسین |
| سن اشاعت | : | ۲۰۱۹ء |
| زیر اہتمام | : | شیخ بشیر احمد |
| سرورق | : | شیخ محمد وسیم |
| مطبع | : | ینگ پبلیشنگ ہاوس دہلی |
| آئی۔ایس۔بی۔این | : | 978-93-87244-21-4 |
| ای میل | : | infokitabmahal@gmail.com |
| ویب سائٹ | : | www.kitabmahalbooks.com |



شیخ بَشیر احمد اَینڈ سَنز تا جِران کتُب

"کتاب محل پبلشرز" کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دِل آزاری یا کسی کو نشانہ بنانا نہیں بلکہ اشاعتی دُنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے نظریات اور تحقیق سے متفق ہوں۔اللہ ربّ العزت کے فضل وکرم سے انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد بندی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔بشر ہونے کے ناطے اگر سہواً غلطی رہ گئی ہو یا صفحات دُرست نہ ہوں تو براہِ کرم مطلع فرمادیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں درُستگی کی جاسکے۔(ناشر)

مزید معلومات کے لئے ہمارے رجسٹرڈ آفس سے رابطہ قائم کریں

نزدیک جے اینڈ کے بینک، بٹہ شاہ محلہ
لال بازار سرینگر کشمیر-190023
Phone: 2503395 Cell: 7298807671
**Email:infokitabmahal@gmail.com**

کتاب محل
Kitab Mahal
SRINAGAR-KASHMIR

ھوا

# حرفِ حق

# سنگ زن"

(تاریخ کشمیر سے متعلق چند تاثرات)

سید تصدق حسین

# انتساب

والدہ مرحومہ حمیدہ بیگم کے نام جنہوں نے مجھے زندہ رہنے کا درس دیا، اور جن کے اورق لختِ دل پہ ایک ہی پیغام کندہ تھا۔

" تندی بار مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تُجھے اونچا اُٹھانے کے لئے !"

میں حمیدہ بیگم کو عصرِ حاضر کی عظیم ترین خاتون تصور کرتا ہوں وہ خیالِ حسن اور حسنِ عمل کا مجسم پیکر تھیں اور میرے ذہن پر انجم رخشندہ کی طرح ہمیشہ روشن رہیں گی۔ یہ کتاب 2013ء میں تحریر کی گئی تھی لیکن شائع نہ کی جاسکی۔ یہ کتاب صرف پندراں دنوں میں ( ماہِ رمضان ) میں تحریر کی گئی اور دوسرا مقصد کشمیر سے متعلق تاثرات کو ادبی زبان میں لکھ کر اردو نثر نگاری میں مولانا ابو الکلام آزاد اور عبدالحلیم شرر کے اندازِ بیاں کا پھر سے احیا کرنا تھا۔ یہ بہت ہی کٹھن کام تھا۔

# باب اول

## پسِ منظر

کبھی کبھی بلکہ اکثر اوقات میں سوچتا ہوں کہ کیا غالب نے یہ سچ کہا ہے کہ "میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی"۔ یہ صرف ایک خاص صورت خرابی کی ہے یا مکمل پیکر، مکمل نقشہ خرابی کا کبھی کبھی میں سوچتاں ہوں، کبھی کبھی دل میں خیال آتا ہے، کبھی کبھی تصور میں انوکھے خیال کا پرتو ہی اُبھرتا ہے کہ میری زندگی اب جب کہ میں پیری کے منازل طے کرتا رہا ہوں۔ میرے اپنے اس شعر کا مفہوم تو نہیں:

آب روان کے ماتھے یہ ایک کہانی رقم ہوئی
انجام سے ہی آغاز ہوا، آغاز سے پہلے ختم ہوئی

یہ زندگی سی رائیگان تو نہیں؟ کنارے ساحل کے ریت نچوڑ کر بھی جو اپنی پیاس بجھا نہیں سکتی؟ زندگی بے معنی صبح وشام کا تسلسل تو نہیں!۔ پرافشاں خیالات کا سیلِ روان تو نہیں؟ سوز نہان کی وہ آتش خاموش تو نہیں، جو شمع فروزان کی طرح طاق پر روشن ہے۔ مگر اس طرح پگھل رہی ہے کہ اس کا اپنا وجود تک باقی نہیں رہتا۔ شمع زاد خود نہیں ہوتی۔ اس کا آتش پیکر، فریادی نہیں ہوتا۔ اس کی جان ہائے تنہائی، شب کی خاموشی میں خود کو جل کر۔ اپنے گرد وپیش کو نور عطا کرتی ہے۔ اس کی مصیبتو میں بھی اس کی شوخی ادا، پروانوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہی زندگی کامیاب ہے۔ میری والدہ مرحومہ حمیدہ بیگم نے ایک ایسی ہی زندگی گزاری اور مجھے زندگی کو صحیح طور پر سمجھنے کا

شعور عطا کیا۔ میری زندگی جتنی بھی گزری مگر ایک اضطرار سے آشنا رہی ، اور یہ اضطراری کیفیت ہر اختیار شوق کی روح روان ہوتی ہے۔ اگر مجھے کسی چیز نے زندہ رکھا ہے وہ اس اضطرار نے ۔ جو میرے احساس کے رگ و پے میں سما گیا ہے۔ اس لئے میں اپنے گردو پیش سے، ایسے حالات سے، ایسے ماحول سے غافل نہیں رہ سکتا، جس میں میں جی رہا ہوں۔ میں نے زندگی کے مراحل اپنا ( کیرئیر) بنانے میں صرف نہیں کئے۔ ہمارے ماحول میں کیرئر (Career) بنانا اولین ضرورت تسلیم کیا جاتا ہے لیکن میں نے اپنا کیرئر بگاڑنے میں کوئی دقیقہ فیرو گذاشت نہیں کیا۔ چونکہ میری والدہ محترمہ نے مجھے حرف حق کہنے کی تلقین کی تھی۔ حرفِ حق کہنے کے لئے سخت جانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ رنج والم اٹھانے کا حوصلہ چاہیے۔ مشکلات اور دشواریوں سے سمجھوتا کرنے کا عزم درکار ہے۔ یہ فرہاد کا کوہِ بے ستون کھود کر قیصر شیرین تک نہر لانے سے زیادہ دشوار گزار کام ہے۔ اس کے لئے صرف جذبۂ شوق نہیں بلکہ اخلاق اور اقدار کو استوار کرنے کی ضرورت ہے اور اخلاق اور اقدار کا پہلا درس بچہ ماں کے قدموں پر بیٹھ کر حاصل کرتا ہے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ میری والدہ کا تعلق پڑھے لکھے گھرانے سے تھا اور خود بھی پڑھی لکھی خاتون تھی اور پڑھنے لکھنے کا شوق انہیں ورثہ میں ملا تھا۔ وہ حقیقی معنوں میں آدرش پسند تھیں اور انہیں دنیاوی شان وشوکت اور جاہ وجلال میں کوئی گنجینۂ جوہر نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہتی تھیں کہ ایک اچھی زندگی صرف حسن وعمل اور بلند نگاہی کی مرہون ہوا کرتی ہے۔ وہ رسوم اور قیود کے قید میں انسان کی فطرتی صلاحیتوں کا زیان دیکھتی تھیں، اور صاحب عقل کبھی ان مصائب میں اپنی ہستی کو مبتلا کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوسکتا۔ ہمارا گھرانہ متوسط طبقہ سے منسلک تھا۔ ہم چار بھائی اور ایک ہمشیرہ اپنے گھرانے کے اجزائے پریشان بن گئے تھے اور ہماری

والدہ نے ہمیں منتشر ہونے سے بچانے کے لئے ہم پر اپنی ساری توجہ مرکوز کی اور اپنی نجی تمناؤں اور آرزوؤں کو طاقِ نسیاں کر دیا۔ اپنی ساری زندگی ہماری دیکھ بھال میں صرف کردی۔ والد عدلیہ میں جج کے عہدہ پر فائز تھے مگر انہوں نے کبھی بھی ہماری والدہ کی ہمت دشوار پسند کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش نہ کی۔ ہمارا تعلق سید محمد فاضل سخی دل کی شاخ سے ہے۔ جو علاقہ خانیار کشمیر (یعنی آجکل ایک محلہ شہرِ سرینگر میں ہے) مدفون ہیں اور اپنے زمانے کے جید صوفی بزرگ تصور کئے جاتے تھے اور جنہوں نے اپنی ساری زندگی وادیٔ کشمیر میں اسلام کی ترویج میں گزار دی۔ اس لئے ہمارے ماحول میں ایک اعتدال پسندی کا رجحان تھا۔ آرائش اور تکلفات اور دولت زدہ انسانوں کی نفسیات اور سر گشتۂ خمارِ ستائش گرون اور مداح خانوں کا نہ تو ماحول تھا اور نہ ہی رواج۔ والد ناک کی سیدھ پر چلنے والے تھے۔ صاف گو، راست باز اور ایماندار جج تصور کئے جاتے تھے۔ ایسے ماحول میں ہمیں چھوٹے پن سے ہی دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھنے کا درس ملا اور ہم نے جانا کہ دنیا میں نا امیدی اور مایوسی کوئی معنی نہیں رکھتے، افسردگی کی آرزو جو غیر شعوری طور پر انسان اپنا لیتا ہے ایک بے معنی سی چیز ہے اور کارگاہ زندگی میں زندہ رہنا خود ایک فن ہے اور غالب کی زبان میں:

"ہے تجلی تیری سامانِ وجود" اس لئے محرومی انسان کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتی اور گردشِ ایام ایک فطری عمل ہے۔ جہاں صرف خوب سے خوب تر ہونے کی تمنا انسان کی رہنمائی کرسکتی ہے اور قطرے پہ گہر ہونے تک، کی سعی کبھی لاحاصل نہیں ہوتی۔ اس لئے فتح اور شکست کوئی معنی نہیں رکھتے۔ یہ صرف انسان کی سوچ کے زاوے ہیں۔ اصل چیز خوئی عمل ہے۔ انسان کبھی تن وجود ہو نہیں سکتا۔ یہ کائنات انسان کے لئے تخلیق ہوئی ہے اور اس لئے انتہائی خوبصورت ہے اور اس لئے انسان اس

کائنات کی دولت لازوال کا وارث ہے۔ جو انسان کو کبھی ناشاد نہیں کر سکتی ہے۔

شہنشاہ ہو یا دریوزگر:

شب ہوئی انجم زخشندہ کا منظر کھلا

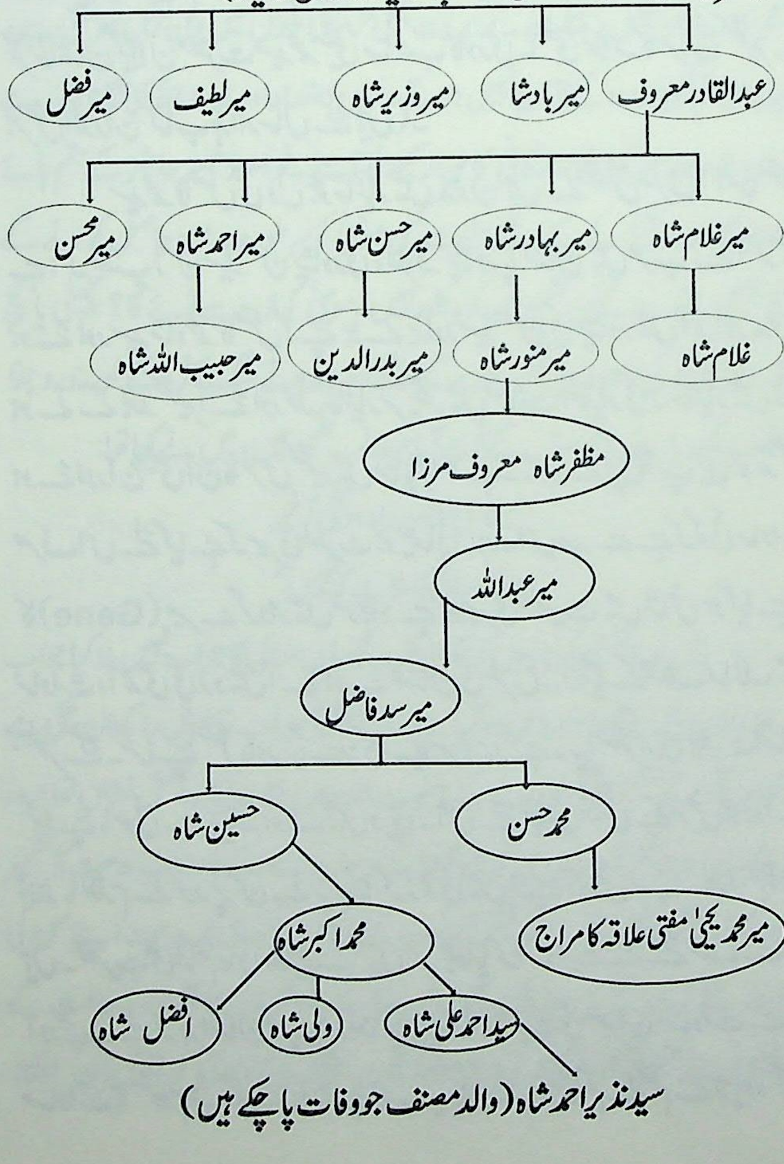
اس تکلّف سے کہ گویا بُت کدے کا در کھلا

مجھے۔۔اور امید کا رشتہ خون رنگ جان دِکھتا ہے یا میرے افکار کی روح میں پیوست ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شاید اس لئے کہ میرا تعلق گیلانی سادات سے ہے۔ معرکۂ کرب اور بلا کے بعد سادات پر مصائب اور آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ پہاڑ چکنا چور ہوئے، مگر سادات کے عزم میں کوئی لغزش دکھائی نہ دی۔ حضرت امام حسین کو میں نے امام آعظم تسلیم کیا ہے۔ چونکہ انہوں نے ہمیں علو ہمتی کا درس دیا ہے۔ ان کا عظم ثبات کو ہسار سے زیادہ گہرا اور وقیع تھا۔ صرف علو ہمتی انسان اور انسانیت کو صرف قوت اور حوصلہ عطا نہیں کرتی۔ بلکہ حالات کے طوفان اور حوادث کو موجۂ بے مایۂ بنا دیتی ہے۔ اس لئے مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ نامِ حسین میرے رگ و پے میں سما گیا ہے۔ میں خوش ہوں میرا نام حسین سے معنون ہو گیا ہے۔ میں زندگی میں جب بھی معرکۂ کرب و بلا سے گزرا۔ یادِ حسین میرا معاون ثابت ہوئی اور میری مشکلات کاہِ پُر افشان کی طرح بکھر گئیں۔ جو حسین کی عظمت کا قائل نہیں وہ شخص کبھی بھی انسان نہیں ہو سکتا، چونکہ انسانیت کا فلسفہ حسینیت ہے اور حُسینیت مشکلات سے گریز ہونا نہیں سکھاتی۔ وہ ماتم یاراں نہیں سکھاتی۔ بلکہ حق کی راہ میں قربان ہونا ہی نہیں۔ بلکہ شُکر خُدائے جلیل کا عنوان بننا سکھاتی ہے۔ انسانیت کے اصولوں کے لئے قربان ہونا حسینیت ہے۔

حُسین ہجوم رحمتِ مجسم تھے۔ عرش آعظم پر فرشتوں کو حُسین نے عظمتِ

آدمیت کی متاع بے پایاں عنایت کی اور حکمتِ یزدان کی عملی تفسیر پیش کی۔ اس لئے میرا آدرش ہمیشہ حسین رہے ہیں۔ کسی صاحب نے پاکستان میں سادات گیلانیہ کا تذکرہ اور میرے خاندان کا شجرہ بھی شائع کیا۔ متن اقتباس پیش کرتا ہوں۔

شجرۂ شریف سخی شال محمد فاضل صاحب خانیار (مدفون خانیار)



میں نے شجرہ میں سے باقی شاخوں کے اولادان کا تذکرہ طوالت کی وجہ سے بالکل حزف کر دیا ہے اور شجرہ کو بہت مختصر کیا ہے۔ صاحب کتاب نے شجرہ کے ساتھ ایک نوٹ درج کیا ہے جس میں لکھا ہے:

نوٹ: یہ شجرہ شریف اور مندرجہ ذیل حالات جناب والا۔ جاہ حقائق و معارف آگاہ، فخر خاندان گیلان حضرت سید محمد یحییٰ صاحب قادری۔ مفتی علامہ کامراج کشمیر نے بغرض اندراج کتاب ہذا ارسال کئے ہیں)۔

سید محمد فاضل سخی دل جو خانیار میں مدفون ہیں کے متعلق صرف 'آمنا' لکھا ہے: کہ قطب زمن سید حسن پشاوری، علاقہ پشاور پاکستان میں عرب سے آکر مقیم ہوئے اور سید شاہ محمد فاضل اپنے بڑے برادر سید حسن کی پشاور میں آمد اور مدفون ہونے کے بعد کشمیر آئے اور محلہ خانیار سرینگر میں سکونت اختیار کی۔ خانیار میں دفن ہوئے اور آج بھی اُن کا عرس کشمیر میں منایا جاتا ہے۔ میں نے اپنی آپ بیتی کا تذکرہ صرف اس لئے کیا ہے کہ میری فطرت جو سیمابی ہے۔ اس وجہ سے ہے کہ کوئی سادات کا (Gene) میرے کردار میں موجود ہے جو میری شخصیت میں شامل ہو گیا ہے۔ سادات، آندھی کی زد میں آئے ہوئے گلستان کی طرح۔ ایشیا کے مختلف مما لک میں بکھر گئے۔ مگر اپنے شش اور پنج سے کبھی بے بہرہ نہ رہے۔ یہ اضطراری کیفیت انسان کو اپنے ماحول سے بیگانہ ہونے نہیں دیتی۔ اس لئے تجاہل پیشگی کے مرض لادوا سے حفظ ماتقدم کے طور پر من نے یہ جانا کہ زندگی میں اپنے آدرش سب سے اہم اثاثہ ہیں۔ حضرت علی امام عالی مقام نے ہمیں یہ سمجھایا کہ انسانیت کے لئے سب سے اہم آدرش یہ ہے کہ ہر انسان کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انسانیت کی معراج مساوات ہے اور مساوات کا مفہوم تب سمجھ میں آتا ہے جب یہ جان لیں کہ ظالم کے ظلم سے زیادہ سنگین

معاملہ مظلوم کا ظلم سہنا ہے۔ ظالم کو ظالم کہنا۔ انسانیت کا فرضِ اولین ہے۔ یہ وہ عوامل ہیں جنہوں نے میرے ذہن کو کشمیر کی مظلومیت کے فلسفے کو سمجھنے پر مجھے آمادہ کیا۔ کشمیر کی تاریخ کا جب میں نے جائزہ لیا تو مجھے شب وسجود کی تاریکی پھیلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

میں نے ظلم اور بربریت اور بہمانہ نظام کا تاریخی تسلسل دیکھا ہے اور ظلم کبھی زیرِ دامان نہیں رہتا ہے۔ بربریت کبھی حریری ملبوس میں دفن نہیں ہوسکتی ہے۔ بہیمانہ عزائم کسی حدود کے محتاج نہیں ہوتے۔ جبر واستداد اور جور و جفا کا ننگا ناچ یہ ہے انسان جور اور جبر کو اپنی زندگانی کا سہارا سمجھ لیتا ہے۔ فراعنۂ عصر حاضر کے ستم ہائے گران کا حصار توڑنے کے لئے مشیت کسی موسیٰ کو سرطور وجدان حاصل کرنے کے لئے بھیج دیتی ہے۔ لیکن کشمیر میں کوہِ طور نہیں، موسیٰ کہاں سے آئے گا؟ پچھلی پانچ کے لئے وقت کی راہوں پر کشمیریوں کے لئے فطرت نے سنگِ میل کے طور جور و جفا کو نصب کردیا ہے۔ اسی جذبہ کے تحت آیام طالب علمی میں، میں نے کہا تھا:

"ناکامی نشان راہ ہوگئی آخیر

پتہ کامیابی کا ملا ہے کہ نہیں"

میں برملا تسلیم کرتا ہوں کہ آج تک مجھے اس سوال کا جواب نہیں ملا کیا جواب دینے والا سماج بے گانۂ احساس ہوگیا ہے۔ کیا آتش ضمیر اب خاموش راکھ بن چکی ہے۔ شہر سرینگر کے متصل شنکر آچاریہ کے نام سے موسوم پہاڑ جو ایک آتش فشاں تھا مردہ ہوچکا ہے، ورنہ شنکر آچاریہ اپنی گہری تپسیا کے رموز جاننے کے باوجود بدھ مت کا کشمیر سے خاتمہ نہ کرسکتے تھے۔ لیکن شنکر آچاریہ کے سنیاس لیتے ہی بدھ مت اپنے من کی دولت لئے تبت کے راستے ملک چین میں جا کے پناہ گزین ہوا تھا اور بدھ مت کے پچاریوں نے کشمیر کو متھرا کی نگری بناڈالا اور پھر وہ مشکلات کا دور آیا کہ بقول ابنِ انشا:

تم لوگوں نے چاند بُجھا ڈالا، شب ماہ کا لطف گنوا ڈالا

اب لاکھ چراغ لائیے پھر وہر رستے میں روزن میں

لیکن چراغوں سے گرد وپیش کی تاریکی دور نہیں ہوتی بلکہ ہر چراغ تلے اندھیرا ہوا کرتا ہے اور ہندو راج کا دور بھی اپنے مصائب کا کوہِ گران ساتھ لایا، اور لوگوں کے لئے تاریخ کا یہ مہیب دور حریف جان بن گیا اور ہندو راج پر پھر زوال کا سورج طلوع ہونا شروع ہوا تو ہندو راج بھی غروب ہونا شروع ہوا۔ اس زوال کے زمانے میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ رعایا کی حالت زبوں تر ہوگئی، کھیت ویران ہوگئے، بھوک ناداری اور مُفلسی عام ہوگئی۔ لوگوں کا اعتماد حکومت سے ختم ہوتا گیا اور واماندگی نے فروغ پایا۔

سچ تو یہ کہ پنڈت کُلہن کی راج ترنگنی کے سوا ادور کی کوئی مستند تاریخ موجود ہی نہیں ہے اور پنڈت کلہن کی تاریخ کسی سند یا حوالے سے بالکل عاری ہے۔ کُلہن نے کچھ تو تخیل سے، کچھ تعلیٰ سے، کچھ سنی سنائی حکایات سے کشمیر کی تاریخ کا ایک طلسم ہوش ربا قائم کیا ہے۔ لیکن اس تاریخ کے سوا اس دور سے متعلق کسی بھی ناقص یا کامل تاریخ دان کے پاس کوئی حوالہ ہی موجود نہیں ہے اور عارف اور عامی شب ہی کُلہن کے تذکروں سے کشمیر کی ماضی کی ایک تصویر پیش کرتے ہیں، جو نہ تو مستند ہے اور نہ ہی مشکوک۔ اس لئے ہر مکتبہ فکر اور دبستان سے وابستہ محقق، قطعیت سے کچھ نہ کہہ نہیں سکتے کہ کشمیر کی صحیح تاریخ کون سی ہے۔ پنڈت کُلہن کی مرتب کردہ تاریخ بھی صرف راجے مہاراجوں کی بہت ہی مشکوک قصّوں اور داستانوں پر مشتمل ہے۔ کشمیر میں پراچین زمانے کے مندر موجود ہیں لیکن اُن میں بدھ اور ہندو مت کا امتزاج پایا جاتا ہے وہ کس زمانے میں تعمیر ہوئے، کوہ کنی کا رواج کب کشمیر میں شروع ہوا اور اتنے

دیو قامت سنگ گران کن پہاروں سے اخذ کئے گئے۔ یہ مندر کب اور کیسے کھنڈرات میں تبدیل ہوئے۔ قیاس آرائیوں کا موضوع اور بحث طلب سوال ہیں۔ ہندو مورخین نے دلیل دی ہے کہ کشمیر کے سلطان سکندر بت شکن نے انہیں مسمار کیا تھا، لیکن ایسے دیو قامت سنگ سخت سے تعمیر کئے ہوئے، مندر منہدم کرنے کے لئے اُوزار کہاں سے لائے گئے ایک سوالیہ نشان ہی اُن دلائل پر لگایا جاسکتا ہے۔ کیا یہ عظیم عمارتیں کسی ناگہانی زلزلوں کی زد میں آکر زمین بوس ہوگئیں؟ عصرِ حاضر کے تاریخ دانوں کے لئے مہم انگیز سوال ہے، اور اگر کشمیر کی تہذیب اسے عروج پر تھی تو مندروں کے سوا آج اور کوئی تعمیر، یہاں تک کہ راجاؤں کے محلات کا بھی کوئی وجود نہیں مل سکتا، اور رعلاقہ ناڑہ نار کا مندر اور بھی حیران کُن ہے کہ دشوار گذار پہاڑ کے دامن میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جہاں آج کچھ گوجر قوم کے لوگ آباد ہیں۔ صرف قیاس کی بنا پر تاریخ کے ماخذ اخذ کئے گئے ہیں۔ لیکن قیاس کا تعلق دلائل سے ہونا ضروری ہے۔

مندروں کے کھنڈرات اس بات کا ثبوت ہیں کہ کشمیر ایک تہذ‌ب کا مرکز رہا تھا۔ وہ تہذیب کیا صرف آرائی تہذیب تھی یا بالکل الگ منفرد تہذیب تھی یہ بھی ایک تحقیق طلب سوال ہے۔ کشمیر میں بدھ مت سے قبل کون سی تہذیب اثر انداز ہوئی تھی ۔کیا کشمیری صرف آرائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں یا ان پر ناگار رسم و رواج اور قبیلوں کا امتزاج کسی زمانے میں اثر انداز ہوا بھی ایک ایسا سوال ہے جو محتاجِ تحقیق ہے۔ کشمیر اور سنسکرت زبان کے درمیان ایک اتصال ہوا۔ یہ کیسے ہوا اور کشمیری زبان کیسے وجود میں آئی یہ بھی قیاس آرائیوں پر مبنی بحث ہے۔

ہندو مت کے زمانے میں عام لوگوں کے رسم و رواج کیا تھے؟ یہ کیسا لباس پہنتے تھے۔ ان کے کھانے پینے کے عادات کیا تھے۔ ہمیں معلوم نہیں۔ یہ مہتاب رنگ

لوگ کن خیالات میں کشمیر میں آباد ہوئے۔ ہُن اور منگول قوم کے حملہ آور کیوں کشمیر پر حملہ آور ہوئے اور یہاں آباد نہیں ہوئے اور کیوں چلے گئے۔ ان کے اسباب اور عوامل کیا تھے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ آج کل DNA کی مدد سے کشمیری قوم کی نسلی شخصت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کشمیر کی وادی کے لوگ جموں کے لوگوں سے اس قدر منفرد ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ زمانے پرار چین میں کشمیر کا کوئی تعلق پنجاب اور ہندوستان سے نہیں تھا۔ بلکہ چین اور تبت سے زیادہ قریب تعلقات قائم تھے۔ کشمیر ہندوستان کے بجائے واسط ایشیاء کے زیادہ قریب رہا ہے۔ اس لئے بدھ تہذیب نے زمانے قدیم میں کشمیر کو ایک مرکز کے طور پر اپنایا۔ یہ وہ دور ہے جب افغانستان میں بھی بدھ تہذیب ایسے عروج پہ تھی۔ پہاڑوں کی چٹانوں سے تراش کر بانیان بدھا کے بُت علاقہ سرحد یا افغانستان میں تعمیر کئے گئے تو وہی یا اسی طرز کا بدھا کا بت کرگل کے پہاڑوں میں چٹانوں پر کنندہ کیا گیا ہے اور آج بھی بیرونی سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یہ تاریخی شواہد بہت اہم ہیں کیونکہ کشمیر کا بخت رسا کیوں اور کیسے واشگون ہوا؟ آسمان دشمنی کی بدترین مثال ہے۔ کشمیریوں کا دشمن کیوں آسمان رہا؟ کیوں ان کی تہذیب تاراج ہوئی؟ اور کیوں کشمیری صدیوں سے ستم ہائے روزگار ہے۔؟ یہ سوال کشمیری دنشوروں کی توجہ کا مرکز بنا ہے۔ کشمیر کی تاریخی حیثیت کا پتہ ہندومت کے دور سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے قدیم تاریخ اور دور کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھا ہے اور اپنی توجہ ہندو دور پر مرکوز کی ہے۔ مگر بدقسمتی سے پنڈت کلھن کی راج ترنگنی کے سوا اور کوئی کتب دستیاب نہیں مگر وہ مضامین اور کلہن کے دعویٰ کی کوئی تصدیق ممکن نہیں ہے۔ کلہن کے متعلق صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ وہ خود ایک مشکوک شخصیت تھے۔ ان کے حیات اور خاندانی حالات سے متعلق کوئی شواہد یا ریکارڈ موجود

نہیں۔اُن کا تذکرہ کسی بھی اُن کے عہد کی کتاب یا ریکارڈ میں نہیں ملتا صرف اُن کی تاریخ کو تسلسل دینے والے بعد میں آنے والے جُون راجانے کیا ہے۔لیکن قاری کو یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ جون راجہ پنڈت کلہن کی وفات کے تین صد سال بعد پیدا ہوئے اور انہوں نے کہاں سے اور کس Source سے اپنی معلومات حاصل کیں تھیں وہ کسی کو معلوم نہیں۔اُن کے بقول پنڈت کلہن اس وقت کے راجہ کے ایک وزیر کے فرزند تھے۔اور سب معاملہ صرف قیاس آرائیوں پر مبنی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس وقت کشمیر میں راجا ہرشا کا دور تھا۔انگریز محقق ایم اے سٹاین کی رائے میں راج ترنگنی 1148اور 1149 A.D کے زمانے میں ضبط تحریر میں لائی گئی اور سٹاین کوئی تاریخ کی شہادت دیئے بغیر کہتے ہیں کہ چونکہ ہرشا کا دورِ حکومت 1089 سے 1101 تک تھا۔اس لئے یہ ممکن ہے کہ کلہن کے والد راج ہرشا کے وزیر تھے۔لیکن اس کی تصدیق صرف کلہن کی اپنی تحریر کردہ راج ترنگنی سے ہوتی ہے۔اس لئے کلہن نے راج ترنگنی میں راجہ ہرشا کے دور کے حالات بڑی تفصیل سے درج کئے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ کلہن نے راجہ ہرشا کے حالات اپنے والد سے معلوم کئے تھے۔کلہن اپنے چچا ''کناکا'' کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے راجہ ہرشا کو مجبور کیا کہ وہ بدھ کا بت جو پرہاس پورہ گاؤں کے مندر میں نصب کیا گیا تھا کو منہدم نہ کرے۔پرہاس پورہ کلہن کی جائے پیدائش ہے۔یہ بھی ایک تاریخی معمہ ہے کہ کلہن کا والد کشمیری برہمن گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔مگر کلہن کا چاچا ''کناکا'' مہاتما بدھ کا پجاری تھا اور پھر کلہن خود کہتا ہے کہ ''کناکا'' ہرشا کی وفات کے بعد بنارس میں ایک سادھو کے طور پر جا کر مقیم ہوا تھا۔اس زمانے میں برہمن لوگ بھی کشمیر میں مہاتما بدھ اور بھگوان شیو کی پوجا کیا کرتے تھے۔اس لئے کشمیر میں جو ہندو دھرم رائج تھا وہ بدھ

مت اور ہندو شاستروں کا ایک امتزاج تھا۔ چونکہ کشمیر میں بدھ اور ہندو شادی بیاہ کرتے تھے۔ اُن کی اولاد ہوا کرتی تھی اور عام لوگ مہاتما بدھ کا جنم دن مذہبی عقیدت سے منایا کرتے تھے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پنڈت کلہن نے راج ترنگنی بارہویں صدی عیسوی میں تحریر کی ہے اور بارہویں صدی عیسوی سے قبل کشمیر کی کوئی بھی تاریخ موجود نہیں۔ کسی کشمیری نے کوئی تاریخ مرتب ہی نہیں کی ہے اور کشمیر میں تاریخ نویسی کا نہ تو رواج تھا اور نہ ہی کوئی ثبوت ملتا ہے۔ گیارہویں صدی میں کلہانہ نے کچھ قبل زمانے کے واقعات تحریر کئے ہیں۔ لیکن وہ تاریخی کتب جن کا کلہانہ نے تذکرہ کیا ہے نہ تو دستیاب ہیں اور نہ ہی اُن کا کوئی وجود ملتا ہے۔ سن 1150 بعد از مسیح کے بعد شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان پر فوج کشی کا منصوبہ بنایا اور پھر اگلے بیس تیس سال کے دوران غوری نے ہندوستان پر حکومت قائم کر لی تھی ۔ اس سے قبل محمود غزنوی جو A.D997 میں پیدا ہوا اور A.D1030 میں وفات پا گیا۔ سترہ بار ہندوستان پر حملہ آور ہوا تھا اور بعض مورخین کے کہنے کے مطابق کشمیر میں بھی وارد ہوا تھا۔ مگر شوپیان کے قصبہ تک پہنچنے کے بعد واپس چلا گیا اور (1206 سے 1129) تک قطب الدین ایبک نے خاندان غلامان کی بنیاد ڈالی تھی اور 1290 تک خاندان غلامان ہندوستان پر قابض رہے۔ اس سے قبل سال 1001 میں محمود غزنوی نے جے پال راجہ پنجاب کو روند ڈالا تھا یہ وہی زمانہ تھا جب راٹھور راجپوتوں نے ''سر پہار'' خاندان کا تختہ اُلٹ دیا اور قنوج پر حکومت قائم کر لی تھی۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ محمود غزنوی نے پنجاب کے صوبہ پر قبضہ کر کے وہاں افغان گورنر مقرر کیا اور پھر 1191 میں تارائن کے مقام پر پرتھوی راج چوہان نے محمود غوری کو شکست دے دی تھی اور 1192 میں محمود غوری دوبارہ حملہ آور ہوا اور پرتھوی راج کو شکست دے کر

جنگی قیدی بنا کر قتل کر دیا اور اجمیر، دلی، بنارس، گوالیار اور پھر بنگال پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا تھا، اس طرح سارے شمالی ہندوستان میں ہندو راج کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ پرتھوی راج چوہان کے عروج کے زمانے میں ''کلہن نے راج ترنگنی تحریر کی تھی۔ اُس زمانے میں ہندوستان کے لوگوں کے حالات پر البرونی نے مفصل روشنی ڈالی ہے۔ لیکن کُلہانہ ان تمام واقعات سے نابلد نظر آتا ہے۔ دراصل کلہانہ اُس زمانے کا ایک ''کوی'' تھا اور شاعری اُس کا مشغلہ تھا۔ اس نے اپنا اندازِ بیان شاعرانہ رکھا ہے اور راج ترنگنی دراصل ایک ''کوی کے تخیل کا نتیجہ ہے''۔ صرف جہاں تک کُلہانہ نے اپنے عصر کے حالات تحریر کئے ہیں اُن میں کُچھ سچائی دکھائی دیتی ہے۔ کُلہانہ کی تاریخ میں جو دراصل ایک طویل نظم ہے کسی سن یا کسی سال کا کوئی حوالہ ہی نہیں ملتا ہے۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ راجہ ہرش کے زمانہ مین لوگوں پر بھاری ٹیکس عاید کئے گئے تھے اور پھر اس کے درباریوں نے سازش کر کے راجہ ہرش کو قتل کر دیا تھا، اس کے بعد جاگیرداروں کا ٹولہ (ڈامارا) بہت طاقتور بن گیا، حکومت کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ ملک میں قانون کی حکمرانی بالکل ختم ہو گئی اور افراتفری پھیل گئی۔ **A.D1143** میں کسی طور (پرسہا) اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور (جیے سہا) نے راجہ بھوجہ مبن کو جیسے دردِ ستان کے لوگ حمایت دے رہے تھے، کے ساتھ ایک اقرار نامہ **A.D1145** میں قائم کیا تھا۔ کلہانہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ کُلہانہ کی ساری زندگی کشمیر میں خانہ جنگی میں مصروف راجاؤں کے درمیان گُزری تھی۔ کُلہانہ کو کسی بھی کشمیری راجہ نے کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ اس لئے کُلہانہ نے بھی جیے سہا کی تعریف سے گریز کیا ہے، کلہانہ نے جیے سہا کے والد کے خلاف بھی کڑے الفاظ میں تنقید کی ہے اور کُلہانہ خاص طور پر (ڈامارا) طبقہ کے لوگوں کا کٹر مخالف تھا اس لئے اگر ہم کُلہانہ کی راج ترنگنی کا سرسری جائزلیں تو

ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں معاصر زمانے کے حالات کسی حد تک درست ہیں۔
مگر A.D1148 سے قبل کے حالات کی نسبت نہ کوئی سند نہ سال اندراج کیا ہے۔
اور کُلہانہ نے تاریخ کی ابتداء یوڈشٹر کے تقویم سے کی ہے ۔جس کا کوئی وجود ہی نہیں
ہے اور کُلہانہ کی مبالغہ آمیزی اور اساطیری ادب کے اثر سے مرغوب ہو کر اس نے
دعویٰ کیا ہے کہ راجہ رونادتیا تین صد سال 300 تک حکمران رہا تھا۔ جو خلافِ از عقل
ہے۔ ایسے مورخ کو قابلِ اعتماد تصور ہی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کشمیری قوم ضعیف اعتقاد
تھی اور قصوں کہانیوں پر یقین رکھتی تھی ۔لوگ جادو اور ٹونوں پر یقین رکھتے تھے۔
مارکو پولو نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ اس وقت اس کے سفر کے دوران اُس نے سُنا
تھا کہ کشمیر جادوگروں کا ملک ہے اور خود کُلہانہ نے راج ترنگنی میں اس بات کا تذکرہ کیا
ہے اور کلہانہ کی تاریخ کے مطابق بادشاہوں اور راجوں کو تلوار یا سم قاتل سے نہیں جادو
گری کے ذریعہ قتل کیا جاتا تھا۔ کلہانہ کئی جگہوں پر ایک کہانی نگار کا رول ادا کرتا ہے۔
مگر اپنے معاصر زمانے کے حالات کو کلہانہ نے بڑی ایمانداری سے بیان کیا ہے۔
کلہانہ نے اپنی ایسی تاریخی ''کویتا میں'' کوئی موازنہ یا تنقیدی اور شعوری طور حالات کا
تجزیہ نہیں کیا ہے۔ کُلہانہ کی تاریخ کے پہلے تیں ابواب یعنی جن کا تعلق میگھاوانہ، تحینا
اور پرورسینا دور سے ہے آج ناقابلِ یقین اور بالکل مشکوک دکھائی دیتے ہیں اور بعد
کے حالات کا تاریخی پس منظر آج تک متعین نہیں ہوسکا ہے۔ چونکہ کُلہانہ نے کسی سن،
سال، ماہ کا تذکرہ کرنا مناسب ہی نہیں تصور کیا ہے۔ اس کے باوجود کلہانہ نے تاریخی
واقعات سے نتائج اخذ کرنے کا کامیاب طریقہ رائج کیا اور کئی تاریخی واقعات کو اس
لئے پیش کیا کہ اُن سے سبق حاصل کیا جاسکے۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ راجہ کو چاہیے کہ وہ تمام
حالات کا جائزہ لے کر اپنی مہمات کو ترتیب دے اور دشمنان کی غلطیوں کا استفادہ

کرے وہ بڑی تفصیل سے بیان کرتا ہے کہ راجہ جیسے سہا اس لئے کامیاب ہوا چونکہ اُس نے ایسے مخالفین کی غلطیوں کا بھر پور فائدہ اُٹھایا تھا اور خاص طور پر کلہانہ نے (ڈامرون) جو جاگیروں کے مالک تھے پر اپنا عتاب ظاہر کیا ہے اور کشمیری کردار پر سخت نکتہ چینی کی ہے کہ کشمیری ایک مستقل مزاج قوم نہیں اور اپنی وفاداری حالات کے ساتھ بدل دیتے ہیں۔ کلہانہ بُنیادی طور پر شاعر تھا اور ایک محقق نہیں تھا۔ اُس کی تحقیق بہت سرسری تھی۔ اس کی زبان شاعرانہ خیالات سے معمور ہے۔ وہ ایک برہمن زادہ تھا۔ جس نے کشمیر کی تاریخ کو کُل یگ کے آئینہ میں دیکھا اور اس طرح کُل یگ سے متاثر ہو کر کلہانہ کا خیال تھا کہ کشمیر کا ماضی بہت شاندار رہا ہوگا۔ لیکن شاندار ماضی کی تائید میں وہ کوئی غیر جانبدارانہ مواد پیش نہ کر سکا ہے۔ اس کے عصری حالات کشمیری زوال کا دُور جتلاتے ہیں، جب کشمیر طوائف الملو کی اور افراتفری کا شکار ہو گیا تھا۔ عوام خانہ جنگی کی وجہ سے پریشان تھے۔ ملک کے معاشی حالات نا گفتہ بہہ تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو دور میں کشمیر کے عوام کا خوب استحصال حکمران طبقہ نے کیا تھا اور دہقانوں پر بہیمانہ مظالم توڑے جاتے تھے۔ کشمیر کی تاریخ کا ہندو دور مایوسی، انحطاط اور جمود کا شکار تھا۔ سر آرل سٹین نے کلہانہ کی راج ترنگنی پر بہت گہری اور فکر انگیز تحقیق کی ہے اور اُن کے نتائج سے میں نے استفادہ کیا ہے چونکہ پنڈت کُلہن کی راج ترنگنی سے قبل کشمیری تاریخ کا کوئی مواد موجود نہیں ہے اور کُلہن کی تاریخ کی صداقت کو کسی بھی غیر جانبدار ہندوستانی تاریخی مواد کی بناء پر پرکھا نہیں جا سکتا ہے۔ اسلئے کُلہانہ نے جو کچھ کہا، سچ کہا یا غلط کہا۔ لوگ ایسے بیان پر ہی انحصار کرتے ہیں۔ اس لئے کُلہانہ کی تاریخ کو غیر جانبدارانہ مواد کی غیر موجودگی میں نہ مستند اور نہ غیر مستند کہا جا سکتا ہے۔ کشمیری غلو پسند، یہاں تک دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندو دور حکومت میں کشمیری

سلطنت سواد کشمیر سے آگرہ راجستھان تک پھیلی ہوئی تھی اور مغرب میں پنجاب اور پشاور تک قائم تھی اور کشمیری سورماؤں نے محمود غزنوی کو بھی شکست سے فاش دی تھی۔ لیکن یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ ایسی فرضی داستانوں کے لئے تاریخ کے کوڑا گھر میں متعدد بار کھوجنے کے باوجود کسی تاریخی ماخذ کا کوئی اتہ پتہ نہیں ملتا ہے اور کشمیر کی تاریخ ایک ایسا ٹوٹا پھوٹا درپن بن گئی ہے جس میں صرف عکس تقسیم ہوتے ہیں۔ لیکن صاف طور پر نظر نہیں آتی۔ ماضی کے دُھندلے نقوش بھی وقت کے سنگ پر منقش ہونا دور کی بات ہے۔ یہ نقش اس طرح بکھر گئے ہیں کہ اب انہیں تلاش کرنا اتنا دشوار ہے کہ جیسے کوئی چراغ اندھے یگ کو نئی بصیرت دینے کی سعی لاحاصل کرے۔ کشمیر کی تاریخ نے ہمارے خوابوں سے اُن کی بصیرت چھین لی ہے۔ نئی داستانیں جو وضع کی جارہی ہیں محتاجِ تحقیق ہیں۔ پرانی تاریخ میں اپنی بلندی تلاش کرنا ایک فطری عمل ہے۔ مگر ایک قوم جو طوفانوں، شعلوں، بگولوں اور آگ کی حدت میں پلی ہے اپنی مستی کو اب ایک نئے دور کے نئے موڑ پر اپنی آرزو کے آخری سنگ میل ہی پر ڈھونڈ سکتی ہے۔ اس کی اپنی فطرت میں کوہ صحرا سے زیادہ قوی عناصر کا وجود ہونا ایک لازم امر ہے۔ اب صرف احساس آگہی کی ضرورت ہے اور آگہی کا احساس انسان کے دل و دماغ میں شب مہتاب کا نور بن کر زینہ بہ زینہ اُترتا ہے اور امیدوں کے شبستان کو اس طرح منور کرتا ہے کہ شب برات کی حکایات جمیل از سر نو پھر سے زندہ و جاوید معلوم ہوتی ہے۔ احساس آگہی قوموں کو شعورِ انقلاب بخشتا ہے' اور انقلاب میری اصطلاح میں روایت سے بغاوت کا نام ہے۔ یہ کسی شہرۂ آفاق تمثیل کے حیرت انگیز کارناموں کا نام نہیں بلکہ بغاوت تبدیل حالات کا دوسرا نام ہے۔ یہ اشاریت اور علامتی اشکال کی صورت میں جلوہ گر نہیں ہوتی بلکہ مہیب زلزلے کی طرح عصرِ حاضر کے تاج محل کو زمین بوس

کر دیتی ہے اور پھر ایک نئی تعمیر کا دور وقوع پذیر ہوتا ہے۔ جگر مراد آبادنے یہی خیال ان خوبصورت الفاظ میں اخز کیا ہے:

یہ صحنِ روشن یہ لالہ وگُل ہوتے ہیں جو ویران ہونے دو

تخریبِ جنون کے پردے میں تعمیر کے سامان ہوتے ہیں!

اس لئے کشمیری قوم کو اپنے مستقبل پر نظر مرکوز کرنی چاہیے۔ ماضی قریب ایک افسانہ ہوا کرتا ہے۔ ایک کہانی، ایک اندازِ بیان، ایک آرزِ پیکر تراش، جو ہمارے خوابوں سے ماضی کا کاغزی پیرہن بنانے میں معاون ثبت ہوتا ہے۔ ماضی واقعات نہیں بلکہ واقعات کا عکس ہوا کرتا ہے۔ جو منتشر ہو کر ہمارے ذہن کے آئینہ کو حیرت زدہ تو کرتا ہے مگر اُجاگر نہیں کرتا ہے۔ اس لئے ہمیں ماضٰ کی تلاش اور جستجو کرنا پڑتی ہے۔ یہ سعی جان گداز ہے چونکہ صیحح واقعات کو لوگ اپنی مہم اور انداز بیان سے ایک نئ شکل میں ڈال دیتے ہیں۔ ماضی کے صیحح واقعات کی دریافت بہت مشکل کام ہے اور ایک ہی واقعہ کے متعلق کئ آراء وجود میں آتی ہیں اور خارجی عوامل سے نظرئیں اوجھل ہوتی ہیں اور داخلی کیفیات ہماری بصیرت کو دُھندلا بنا دیتی ہیں۔ ہمیں وہی دیکھنا چاہیے جو ہماری آرزوٗں کی تکمیل کرے یہ فکر کی فن کار کا شاہکار تو ہو سکتا ہے مگر ماضی کا مسخ شدہ منظر نامہ یا طلسم ہوش رُبا ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے شاندار ماضی کی کہانیاں بھی حال کے ماحول میں کمزور اور نڈھال نظر آتی ہیں اور ہمیں ماضٰ کا فُسون احیا کرنے کے لئے نئے جذبہ شوق سے ماضی کو Celeberate کرنا پڑتا ہے تا کہ ہم کہہ سکیں کہ ہمارا ماضی جاوید ہے اور اپنی خواہشات کے مطابق ہم ماضی کی رنگینی کے آرائش فزون تر کرتے ہیں اور ماضی کے واقعات کی نسبت شاعر لکھنوی کی زبان میں:

آنکھ کہتی ہے کہ دیکھا ہے انہیں ایک نظر

دل یہ کہتا ہے کہ صدیوں کی شناسائی ہے!

اس پس منظر میں اب اُن حالات کا جائزہ لینا ہے جن سے ہمیں کشمیر میں اسلام کے وارد ہونے کا کچھ علم حاصل ہو۔ کچھ مورخین محض اس بنا پر کہ محمد بن قاسم نے کراچی کو مفتوح بنانے کے بعد مُلتان کا رُخ کیا ہے قیاس کرتے ہیں کہ محمد بن قاسم دراصل کشمیر پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ مگر نہ صرف قیاس ہے اور کچھ لوگ اس کے گورنر ہشام تغلیبی پر کشمیر فتح کرنے کا منصوبہ بنانے کا الزام لگاتے ہیں مگر کوئی تاریخی شہادت اُن کے قیاس کی تائید نہیں کرتی ہے اور کچھ لوگ چچ نامہ کتاب کا حوالہ دیتے ہیں جو علی بن حامد بن ابوبکر نے تحریر کی تھی اور جو زیادہ تر ''تاریخِ سندھ و ہند'' سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی ۔ مگر اصل عربی مسودہ نہ تو موجود ہے اور نہ ہی کبھی دستیاب ہو سکا ہے۔ یہ بھی ایک قیاس آرائی پر مبنی داستان ہے اور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ محمد بن قاسم کا ایک عرب سپاہ سالار کشمیر میں پناہ گزین ہوا مگر یہ صرف چچ نامہ کی بنا پر قیاس کیا جاتا ہے اور اس قیاس پر یہ مبالغہ آرائی کی جاتی ہے کہ کشمیر کے راجہ سندھ کے حکمرانوں سے گہرے تعلقات تھے ۔ اگر کشمیر کے راجہ کے سندھ کے حکمرانوں سے گہرے تعلقات تھے تو اس سے قبل اُن کے تعلقات ہمسایہ پنجاب کے حکمرانوں سے ہونا چاہیے تھے۔ یہ سب قیاس چچ نامہ پر مبنی ہے۔ مگر چچ نامہ کا اصلی عربی مسودہ دستیاب نہیں ہے اور چچ نامہ کے واقعات کی تائید اور کسی معاصر تاریخی مواد سے ممکن نہیں ہوئی ہے اور کچھ مورخین کلہانہ کی تاریخ کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کُلہانہ نے راجہ وجیر دتیا (A.D763-770) کے زمانے کے متعلق کہا ہے کہ ''اس نے بہت سے لوگوں کو ملیچھ لوگوں کو فروخت کیا تھا'' اس لئے ملیچھ کا مطلب دراصل مسلمان قوم سے ہے۔ یہ خیال

بھی انتہائی مشکوک ہے۔کلہانہ نے کشمیری تاریخ A.D1148 میں تحریر کی تھی۔کشمیر میں ملیچھ لوگ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے، کیسے آئے اور کُلہانہ کا ملیچھ سے کیا مطلب تھا؟اوراس نے حوالہ کس تاریخی مواد پر کیا ہے۔سب مشکوک اور بحث طلب امور ہیں۔کُلہانہ نے اپنے دور میں جس ہندوراج کا تذکرہ کیا ہے خود آرایل سٹین کی نظریں اس کے تخیل کی شعبدہ بازی پر مبنی ہے۔کشمیر مورخین کہتے ہیں چونکہ ملتان اور سندھ میں مسلمان حکومت قائم ہوچکی تھی اس لئے اغلب ہے کہ کشمیر کے ملیچھ بھی یہی مسلمان ہوں گے۔ یہ ساری تاریخ قیاسات پر قائم کی گئی ہے۔زیادہ کشمیری دانشور لوی مس نان Louis massignon جو کہ ایک فرانسیسی مورخ تھا جس نے منصور حلاج پر کتاب تحریر کی ہے اس کی کتاب (The Passion of Al-halla) کا حوالہ دیتے ہیں کہ منصور حلاج A.D895 میں کشمیر آیا اور ایک سال کشمیر میں مقیم رہا اور مذہبی روایات سے کشمیر کی سمجھنا چاہتا تھا اور اس لئے وہ عرب سے سندھ آیا اور کراچی سے ہوتا ہوا گجرات سے گزر کر کشمیر آیا تھا۔فرانسیسی مورخ کی اس کہانی کی تائید میں کوی عربی، سندھی، گجراتی حوالہ ہی موجود نہیں ہے۔ بلکہ کُلہانہ کی راج ترنگنی بھی اس معاملہ میں خاموش ہے۔منصور حلاج اپنی حکومت کا کام کاج چھوڑ کر ایک سال کے لئے کشمیر میں یہاں کے مذہبی حالات جاننے کے لئے کیوں آیا؟ اُس کے ہمراہ کون لوگ تھے؟ وہ کشمیر میں کن لوگوں سے ملا تھا؟ ان تمام حالات کی تائید کسی تاریخی مواد سے ممکن نہیں ہوسکتی ہے۔ بلکہ گیارہویں صدی میں کشمیر کے راجہ مسلمانوں سے تعلقات رکھنے سے خوفزدہ تھے چونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب محمود غزنوی نے ہندوستان کے راجاؤں اوسورماؤں کو فٹ بال بنایا تھا۔البرونی نے بتایا ہے کہ کشمیری ہراجنبی کو اُس زمانے میں اپنے ملک میں داخل ہونے سے منع کرتے تھے۔لیکن محمود

غزنوی کی یلغاروں کے فوراً بعد شہاب الدین غوری نے سارے شمالی ہندوستان پر قبضہ کرلیا تھا۔ کشمیر میں اسلام کے وارد ہونے کا راستہ ہموار ہو چکا تھا۔ اس کا تذکرہ راج ترنگنی کے حوالے سے دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کشمیری راجوں نے ترک سپاہ سالار مقرر کیئے تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہرشا راجہ کی فوج کے کمان دار ترک تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کشمیر کی خانہ جنگوں میں مختلف تخت کے حاصل کرنے والے گرہوں نے مسلمان ترکوں سے مدد لی تھی۔ یہ محض قیاس آرائی ہے یہ وہ زمانہ ہے جب شمالی ہندوستان کے تمام راجپوت حکومتیں ترک مہم پسندوں کے زد میں آچکی تھیں اور محمود غزنوی اور شہاب الدین غوری شمالی ہندوستان میں راجپوت حکومتوں کے پرخچے اُڑانے میں مصروف تھے۔ کشمیر کے راجپوت راجہ کہان نے اس بات کی آج تک تائید نہیں کی ہے۔ ہاں کشمیر کے پنجاب کے یا سندھ کے مسلمان سلاطین کے ساتھ تعلقات رکھنے کے بجائے وسط ایشیا کے تاشقند کے ساتھ تجارتی تعلقات تھے۔ کچھ لوگ ملیچھ لوگوں کو مسلمان تصور کر کے کہتے کہ سرینگر کے محلّہ ملچھ مر کا نام ان ہی مسلمانوں کی وجہ سے ملچھ مر پڑ گیا۔ ایسی قیاس آرائیوں کی بنیاد کشمیر کی واحد تاریخ راج ترنگنی پر قائم کی جاتی ہے جو خود ایک نہایت مشکوک دستاویز ہے اور یہ تخیل کی شعبدہ کاری ہے کہ مسلمان دور میں جو منقبت خوان اور فاتحہ خوان تھے اُن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ (کیس مہندرا) نے انہی کا حوالہ دیا ہے کہ وہ اس کے زمانے میں سڑکوں پر روزی حاصل کرنے کے لئے آوارہ گرد نظر آتے تھے۔ اس کا ثبوت بھی راج ترنگنی سے حاصل کیا گیا ہے۔ منقبت خوان یا تو عربی یا فارسی میں منقبت بیان کرتے تھے۔ لیکن کشمیر کی زبان نہ تو عربی اور نہ ہی فارسی تھی۔ اس لئے کشمیری فوج میں اگر ترک سپاہ سالار تھے وہ کون سی زبان بولتے تھے اور اگر یہاں ملیچھ آکر آباد ہوئے تھے وہ کون سی

زبان بولتے تھے۔اس کا جواب نہ تو ہمیں راج ترنگنی اور نہ ہی کسی تاریخی سندھ سے ملتا ہےاور نہ کسی بھی کشمیر مورخ نے آج تک ان ملیچھوں کی زبان دانی سے متعلق کوئی تحقیق کی ہےاور نہ ہی کوئی تاریخ بتاتی ہے کہ اُس وقت کشمیر کے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔گیارہویں صدی تک وہ کس کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے؟اس لئے یہ کہنا کہ ساتویں اور آٹھویں صدی میں ہی کشمیر میں اسلام آیا یا حلاج بن منصور جو صرف عربی جانتا تھا۔ کشمیر آیا تا کہ یہاں کے مذہبی حالات جان سکے۔یا یہ کہ کشمیر کے راجوں کے سپاہ سالار مسلمان تھے۔صرف''اینِ خیال است و محال است وجنون'' پر مصداق ہے۔اس کا تاریخی وجود ثابت کرنا فرہاد کا جوئے شیر لانے کے مصداق ہے ۔میری تحریر پڑھ کرکچھ دانشور ضرور کہیں گے:

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا

آب مجھ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا!

لیکن دیانتداری کا تقاضا ہے کہ تاریخ کو صرف واقعات، حکایات اور عقل کے محک پر پرکھا جانا چاہیے۔ میں تاریخ دان نہیں ہوں لیکن واقعات کا تجزیہ پیش کرنے کا حق ہر پڑھے لکھے شخص کو حاصل ہونا چاہیے۔چونکہ کوئی بھی تاریخ فرضی نہیں ہوسکتی۔واقعات کو اختراع نہیں کیا جاسکتا۔کسی بھی قیاس کی بنیاد ٹھوس تاریخی مواد ہونا چاہیے۔اس لئے یہ نہایت ضعیف تاریخ ہے کہ کشمیر میں مسلم سلاطین کی حکومت قائم ہونے سے دوتین سال قبل ہی اسلام وارِد کشمیر ہوا تھا۔محض یہ کہنا کہ مُلا فتح اللہ شاہ کا نسخہ قرآنِ پاک A.D1237 میں تحریر ہوا، بھی ایک مشکوک تاریخی شہادت ہے۔جب کہ اس کا حاشیہ فارسی میں ہے اور یہ فتح اللہ کشمیری نے ہی تحریر کیا تھا ایک بحث طلب سوال ہے۔جب اور کوئی اس زمانے کے دستاویز نہ ملتے ہیں کہ واقعی کشمیر میں مسلمان

موجود تھے جو فارسی بولا کرتے تھے، اور قرآن کے واحد نسخے سے اخذ کرنا کہ کشمیر میں اسلام پھیل چُکا تھا اور فارسی زبان مروج ہو چکی تھی دور کی کوڑی لانے والی بات ہے۔ خود فتح اللہ کشمیری کے حالات اس قدر مخفی ہیں کہ اُن کی شناخت بھی شکوک وشبہات کا پلندہ ہے۔ اس طرح مارکو پولو کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ کشمیر برہمن گوشت کھانے والے لوگ تھے اور غیر کشمیری اُن کے لئے قصاب ہوا کرتے تھے وہ مشکوک کہانیاں ہیں جن کی بنا پر قیاس کیا جاتا ہے کہ کشمیر میں اسلام وارد ہو چکا تھا۔ جیسے کہ کشمیر میں کشمیری قصابوں کی حکایات بھی ملتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ چونکہ انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اس لئے وہ مشرب بہ اسلام ہوئے ہوں گے۔ اِن حالات میں قیاس کیا جاتا ہے کہ سوات کے شاہی خاندان کے لوگ A.D1313 میں سوات سے کشمیر آئے تھے اور راجہ سہادیو نے انہیں جاگیریں عطا کی تھیں اور اس کے ثبوت ہیں۔ جونا راجہ کی تاریخ جو کلہانہ کی تاریخ کا چربہ ہے کا حوالہ دیا جاتا ہے اور قیاس کیا جاتا ہے کہ کشمیر کے راجہ ہمسایہ مسلم ریاستوں پر اپنی بقاء کے لئے انحصار کرتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ ہمسایہ مسلم ریاستین کون تھیں؟ کیا وہ شہاب الدین غوری کا شمالی ہندوستان تھا؟ یا قطب الدین ایبک کی خاندان غلامان کی سلطنت؟ لداخ کا علاقہ تبت کے بودھوں کے زیر اثر تھا اور گلگت، کرگل اور بلتستان کی کُل آبادی صرف چند ہزار نفوس اور دور اُفتادہ دیہات پر مشتمل تھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلوم صوفیوں نے کشمیر کو اپنی آماجگاہ بنایا تھا، مگر اس امر کے ثبوت میں کوئی تاریخی مواد موجود ہی نہیں۔ ہم تک صرف بُلبُل شاہ کا نام آیا ہے جو سہروردی صوفی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا اور کچھ لوگوں کے مطابق اس کا اصلی نا سید شرف الدین تھا اور جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ راجہ سہادیو کے زمانے میں وارد کشمیر ہوئے تھے ان کے زمانے میں رنچن شاہ کشمیر پر حکمران ہوا۔ رنچن شاہ

بدھ مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ سہادیو کے فوراً بعد کشمیر میں کیسے ایک بدھ حکومت قائم ہوئی؟ ایک تاریخی معمہ ہے۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ شرف الدین ترکستان سے صرف مذہب اسلام پھیلانے کے لئے کشمیر آئے تھے۔ مگر ترکستان ایک وسیع ملک ہے وہ ترکستان میں کہاں پیدا ہوئے۔ اُن کا آبائی علاقہ کون سا تھا۔ اُن کے ہمراہ کون لوگ کشمیر آئے، اُن کے نام اور دیگر احوال کیا تھے۔ وہ کس راستے سے کشمیر میں وارد ہوئے؟ کن کن مقامات پر قیام کیا؟ یہ سب سوالات تحقیق طلب ہیں۔ یہ بھی ایک تحقیق طلب بات ہے کہ بلتستان جو کہ آبادی کے لحاظ سے ایک نہایت حقیر علاقہ ہے اور محض ایک پہاڑی علاقہ ہے، کیسے رنچن شاہ کو کشمیر جیسے وسیع علاقے پر قابض کرا سکتا تھا؟ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رنچن شاہ ہندو مذہب اختیار کرنا چاہتا ہے مگر ہندو قوم کے سادھواُسے ہندو بنانے پر رضامند نہ ہوئے۔ اس لئے اس نے شرف الدین کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلام قبول کیا تھا۔ رنچن شاہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد صدر الدین کا لقب قبول کیا تھا۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندو راجہ کے حامیوں اور اس کی تمام فوج نے رنچن شاہ کی حکومت کو کیسے برداشت کیا تھا؟ کیا وہ سب بدھ مت سے تعلق رکھتے تھے؟ اور رنچن شاہ کی فوج میں کتنی تعداد ہندوؤں کی تھی؟ اور کہاں یہ سب ایک ساتھ مسلمان ہوئے تھے؟ ایسے سوال ہیں جن کے متعلق ہمیں کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملتا ہے۔ مگر اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ رنچن شاہ (1323-1320) کے مشرف بہ اسلام ہونے کے فوراً بعد اس کا وزیر ''روان چندرا'' بھی مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ اس کے بعد کشمیر کی تاریخ اور ایک نئے موڑ پر آ گئی۔ رنچن شاہ A.D1323 میں وفات پا گئے اور کشمیر میں پھر ہندو راج قائم ہوا جو سولہ سال تک قائم رہا لیکن آخری ہندو راجہ کو A.D1339 میں شاہمیر نے برطرف کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ سوال

یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُس وقت کے ہندو راج نے شاہ میر کو کیوں جاگیریں عطا کی تھیں؟ جب کہ اُس کا تعلق اسلام سے تھا؟ اور شاہ میر کے ساتھ کتنے ہزار لوگ سوات سے ہمرا ہ آئے تھے؟ ورنہ وہ سہادیو کے برادر کو جس کا نام اودھے دیوا تھا کیسے تخت سے دستبردار کرسکتا تھا۔؟ یہ سب باتیں آج بھی تحقیق طلب ہیں۔ اگر ہم غور سے دیکھیں کہ یہ سب تاریخ جُون راجہ کی تحریر کردہ کتب سے اخذ کی گئی ہے۔ ایک بات واضح ہے کہ A.D1339 میں کشمیر میں شاہ میر کی سلطنت قائم ہوئی اور لوگ مشرب بہ اسلام ہونا شروع ہوئے۔ پہلے شاہ میر سلطان نے شمس الدین شاہ میر کے نام سے حکومت کی اور کہا جاتا ہے کہ شاہ میر سلاطین کی ہندو رانیاں تھیں مگر شاہ میر نے ماگرے اور چک خاندان کو بہت اہمیت دی تھی چونکہ یہ مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ اسی دوران کہا جاتا ہے کہ سال A.D1383-84 میں سید علی ہمدانی وارِدِ کشمیر ہوئے۔ مگر سید علی ہمدانی سے قبل کچھ سادات وارِدِ کشمیر ہو چکے تھے جن کا تعلق کبیروی صوفیاء کرام سے تھا ۔اِن میں سید حسن سمنانی، سید تاج الدین، سید حسن ، بہادر اور سید حیدر نے عوام میں کافی قبولیت حاصل کی تھی اور سلطان کشمیر نے انہیں جاگیروں سے نوازا تھا اور انہوں نے سید علی ہمدانی کو، اُس وقت افغانستان میں تھے کشمیر آنے پر راغب کیا تھا۔ سلطان خود سید تاج الدین کا مُرید خاص بن گیا تھا۔ سید علی ہمدانی کے کشمیر آنے سے پہلے ان چار صوفی گھرانوں نے جو آپس میں قریبی رشتہ دار تھے۔ اسلام کی خوب تبلیغ کی تھی اور سید حیدر نے کُلگام کے علاقے میں اسلام پھیلایا اور بہت سے لوگوں کو مسلمان بنایا تھا۔ حتیٰ کہ اس سلسلے میں بہت محدود تحریری مواد موجود ہے اور زیادہ تر زبانی روایات پر ہی انحصار کیا جاتا ہے۔ جو اسلام کشمیر میں اس وقت موجود تھا، وہ اسلام اور ہندومت کے امتزاج سے وجود میں آیا تھا اور مسلم سلاطین کے بہت سارے وزراء ہندومت

سے ہی وابستہ رہے اور مذہب اسلام کے اصولوں کے ساتھ ہندو روایات اور تقریبات کو بھی منایا جاتا تھا۔ یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ A.D1328 میں رنچن شاہ مسلمان ہوا تھا اور انیس سال کے بعد A.D1339 میں صدرالدین شاہ میر نے اپنی حکومت قائم کی تھی اور صرف پنتالیس سال گزرنے کے بعد A.D1384 میں سید علی ہمدانی شاہ تیمور کے عتاب سے خوفزدہ ہو کر افغانستان سے واردِ کشمیر ہوئے تھے۔اس لئے سید علی ہمدانی کے کشمیر آنے سے قبل، کشمیر میں پچاس سال کے عرصہ میں ایک اچھا خاصا طبقہ مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ کشمیر کے اس دور سے متعلق تاریخی مواد اتنا محدود ہے کہ ساری تاریخ صرف روایات اور حکایات پر قائم کی گئی ہے۔ غالب مرحوم نے کتنا برجستہ اور برملا کہا ہے:

محرم نہیں ہے تو نوا ہائے راز کا

یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اور واقعی اس دور کی تاریخ نوا ہائے راز بن گئی ہے اور تحریری مواد کی کمی پردہ ساز بن گئی اور ہمیں ساری تاریخ قیاسات اور روایات پر مرتب کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے کشمیر کی تاریخ کا سفر کلہانہ کی راج ترنگنی سے شروع ہو کر نیم تاریخ گزرگاہوں سے گزرتا ہوا عصرِ حاضر تک آ پہنچا ہے اس میں اساطیری افسانوں اور ڈرامائی واقعات کا امتزاج ملتا ہے، اور پرانے راجاؤں کے قصے، سلاطین کے عہد نامے اور کارنامے فریدون وجم سے کیخسر و و دارا کے شان وشکوہ کے فرضی بیانوں سے بھی زیادہ مزین بنا دیئے گئے ہیں ورنہ حقیقت میں کشمیر ایک پہاڑی علاقہ تھا اور جو قافلے تجارت کے لئے آتے تھے اُن کا ایک بڑا پڑاؤ تھا۔ جہاں تاجر ماندگی کے بعد کچھ دیر کے لئے ستانہ

چاہتے تھے، لیکن کشمیری تاجر ہمت دشوار پسند کے مالک تھے اور وسط ایشیا سے جو لوگ آتے تھے وہ بھی باہمت لوگ تھے۔ یہ تجارت کتنی وسیع تھی۔ اس میں کتنے معاشی منافع وابستہ تھے اور کتنے قافلے آتے تھے۔ کتنے لوگ اس تجارت سے وابستہ تھے۔ سب تحقیق طلب ہیں اور اس دور تک کسی نے گزارش احوال واقعی بیان کرنے سے احتراز کیا ہے۔ اس لئے اس دور میں سید علی ہمدانیؒ کا رول ایک سوالیہ نشان کا محتاج رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سید علی ہمدانی سات صد سادات کے ساتھ وادِ کشمیر رہے اور انہوں نے ہی کشمیر کے حکمران کو اسلام پر رہنے کی تلقین کی تھی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سید علی ہمدانی صرف ایک سال یعنی A.D1383 سے A.D1384 تک کشمیر میں مقیم رہے اور A.D1384 میں واپس اپنے وطن تشریف لے گئے اور واپسی میں سفر کے دوران A.D1385 میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ سید علی ہمدانی فارسی اور عربی زبان جانتے تھے۔ اس لئے ایک سال کے عرصہ میں اُن کا کشمیر میں جہاں لوگ فارسی اور عربی سے بالکل بابلد تھے۔ شہر سرینگر میں مجالس منعقد کرنا، وعظ فرمانا، لوگوں میں اسلام کی اشاعت کرنا ایک عجیب وغریب واقعہ ہے۔ نہ ہی کسی نے یہ ظاہر کیا ہے کوئی عام کشمیری فارسی اور عربی پر اتنی دسترس رکھتا تھا کہ وہ اُن کا مترجم بن سکے اور نہ ہی اُن کے کسی مترجم کا نام ہمیں تاریخ کے اوراق میں ڈھونڈنے پر بھی مل سکتا ہے۔ اور یہ ہی حال سید علی ہمدانی کے ساتھ آئے ہوئے سات سو سادات کے خاندنوں کا تھا۔ اس لئے یہ کہنا کہ اُنہوں نے وسیع پیانے پر لوگوں کو قبول اسلام پر آمادہ کیا ہے۔ بہت معمہ نما سوال ہے۔ البتہ کچھ شواہد موجود ہیں کہ اُن کے زمانے میں سلطان قطب الدین حکمران تھا۔ وہ سید علی ہمدانی کا مرید ہوگیا تھا اور سید علی ہمدانی کی شان میں اُس نے ایک یا دو منقبت اور رباعیاں بھی لکھی تھیں اور اس کے عوض سید علی ہمدانی نے سلطان کو

اپنی ٹوپی تحفہ کے طور پر دی تھی اور وہ یہ وہ ٹوپی شوق سے کلاہ کے نیچے پہنتا تھا اور اس نے خانقاہ معلیٰ میں سید علی ہمدانی کے اوراد فاتحہ پڑھنے کا رواج بھی قائم کیا تھا۔ بہارستان شاہی کے مصنف نے بغیر کسی سند کے یہ سُنی سُنائی بات بھی کہہ دی ہے کہ کالی کے مندر کا سب سے مہان پجاری بھی سید علی ہمدانی کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہو گیا تھا۔ سید علی ہمدانی نے کالی کے مندر کے پجاری کے ساتھ کتنی بار وعظ و تبلیغ کی غرض سے ملاقات کی تھی؟ اس سے کس زبان میں گفتگو کی تھی؟ اور وہ کب اُن کے وعظ سے متاثر ہوا یہ سب باتیں قیاس کے دائرہ میں آتی ہیں۔ سید علی ہمدانی شہر سرینگر میں کس زبان میں وعظ فرماتے تھے جب کہ عام کشمیری اُن کی زبان سے ناواقف تھے ایک اہم نکتہ ہے جو غور طلب ہے، اور سید علی ہمدانی صرف ایک سال کے قلیل عرصہ میں کتنے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کر سکے۔ اُن کی تعداد کیا تھی کسی کو معلوم نہیں۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ جو لوگ اُن کے زیر اثر جو لوگ کشمیر میں آئے وہ ماگرے، گنائی اور چندن قبلیوں سے منسلک تھے۔ اگر سید علی ہمدانی زیادہ تر وعظ شہر سرینگر میں خانقاہ معلیٰ میں فرماتے تھے ماگرے، گنائی اور چندن خاندان شہر سرینگر میں آباد ہی نہ تھے۔ یہ سب افسانوی قصے بہارستان شاہی سے اخذ کئے گئے ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ پھر وادی کشمیر کو سید علی ہمدانی نے مختلف علاقوں میں تقسیم کیا اور اپنے مریدوں کو اسلام کی تبلیغ کے لئے روانہ کیا۔ مگر سید علی ہمدانی کے ساتھ جو سات صد خاندان سادات کشمیر آئے تھے وہ سب عربی فارسی جانتے تھے اور کشمیری زبان سے بالکل نابلد تھے۔ اس لئے بہارستان شاہی اس امر کی نسبت خاموش ہے اور ہمیں علم نہیں کہ صوفی لوگ کشمیر میں کس زبان میں تبلیغ اسلام کرتے تھے؟ مگر کشمیری مورخین کا خیال ہے کہ سید علی ہمدانی نے ہی کشمیر کے لوگوں کو مشرب بہ اسلام کیا اور صحیح شرع قائم کی جس کے ثبوت میں سید علی ہمدانی

کی کتاب ' ذکرۃ الملوک '' کو پیش کیا جاتا۔ ذکرۃ الملکوک میں صرف تائید کی گئی ہے کہ راہ نجات شرع پر سختی سے عمل حاصل کرنے سے ممکن ہے۔ مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صرف ایک سال کے قلیل عرصہ میں یعنی A.D1383 اور A.D 1384 کے عرصہ میں سید علی ہمدانی نے کشمیر میں کثیر تعداد میں لوگوں کو اسلام کے دائرہ میں لایا تھا۔ یہ تاریخ نویسوں کی معصومانہ شوقی سے کچھ کم نہیں کہ وہ نظر ہائے تیز تیز سے حالات کا سرسری جائزہ لے کر۔۔ تکلف رائے کو اظہار کرتے ہیں اور پڑھنے والے اُن کی رنگین بیانی سے محسور ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مگر تحقیق کا فن جو ہوتا ہے وہ پیاس تشکر سے عاری ہوتا ہے۔ حقیقت کسی کے ذوق خامہ فرسا کی محتاج نہیں ہوتی اور حقیقت اظہر من شمس عیاں ہوتی ہے۔ لوگوں نے سید علی ہمدانی کو کشمیر میں بنائے اسلام کے خطاب سے نوازا چونکہ انہوں نے اسلام کو ایک ضابطہ نظریہ حیات کے طور پر پیش کیا اور اس وقت کے سلطان کشمیر کو اپنی کاوشوں سے متاثر کیا تھا۔ جس کا ثبوت خانقاہ معلیٰ میں اُن کی خانقاہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بعد میں آنے والے سلاطین اُن کی تعلیمات سے جلا حاصل کرتے رہے اور سلطان سکندر جس نے A.D1389 سے A.D1413 تک حکمرانی کی غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور کشمیر کی تاریخ میں بت شکن کے لقب سے مشہور ہوا۔ کچھ مورخ تو یہ کہتے ہیں کہ اس وقت کے سلطان کا وزیر اعظم سہابٹ ایک کشمیری پنڈت تھا جو میر سید علی ہمدانیؒ کے وعظ و بند سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر بیٹھا اور سید علی ہمدانی کے واپس جانے کے بعد A.D1389 سے A.D.1394 تک کشمیر میں مسجدوں، مدرسوں اور فتوے گھر قائم ہو گئے تھے اور یہ ادارے اسلام کی جڑ ثابت ہوئے اور اس امر کا ثبوت مورخ جون راجہ کی کتاب سے حاصل کرتے ہیں۔ مگر جون راجہ نے میر سید علی

ہمدانی کو ایک نو جوان لڑکا کہا ہے۔ یہ کس حد تک صحیح ہے خود ایک تحقیق طلب معاملہ ہے اور سہا بٹ جس نے سیف الدین کا نام اختیار کیا تھا کشمیر میں اسلام کا سب سے بڑا نقیب ثابت ہوا تھا اور اُس نے مندروں کے بُت منہدم کروائے تھے اور اس کے سطلان علی شاہ کے دور میں جو A.D1413 سے شروع ہو کر A.D1420 تک قائم رہا۔ کشمیری پنڈتوں پر ظلم کی نا قابلِ یقین کہانیاں صرف جون راجہ کی تاریخ میں ملتی ہیں جن کی اور کوئی غیر جانبدار تصدیق آج تک ممکن نہ ہو سکی ہے۔ اس کے بعد A.D1420 میں بڈشاہ برسرِ اقتدار آیا اور A.D1470 تک حکمران رہا اور کشمیری مورخ کہتے ہیں کہ اس نے مذہبی رواداری قائم کرنے میں مغل شہنشاہ اکبر عظیم کو بھی مات دے دی تھی۔ یہ سب دلیلیں بہارستان شاہی اور چندر ملک کے بیانوں پر قائم کی گئیں ہیں اور یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ بڈشاہ نے وسط ایشیا سے کاری گر اور صناع منگوائیے تھے تا کہ کشمیر ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر سمرقند اور بخارا کے مدِ مقابل ہو سکے اور سلطان نے ایک ہندو مت کے احیا کے لئے بھی موزوں ماحول قائم کیا تھا اور اس لئے یہ نتیجہ اخز کیا جاتا ہے کہ ایسے ماحول میں سید علی ہمدانی کے صوفی اسلام کی جگہ کشمیری صوفی تحریک نے حاصل کر لی تھی اور یہ کشمیری صوفی تحریک کشمیری ریشی یا سادھوؤں نے پروان چڑھائی جو خود کو ریشی کہتے تھے مگر اپنے عقائد اسلام اور ہندو دھرم سے حاصل کرتے تھے اور اسی زمانے میں شیخ نور الدین ولیؒ جنھوں نے قصبہ چرار شریف کو اپنی آماجگاہ بنایا، ریشی تعلیمات کو دور دور تک پھیلا دیا تھا۔ شیخ نور الدین ولی کا زمانہ A.D1379 سے شروع ہو کر A.D1442 تک پھیلا ہوا ہے۔ دراصل ریشی تعلیمات کشمیر میں پہلے سے مروج تھیں اور شیخ نور الدین ریشی نے انہیں صرف اسلام کے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ کشمیر کے

ریشیوں نے اظہارِ خیال کے لئے یہاں کی کشمیری زبان میں وعظ اور پند کا سلسلہ شروع کیا تھا اور اس لئے ریشی تعلیمات کا قبول عام حاصل کرنا عین قرین قیاس ہے۔ اور ریشی تعلیمات کا سلسلہ مغل دور تک جاری رہا چونکہ شہنشاہ جہانگیر نے اُن تذکرہ کیا ہے اور جہانگیر سے قبل اکبر عظم کے دور میں ابوالفضل نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے اور جون راجہ کے مطابق اس طرح کشمیر میں اسلام پھیل گیا تھا مگر کشمیری برہمنوں نے اپنا الگ وجود قائم رکھا۔ بہارستان شاہی کے مصنف کے مطابق اس وقت کشمیر میں کشمیر پنڈتوں کے اسی (۸۰) گھرانے موجود تھے ۔ یہ سب اخذ کی گئی قیاس آرائیاں بہارستان شاہی اور جون راجہ کی تصانیف کی مرہونِ منت ہیں۔ مگر بہارستان شاہی اور جون راجہ کی کُتب کتنی مصدقہ ہیں اس بارے میں کوئی مواد موجود نہیں۔ صرف ان پر یقین کرنے کا معاملہ ہے۔ بہارستان شاہی کا مصنف کون تھا یہ کسی کو معلوم ہی نہیں ہوسکا ہے اور کوئی بھی خاص کشمیری ماخذ اس زمانے کا آج تک دستیاب نہیں ہوسکا ہے اور نہ ہی کوئی کشمیری زبان میں کتاب لکھی گئی تھی اور نہ ہی کسی کشمیری مصنف نے کوئی تاریخ مرتب کی ہے ۔ یہاں تک کہ ساری کشمیری تاریخ کچھ سنسکرت اور فارسی دستاویزات کی روشنی میں مرتب کی گئی ہیں اور یقین آور اور غیر یقین باتوں کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس لئے ہندو دور اور اولین سلاطین کشمیر کے حالات ہمیں صرف پنڈت کلہن کی راج ترنگنی اور اس کے بعد جون راجہ کی راج ترنگنی جو اس نے سلطان زین العابدین بڈشاہ (A.D1420-1470) کے کہنے پر تحریر کی تھی اور پنڈت سری ور کی راج ترنگنی جو جون راجہ کا شاگرد تھا اور زین العابدین کے دور میں سلطان کا معتمد خاص تھا کہ طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ سری ورنہ تحریر کردہ تاریخ بہت مختصر ہے اور صرف A.D1459 سے A.D1488 تک حالات کا احاطہ کرتی ہے۔ سری

ورہ کی تاریخ کو پرجابٹ نے مکمل کرنا چاہا اور آنے والے صرف 27 سال کا یعنی A.D.1486 سے A.D 1513 تک کے حالات کا جائزہ لیا ہے۔ جگدیش چندردت نے کمال جانفشانی سے ان کتابوں کا انگریزی ترجمہ کیا ۔A.D1513 تک کے حالات اور کسی بھی فارسی، عربی یا کشمیری زبان میں تحریر شدہ نہیں ملتے ہیں۔ بلکہ کشمیری زبان میں لکھی ہوئی کوئی بھی کتاب دستیاب نہیں ہے۔ سُھکتا نے 1598 میں جب کشمیر مغل سلطنت کا حصہ بن چکا تھا کچھ حالات تحریر کیئے ہیں۔ پرجابٹ کی کتاب دستیاب ہی نہی ہوسکتی ہے اور سُھکتا کی کتاب 'اغلاط' کا مجموعہ ہے اور سھکتا نے مرزا حیدر دوعلات کے کشمیر پر قبضہ کرنے کے حالات بیان کرنے سے احتراز کیا ہے۔ مرزا حیدر دوغلات نے A.D1540 میں کشمیر پر قبضہ کیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب شیر شاہ سوری ہندوستان کے تخت پر قابض ہوا تھا۔ یہاں پر میں اس بات کا تذکرہ ضرور کروں گا کہ شمس الدشمس الدین اعراقی جو نور بخشی شیعہ فرقہ سے تعلق رکھتا تھا دوسری بار A.D1501 میں واردِ کشمیر ہوا اور نور بخشی مسلک کو شہر سرینگر اور نواح میں خوب رائج کیا، میر شمس الدین اعراقی کے والد موسوی سید تھے اور میر شمس الدین عراقی کچھ لوگوں کے مطابق حسین مراز جو ہرات کا حکمران تھا کے سفیر کے طور پر پہلی بار کشمیر آیا اس وقت کشمیر پر حسن شاہ (A.D1448-A.D) حکمران تھا نہ اُن کی کتاب تحفتہ الا ابواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت سے لوگوں کو شیعہ مسلک اختیار کرنے کی ترغیب دی تھی۔ مرزا حیدر دوغلات نے A.D1540 پر کشمیر پر قبضہ کر کے تمام اہلِ تشیہ کو اپنے ظلم اور جبر کا نشانہ بنایا اور ہزاروں کی تعداد میں کشمیر کے شیعہ قتل کردیئے گئے۔ شیعوں کا قتلِ عام اس کے دور میں اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بن گیا اور A.D1551 میں لوگوں نے اس کا خاتمہ کردیا تھا۔ کچھ لوگ

کہتے ہیں کہ ۱۸ر نومبر ۱۵۵۰ء کو کمال دھوبی نے اس کا خاتمہ کر دیا تھا۔ لیکن مرزا حیدر دوغلات نے تاریخ رشیدی لکھ کر کشمیر کے واقعات کو تاریخی شکل دے دی اور رموز سیاست کو افسانہ سے حقیقت تک کی منزل تک پہنچایا۔ مرزا حیدر دوغلات ایک ظالم حکمران تھا۔ اور اہلِ تشیعہ سے سخت دشمنی رکھتا تھا۔ اس نے چنگیزی روایات کے تحت اہلِ تشیعہ کشمیر کو تخت و تاراج کیا اور بے رحمی سے ان کے قتل عام کا نظارہ کیا مگر اس نے تاریخِ رشیدی لکھ کر پہلی بار ایک مستند تاریخ نویسی کی بنیاد ڈالی۔ حتیٰ کہ مغل دور سے قبل کشمیر کے حالات کا تذکرہ المسعدی کے کتاب اور پھر البرونی کی کتاب "الہند" ملفوظات تیموری، ظفر نامہ، تاریخِ فیروز شاہی، تاریخ داوٗدی اور مخزن افغانی میں ملتا ہے۔ مگر مرزا حیدر دوغلات نے چونکہ کشمیر پر حکمرانی کی تھی۔ اس لئے اس کی کتاب زیادہ مستند تصور کی جاتی ہے چونکہ مرزا حیدر نے اُن مسلم سلاطین کا تذکرہ کیا ہے جو اُس سے پہلے کشمیر کے حکمران رہے تھے اور اس نے خاص طور پر سلطان زین العابدین کے دور کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی کتاب تاریخ رشمدی ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ یہ انتہائی افسوس ناک امر ہے کہ تاریخِ رشیدی تک کسی بھی مورخ نے کشمیر کے سیاسی، سماجی، معاشی حالات لوگوں کے رہن سہن، اُن کے روایات، اُن کے پہناوے، ان کے رسم و رواج کا زیادہ تفصیل سے تذکرہ ہی نہیں کیا ہے۔ آخر کشمیری فوج کا لباس کیا تھا؟ کیا کُرتا پاجامہ کشمیر میں مروج تھا اور سوئی دھاگا کس دور میں مروج ہوا، ان باتوں کا تعلق کشمیر فوج کے منتظم ہونے سے پہلے، کشمیری فوج کون سا لباس پہن کر میدانِ جنگ میں برسرپیکار ہوتی تھی۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مرزا حیدر دوغلات کی تاریخِ رشیدی اس سلسلے میں یعنی Sub Alteru تاریخ کے بارے میں خاموش ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مرزا حیدر دوغلات نے جب

اہل تشیع کو اپنے عتاب کا نشانہ بنایا اس نے چک خاندان پر مظالم ڈھائے ۔ چک خاندان کے لوگ شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔A.D1545 میں ہندوستان میں شیر شاہ سوری ایک حادثہ میں ہلاک ہوگئے اور اسلام شاہ سوری کا دورِ حکومت آیا اسی زمانے میں چک خاندان کے دولت چک اور غازی چک کشمیر چھوڑ کر چلے گئے اور اسلام شاہ سوری سے مدد طلب کی تھی مگر انہیں خاصی کامیابی نہ ملی ۔ دولت چک اور غازی چک اسلام شاہ سوری کے جانی دشمن تھے ۔ ہیبت خان نیازی سے ملاقی ہوئے اور جب اسلام شاہ سوری نے ہیبت خان نیازی کو مغلوب کیا اور دولت چک اور غازی چک اسے راجوری لے گئے اور اُسے مرزا حیدر دوغلات پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی تھی ۔لیکن مرزا حیدر دوغلات کو اسلام سوری نے امداد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس طرح ہیبت خان نیازی نے اسلام سوری کے سامنے ہتھیار ڈال دئے اور مرزا حیدر دوغلات کے ساتھ صلح کر لی تھی اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ غازی خان چک نے مرزا حیدر کی ملازمت اختیار کر لی تھی اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ غازی خان چک نے مرزا حیدر، ہیبت خان اور اسلام شاہ سوری نے آپس میں اس کا ایک معاہدہ کر لیا تھا اور اسی لئے مرزا حیدر نے کشمیر میں جو سکہ جاری کیا ان پر اسلام شاہ سوری کا نام کندہ تھا۔ 1550 میں کمال دھوبی نے موقع پا کر مرزا حیدر دوغلات پر نیزہ سے وار کر کے اس کا خاتمہ کر دیا تھا۔ غور وخوض کی بات یہ ہے کہ اگر ہم تاریخ رشدی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ صرف ۴۰۰ مغل سواروں کی مدد سے مرزا حیدر نوشہرہ تک قابض ہوا تھا اور کاچی چک کو حیران اور ششدر چھوڑ کر 22 نومبر A.D1540 میں سرینگر پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس لئے اس کو کشمیری فوج بھرتی کرنا پڑی تھی اور اُن کے امراو سے مرزا حیدر نے ۱۵۴۰ سے ۱۵۵۰ تک کشمیر پر حکمرانی کی تھی ۔ دوسری بات جو قابلِ غور ہے کہ

دولت چک اور غازی چک اہل تشیعہ لوگ تھے مگر وہ امداد حاصل کرنے کے لئے اسلام شاہ سوری جو شیر شاہ سوری کا فرزند تھا کے پاس گئے تھے۔ لیکن اسلام شاہ سوری سے نا اُمید ہو کر وہ ہیبت اللہ خان نیازی سے امداد طلب کرنے گئے تھے۔ جو کٹر سنی مسلک سے تعلق رکھتا تھا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سنی شیعہ اختلافات کا ایک سیاسی پہلو تھا اور مذہبی مسلکی اختلافات کی راہ میں حائل نہیں ہوتے تھے اور مرزا حیدر کے شیعہ قتل عام کے در پردہ ماگرے قبیلہ کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ جو شیعہ چک خاندان کے جانی دشمن تھے اور مرزا حیدر دوغلات اتنے قلیل مغل سواروں کے ساتھ کشمیر آیا تھا کہ اسے کشمیری فوج بھرتی کرنا پڑی تھی۔ جنہوں نے 1550 میں مرزا حیدر دوغلات سے بغاوت کر کے اس کا خاتمہ کر دیا تھا۔

میں نے اختصار سے کام لیا ہے اور کشمیری تاریخ کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے چونکہ کشمیر کے سادہ دل دانشور فیض کی زبان میں "اپنی تاریخ کے شوخیِ رفتار کو دلفریب اور حسین ادا عطا کرنے کے لئے اپنے جذبات کی شدت کو وسعت دینے کے لئے یہ مفروضہ قائم کرتے ہیں کہ سید علی ہمدانی نے کشمیر کو مشرب بہ اسلام کیا تھا اور اسلام نے اُن کی معرفت سے اپنا صحیح رنگ کشمیر میں ہی حاصل کیا۔ یہ دعویٰ اس لئے عجیب لگتا ہے کہ سید علی ہمدانی کشمیر میں صرف ایک سال رہے اور A.D1384 میں اپنے وطن تشریف لے گئے اور A.D1385 میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ میں ضرور للہ عارفہ کا تذکرہ کروں گا جو سید علی ہمدانی کی معاصر کشمیری پنڈت خاتون تھی جو روحانیت کا ایک مجسم پیکر تھی اور جوانی کے عالم کبھی کبھی برہنہ گھوما کرتی تھی اور اسی عالم وجدان میں سید علی ہمدانی سے ملاقی ہوئی اس کے واکھ یا شاعرانہ کلام برہمن فکر کی ترمیم اور اصلاح کے لئے مہمیز ثابت ہوئے اور اس نے شیوازم کے خلاف کہنا شروع کیا اور "تانترک

’’رسم و رواج کو غلط قرار دیا اور سنسکرت زبان کو ترک کر کے کشمیر زبان میں وعظ اور پند کی مجلس منعقد کیں تھیں۔ اور ہندو مت اور اسلام کے اصولوں کے تانے بانے ایسے جوڑ دیئے کہ ایک نیا کشمیری اسلام وجود میں آیا جس کی تشریح شیخ نورالدین ولی نے خوب کی اور اسلام میں واکھ کو رائج کر دیا اور کشمیری صوفیوں نے اسے ’’ذکر‘‘ کہہ کر روح کے لئے نجات کا راستہ معین کر دیا تھا اور اس طرح اس نے ویدانیت ازم اور صوفی ازم کو آپس میں خلط ملط کر دیا تھا۔ کچھ مورخ یہ بھی کہتے ہیں کہ سید علی ہمدانی کشمیر میں چھ برس تک مقیم رہے اور واپسی پر ختلان میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے۔ للہِ عارفہ کی تعلیمات نے تمام کشمیر کو اپنا گرویدہ بنا دیا تھا اور سید علی ہمدانی صرف سلطان قطب الدین اور شہرِ سرینگر کے اونچے طبقے کو متاثر کر سکتے تھے ان کی کتاب ذخیرۃ الملک اس بات کی غماز ہے اور سلطان قطب الدین کی کاوشوں کی وجہ سے شہر سرینگ میں اسلام نے ایک رنگ اختیار کیا مگر شہر سرینگر کی حدود سے باہر کشمیر میں للہِ عارفہ اور شیخ نورالدین ولی کا صوفی طرز کا اسلام آگ کی طرح پھیل گیا تھا۔ سلطان قطب الدین سید علی ہمدانی کی وفات کے بعد پانچ سال تک زندہ رہے اور A.D1389 میں انتقال کیا تھا۔ سلطان قطب الدین کی رحلت کے بعد سلطان سکندر بت شکن تخت نشین ہوا، وہ اُس وقت نابالغ تھا۔ اس کی والدہ نے دو ہندوں وزیروں کی مدد سے کارِ سرکار انجام دیا اور اس کے وزیر رائے مداری نے سلطان سکندر کے برادر ہبیت اللہ خان کو زہر دے کر ابدی نیند سُلا دیا تھا۔ جب سلطان سکندر بلوغیت کو پہنچا تو وہ بھی سادات کے زیرِ اثر آچکا تھا اور اسی زمانے میں سید محمد ہمدانی وارِدِ کشمیر ہوئے اور سلطان سکندر سلطان سکندر پر کافی اثر رسوخ ڈالا تھا اور اُنہی کی تعلیمات سے متاثر ہو کر کشمیری پنڈت مورخین کے خیال میں انہوں نے بت شکنی کی روایت کا از

سرِ نو احیا کیا تھا۔ سلطان سکندر کا بڑا بیٹا علی شاہ A.D1413 میں تخت نشین ہوا تھا۔ لیکن اس نے اپنے ہی بھائی شاہی خان سے بغاوت بلند کر کے کھوکھر قبیلے کی مدد سے A.D1420 میں تھانا کے مقام پر شکست دے دی تھی اور کشمیر کے تخت پر قبضہ کر کے جون A.D1420 میں سلطان زین العابدین کا لقب اختیار کیا تھا اور کشمیر پر پچاس برس تک حکومت کی تھی۔ یہاں مجھے یہ بات دوہرانے میں کوئی تامل نہیں کہ سلطنت کشمیر کی حکایات خونچکان سے شکوک وشبہات کے دائرہ ہی میں رقص کرتی ہوئی نظر آئی ہیں اور بالکل وثوق سے کشمیری تاریخ سے متعلق کچھ کہنا بہت کٹھن مرحلہ ہے۔ جیسے یہ کہنا کہ سلطان زین العابدین نے کشمیر میں ایران اور وسط ایشیا سے دستکار اور صناع بُلائے تھے اور کشمیری دستکاری آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگی تھی بلکہ پنڈت سھکنا کے مطابق مرزا حیدر دوغلات نے ایران اور وسط ایشیاء سے دست کار اور صناع مدعو کئے تھے اور اس کے زمانے میں کشمیر خوشحال کشمیر کے نام سے موسوم ہوا تھا اور کشمیر میں موسیقی کو بھی مرزا حیدر دوغلات نے ایک نئی سمت عطا کی تھی۔ مرزا حیدر نے کشمیری فن تعمیر کو بھی جلا بخشی تھی اور مکانات کو خوبصورت بنانے کا فن عروج پر پہنچایا تھا۔ یہ سب کہانیاں محمد اعظم کی تاریخ اعظم دیدہ مری میں درج ہیں اور مُلا حسن نے انہیں ہو بہو اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے۔ مرزا حیدر کے بہت اچھے تعلقات عبدالرشید خان والی کاشغر کے ساتھ تھے۔ مرزا حیدر راجوری اور پکھلی پر تسلط قائم کرنے کے بعد، پہلا حکمران تھا جس نے لداخ اور بلتستان پر اپنا اثر ورسوخ قائم کیا تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مرزا حیدر کٹر سُنی مسلک سے تعلق رکھتا تھا لیکن بلتستان کا علاقہ اہل تشیعہ مسلک کے حامی تھے اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ A.D1548 میں مرزا حیدر نے میر شمس الدین عراقی کے مقبرہ اور خانقاہ کو تاراج کرنا چاہا تھا۔ مرزا حیدر دوغلات کا

اپنا فرزند مرزا دانیال جو تاریخ میں شیخ دانیال کے لقب سے جانا جاتا ہے ایک کٹر شیعہ تھا اور بہارستان شاہی کے مصنف کے خیال میں شیخ دانیال کو مرزا حیدر نے قتل کروایا تھا۔ لیکن اس کے برعکس کشمیری تاریخ نویس سری وارہ کا خیال ہے کہ کشمیر میں دستکاری کو اہم مقام دلانے میں بڈشاہ نے کافی اہم رول ادا کیا اور بڈشاہ نے ہی ایران سمرقند اور بخارا سے کافی مشہور کاریگر اور صناع کشمیر بلائے تھے تاکہ کشمیر کے لوگ اس رازِ فن سے آشنا ہوں اور بڈشاہ کے زمانے میں کشمیر میں صناعی، پیپر ماشی، وڈ کارونگ، شال بافی، قالین سازی اپنے عروج پر پہنچی تھی اور خود مرزا حیدر نے کشمیر کی صناعی کا تذکرہ اپنی کتاب تاریخ رشیدہ میں کیا ہے۔ چونکہ سلطان زین العابدین بڈشاہ کے پچاس سالہ دورِ حکومت میں کشمیر میں پہلی بار امن وامان قائم ہوا تھا اور اسی کے دورِ حکومت میں شیخ نورالدین ریشی نے ریشی تصوف اور ریشی اسلام کو کشمیر میں دور دور تک مروّج کیا تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے زمانے میں ملا احمد نے مہابھارت کو فارسی زبان میں نظم کیا تھا تو سلطان زین العابدین کی فرمائش پر جون راجہ نے پنڈت کُلھن کی راج ترنگنی کو سنسکرت میں مکمل کرنے کی ٹھان لی تھی۔ ان باتوں کا تذکرہ سری وارہ نے اپنے تاریخ میں کیا ہے اور جون راجہ کے کہنے کے مطابق راجوری، پونچھ اور لداخ بلتستان پر سلطان زین العابدین کا رسوخ قائم ہوا تھا اور اس لئے اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے کے لئے بڈشاہ نے ہندوؤں کو خاص طور سے از سرِ نو کشمیر میں آباد کیا تھا اور اکبر اعظم کی مثال پر عمل کرتے ہوئے زین العابدین بڈشاہ نے بھیم دیو راجہ جموں کی دختر سے شادی کی تھی۔ جون راجہ نے اس شادی کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ میں نے سلطان سکندر بُت شکن اور اس کے بیٹے شاہی خان یعنی زین العابدین بڈشاہ کا تذکرہ ذرا تفصیل سے کیا ہے چونکہ کشمیر کے مورخین کہتے ہیں کہ سلطان سکندر جس کا

فرزند علی شاہ تھا جو بڈشاہ کا برادر اکبر تھا نے جموں کے راجہ بھیم دیو کی دختر سے شادی رچائی تھی اور اس لئے راجہ بھیم دیو کی امداد سے اس نے کشمیر کی حکومت شاہی خان سے واپس حاصل کی تھی۔ جون راجہ نے لکھا ہے کہ علی شاہ نے راجہ بھیم دیو کی دختر سے نکاح کیا تھا اور کشمیر میں ہندو مسلم شادیوں کا رواج عام تھا۔ اس لئے رنچن شاہ نے اسلام قبول کرنے کے بعد ہندو خاتون کوٹا رانی سے شادی کی تھی اور شاہ میر کے پوتے اور پوتیوں نے ہندو خاندانوں میں شادیاں کی تھیں اس زمانے میں شاہی خان نے سیال کوٹ میں کھوکھر راجہ جسرتھ کے ہاں پناہ لی تھی اور جسرتھ نے ہی علی شاہ کو تھانہ کے مقام پر شکست دے کر قتل کروایا تھا اور پھر شاہی خان کو کشمیر کے تخت پر قابض کروایا تھا اور شاہی خان نے زین العابدین بڈشاہ کا لقب اختیار کیا اور کشمیر پر پچاس سال تک حکومت کرتا رہا۔ کشمیر کے سلاطین کی تاریخ اتنی منتشر ہے کہ اس کا تسلسل اتنا بے ربط ہے اور اس میں کشمیری تخیل آرزو کا ایسا عنصر شامل ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ حقائق پر انحصار کرنے کے بجائے کچھ کہانیاں اختراع کی گئیں جنہیں لوگ قرآن کے اوراق سمجھ کر انتہائی مقدس جانتے ہیں۔ سلاطین کی تاریخ جاننے کے لئے ہمیں ''تاریخِ کشمیر'' ملا شاہ محمد شاہ آبادی کی تحریر کردہ ملتی ہے جو انتہائی ناقص تصور کی جاتی تھی یا پھر بہارستان شاہی جو کسی گمنام شخص نے تحریر کی تھی اور قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ شخص غیر کشمیری نوربخشی مسلک سے تھا یا پھر تاریخ کشمیر کو جو ملک حیدر چاڈورہ نے تحریر کی ہے جو ملکہ نور جہاں کا منظور نظر تھا اور جہانگیر کے دور میں اس نے سنے سنائے واقعات کو قلمبند کیا یا پھر واقعاتِ کشمیر جو خواجہ اعظم دیدمری نے A.D1747 میں مکمل کیا ہے پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ کلہانہ، جون راجہ اور سری ورہ کے علاوہ اور کسی نے سلاطین کشمیر کے حالات قلمبند ہی نہ کئے ہیں، قدیم مورخ صرف یہی اصحاب ہیں اور دورِ

جدید کے تاریخ نویسوں نے اُنہی کتابوں کا چربہ اُتارا ہے۔ البتہ مغل دور کے حالات مرزا حیدر دوغلات کی تاریخ راشدی سے شروع ہو کر طبقات اکبر۔ آئین اکبری، اکبر نامہ، تاریخ فرشتہ المسعودی کی تحریرات اور البرونی کی کتاب الہند میں ملتے ہیں۔ برنی نے صرف سلطان شہاب الدین کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن حوالہ جات خود جہانگیر کی تزک جہانگیری اور محمد خان کی کتاب اقبال نامہ جہانگیری میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ میں ابھی مغل دور کا تذکرہ نہیں کر رہا۔ تو قاری کو ذہن نشین کرنا ہوگا کہ اب جو سین (Sen) چک خاندان کا مختصراً تذکرہ کر رہا ہوں وہ بھی قیاسات کا پلندہ ہے۔ لیکن قیاس آرایاں چند واقعات کے مرہونِ منت ہیں۔ قیاس آرائیاں رنگ لالہ و گل ونسرین کی طرح منفرد اور جدا ہیں۔ لیکن بقولِ مرزا اسد اللہ خان غالب:

ہے رنگِ لالہ و گل ونسرین جدا جدا

اسر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

اور بہار کے اثبات کی سعی میں مجھے یہ مضمون تحریر کرتے ہوئے وقت بار بار غالب کا یہ شعر زبان پر آرہا ہے۔ جو میری سوچ کی غمازی کرتا ہے کہ:

دے داد، اے فلک دل حسرت پرست کی

ہاں کچھ نہ کچھ تو تلافی مافات چاہیے!

اور تلافی مافات کے طور پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مرزا حیدر دوغلات کے خلاف ادی رینہ، حسین ماگرے، دولت چک اور غازی چک نے شیعہ سنی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اتفاق قائم کر کے مرزا حیدر دوغلات کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکائی تھی۔ مرزا حیدر کے قتل کے بعد ان اہم سیاسی کرداروں نے نازک شاہ کو کشمیر کا سلطان مقرر کیا تھا جو محض ادی رینہ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا۔ رینہ

اپنے آپ کو راجپوت تصور کرتے تھے۔ لیکن جو مسلمان ہوگئے تھے اور ماگرے قبیلہ کے ہمراہ گٹھ جوڑ کر کے سُنی مسلک کے علم بردار ہی نہیں بلکہ ریڑھ کی ہڈی بن گئے تھے ۔ چک شیعہ مسلک سے وابستہ تھے۔ اس لئے ان میں قدرتی طور رقابت موجود تھی۔ ادی رینہ نے چکوں کو مغلوب کرنے کے لئے مرزا ھید ردوغلات کے کچھ مغل ساتھی (بغیر مرزا قرہ بہادر) اور اس کے ہمراہیوں کو جیل سے رہا کیا تھا۔ یہ ایک غیر دانشمندانہ کھیل تھا چونکہ کشمیری عوام ادی رینہ کے بہت مخالف ہوگئے اور دولت چک نے عوام کی مدد سے ادی رینہ کو کشمیر سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ سیاسی حالات کے مدِ نظر سنی مسلک کے لوگ مذہبی عقائد کو اہمیت نہیں دیتے تھے اور شیعہ مسلک کے لوگوں کے حامی بن جاتے تھے ۔ اس لئے کشمیر میں شیعہ سُنی اختلافات کی نوعبت مذہبی نہیں ہے، سیاسی بنیادوں پر اُجاگر ہوتی رہی ہے اور کشمیری عوام شائد فیض کے الفاظ میں یہ کہتے رہے ہیں:

تُجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن
جو میرے عارض بے رنگ کو گلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ تیرا ٹھنڈا ہوگا
کتنے آنسو تیرے صحراؤں کو گلزار کریں؟

اور کشمیری عوام کلفتیں ہی کلفتیں، فرقتین ہی فرقتین اُٹھاتے رہے اور ہر بار یہی آواز ہر قریہ ہر گاؤں سے بلند ہوتی رہی:

”چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتل شہر میں
پر مزار اہل صفا کے ہیں یہ ہیں اہلِ صدق کی تزنین!“

آج تک وادی کشمیر تربتون کی وادی کہلاتی ہے اور لوگ حد درجہ تربُت

پرست بن چکے ہیں اور تربتوں کی کہانیاں غیر شعور طور پر اشاریت اور علامتی اشکال کی صورت میں کشمیریت کو اُجاگر کرتی رہی ہیں۔ اس لئے سلاطین کشمیر خود تاریخ کے ہوش رُبا نہاں خانوں میں بھی تربتون کی علامت بن گئے لیکن یہ کشمیری شعور اور لاشعور کے لئے بھی ایک رمز و کنایہ سے زیادہ گہرائی نہیں رکھتے اور ان کی یادیں تک تاریخ کے اوراق میں کمزور نڈھال دکھائی دیتی ہیں۔ اس لئے ہماری تاریخ کوئی جلیل القدر تاریخ نہیں بلکہ ایک اساطیری ڈارمہ کا جُز دکھائی دیتی ہے۔ کشمیر کی تاریخ پر بہت کم توجہ دی گئی۔

یہاں میں ضروری سمجھتا ہوں اور اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ میر شمس الدین عراقی کے واردِ کشمیر ہونے تک شہر سرینگر میں بھی صرف اسلام سرسری طور پر قبول کرلیا گیا تھا اور لوگ مسلمان ہونے کے باوجود بتوں کا احترام رکتے تھے اور تمام ہندو رسم و روایات پر عمل کرتے تھے، بہارستان شاہی کے مصنف نے بیان کیا ہے کہ اسلام کو صحیح رنگ میں پیش کرنے کے لئے میر شمس الدین عرانی نے خواجگان کشمیر اور ارباب شہر کو صحیح اسلام پیش کرنے کے لئے مدعو کیا تھا اور اسلامی سنت پر چلنے کی ہدایات جاری کیں تھیں خود تحفتہ ابواب میں یہ واقعات درج ہیں اور میر شمس الدین عراقی A.D1501 میں دوسری بار کشمیر وارد ہوا تھا اور شمس الدین عراقی حسین مرزا جوہرات کا حکمران تھا کے اہم وزیروں میں تھا اور پہلی بار A.D1481 میں حسین مرزا نے انہیں کشمیر میں اپنا سفیر مقرر کیا تھا اور غالباً A.D 1501 میں واردِ کشمیر ہونے کے بعد میر شمس الدین عراقی کے زیر اثر آنے کے بعد شمس الدین عراقی نے غازی چک کو اہلِ تشیعہ فرقہ میں شامل کیا تھا، اور اسلام کے ترویج کیلئے شمس الدین عراقی نے شہرِ سرینگر کو خاص مرکز بنایا تھا اور میر سید علی ہمدانی سے زیادہ کامیاب طور پر

شریعت کو شہر سرینگر میں رائج کیا تھا۔

میر شمس الدین عراقی کے زمانے میں یعنی A.D1501 تک شہر سرینگر اور خاص طور پر دیہی علاقوں میں مسجدیں بنانے کا کوئی رواج نہیں تھا اور نہ ہی مسجدوں میں نماز ادا کی جاتی تھی۔ لوگ کبھی ہندو اور کبھی مسلم مذہب اپنی مرضی سے بار بار اختیار کرتے تھے۔ یہاں تک کہ مرد ختنہ کی رسم سے بھی اختراز کرتے تھے۔ خواتین زیادہ تر بُت پرستی کی طرف مائل تھیں اور شہر سرینگر کے لوگ شریعت سے بالکل نابلد تھے۔ یہ سب حالات بہارستان شاہی تحفۃ ابواب اور مجالس مومنین جو نصر اللہ ششتری نے تحریر کی ہے میں درج ہیں۔ کسی بھی کشمیری مورخ نے ان احوال کی تردید پیش نہیں کی ہے اور آج تک ہمیں کوئی تاریخی مواد نہیں ملتا جو ان حالات کی تردید کے لئے استعمال ہوسکے۔ شہر سرینگر میں مسجدیں یا کوٹھیاں نہیں تھیں یا ان کا اتنا فقدان تھا کہ میر شمس الدین عراقی نے کچھ عمارات کو مسجد کے طور پر استعمال کیا تھا اور نماز پڑھانے کے لئے امام مقرر کئے تھے۔ اس وقت شہر سرینگر میں میخواری کے اڈے قائم ہو چکے تھے، لوگ کُھلم کُھلا شراب نوش فرماتے تھے۔ ناچ اور رنگ کی محفلیں عام تھیں۔ میر شمس الدین عراقی نے ان رسومات کے خلاف مہم چلائی تھی اور اس کے لئے حقیقی معنوں میں میر شمس الدین عراقی کشمیر میں بانی اسلام کہلانے کے مستحق ہیں اور A.D1561 تک کشمیر میں اہل تشیعہ اپنے عروج پر پہنچ گئے تھے یہ وہی زمانہ ہے جب شیخ حمزہ مخدوم صاحب بھی کشمیر میں اپنا اثر رسوخ پھیلانے کے لئے تگ و دو کر رہے تھے۔ شیخ حمزہ A.D 1494 میں پیدا ہوئے A.D1576 میں اُن کا انتقال ہوا تھا اور انہی کے زمانے میں اہل تشیعہ چک خاندان A.D1561 تک اپنے عروج تک پہنچ چکا تھا۔ مخدوم صاحب سہروردی فرقہ کی تعلیمات کے زیر اثر آچکے تھے۔ اُن کا اپنا کوئی صوفی

فلسفہ ہی نہیں تھا۔ وہ سہروردی تعلیمات پھیلانے میں ہی مصروف ہوئے تھے۔ میر شمس الدین عراقی نے مساجد کی طرف توجہ دی تو شیخ حمزہ نے بھی مساجد کی طرف توجہ دی۔ اور وہ اہلِ تشیعہ کے بہت سخت مخالف ہو گئے تھے۔ اس لئے شیخ حمزہ نے کشمیر کے رشی صوفیوں کو سہروردی فرقے میں شامل ہونے کی خاص ترغیب دی تھی اور اس طرح رشی تصوف کو سہروردی تصوف میں ملا کر ایک نئی روایات کو قائم کیا اور اسلام کی اصلی صورت کو تبدیل کر کے اس میں رشی خیالات کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کی تھی۔ اس طرح لوگ اسلامی نظریۂ خیالات کے ساتھ ساتھ غیر اسلامی روایات پر بھی چلتے تھے۔

یہ باتیں ہمیں "واقعاتِ کشمیر" کے مطالعہ سے پتہ چلتی ہیں جس میں شیخ حمزہؒ کے مرید خاص بابا داؤد خاکی کا اس زمرہ میں خاص تذکرہ موجود ہے اور ان باتوں کا تعلق بابا داؤد خاکی کے زمانے سے منسوب ہے۔ واقعاتِ کشمیر خواجہ اعظم دیدی مری کی تصنیف ہے اور خواجہ اعظم دیدمری نے اپنی تحریرات A.D 1738 میں شروع کیں تھیں اور A.D 1747 میں مکمل کر کے کتاب کی شکل میں پیش کیں تھیں۔ اس لئے اس درمیانی عرصہ میں یعنی (A.D 1476-1494 سے لے کر 1738 تا A.D 1747) اور کوئی مستند تاریخی مواد یہاں کی مذہبی حالاتِ زندگی اور لوگوں کے عقائد کے بارے میں بطورِ سند پیش ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس پس منظر میں میں چک خاندان کے عروج کی داستان اختصار سے بیان کروں گا۔ مجھے احساس ہے کہ کشمیر کی تاریخ اور خاص طور پر سلاطین اور چکوں کی کہانی تاریخ کی حدوں سے نکل کر افسانہ خوانی کی منزلوں پہ قیام کرنے پر مجبور ہیں۔ اور یوں تاریخ کے لبوں پر کئی افسانۂ رنگین خاموش ہو گئے اور آج تک محتاجِ بیان ہیں۔ کچھ لوگوں نے بہت کہانیاں گرمیٔ بزم کی خاطر بنائیں ہیں لیکن یہ کتنی بے کیف ہیں اور گرمیٔ بزم در کجا ایک پھیلتی ہوئی افسردہ

مزاجی ہمارے تہذیب کا احاطہ کئے ہیں۔لیکن انہی افسانوں سے ہمارا شبستان وجود قائم ہے اوران پر یقین کرنے سے ہماری بہاروں کا دوام قائم ہے اور یہی حکایاتِ جمیل ہماری میراث ہین یہی وجہ ہے کہ Oxford History of India یا Cambridge Histroy of India یا انگریزوں سے قبل ہندوستان کی تاریخ کے فارسی دستاویزات یا کسی بھی فارسی تاریخ جو خاندان غلامان کے شاہ جم جاہ کی عظمت حاصل کرنے کے بعد مغل دور کے زوال تک تحریر کی گئیں ہیں ،کہیں بھی کشمیر کی تاریخی حالات چند سطور سے زیادہ صفحہ قرطاس جگہ حاصل نہ کر سکے ہیں۔ سنسکرت دستاویزات جو ہندوستان میں ہندو دور کے وقت تحریر ہوئیں۔ کشمیر کا تذکرہ بروزن شعر ہے۔خود سید علی ہمدانی نے یہاں کے حالات مفصل بیان نہ کئے ہیں اُن کے فرزند سید محمد ہمدانی بارہ سال کی عمر میں کشمیر آئے اور بارس برس تک کشمیر میں قیام کیا۔ یہ کشمیر میں سلطان سکندر کی حکومت کا زمانہ تھا۔لیکن سید محمد ہمدانی نے خود کوئی مفصل حالات یہاں کے سیاسی ،سماجی ،سوشل زندگی سے متعلق تحریر نہ کئے یں اور اُن کے متعلق بھی ہمیں جون راجہ سے استفادہ کرنا پڑتا ہے۔امیر تیمور کے بھمبر کے علاقے تک پہنچنے کے وقت تک بھی جموں ایک ہندو علاقہ تھا۔اس لئے آج بھی تاریخ کی تاریکی راہوں میں علم ویقین کی مشعل روشن رکھنا انتہائی دقیق مرحلہ ہے، ان وضاحتوں کے بعد اب میں چک خاندان کے عروج کی طرف آتا ہوں۔ چک کشمیری نژاد تھے یا نہیں یہ بھی ایک بحث طلب سوال بن گیا ہے۔لیکن مرزا حیدر دوغلات کے خاتمہ کے بعد نازک شاہ صرف دس ماہ حکومت کر سکا، اس کے بعد اسماعیل شاہ دوم صرف A.D1554 تک حکمران رہا اور ناگہانی طور فوت ہو گیا اور دولت چک نے پھر خود سلطان کشمیر کا لقب اختیار کیا۔ دولت چک نے اہل تشیعہ مسلک اختیار کیا تھا۔

اس لئے شمس الدین عراقی کے لئے عظیم مزار اور خانقاہ تعمیر کروائی تھی اور شیخ دانیال اور بابا علی نجار جو شیعہ مسلک کے اہم کردار تھے اُن کے مزار تعمیر کروائے۔ اس لئے سید علی ہمدانی اور شمس الدین عراقی کی تعلیمات کو مروج کروایا تھا اور دولت چک نے کشمیری پنڈتوں سے جزیہ لینا بھی شروع کیا تھا اور سکھا کے تاریخ اور حوالہ جات ظاہر کرتے ہیں کہ دولت چک نے لداخ اور بلتستان پر بھی غلبہ حاصل کرنے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کر لی تھی۔ لیکن دو نا گھانی حالات نے دولت چک کی کایا پلٹ دی۔ ایک ہولناک قہر جو زلزلے کی صورت میں A.D1554 میں کشمیر پر نازل ہوا جو تقریباً ایک ماہ تک وقتاً فو قتاً بدستور جاری ہوا۔ جس کی وجہ سے کئی مندر منہدم ہو گئے، مکانات گر گئے۔ کشمیر تاراج ہو گیا۔ غربت اور افلاس نے لوگوں کے چین کو چھین لیا۔ فیض نے کیا خوب کہا ہے:

کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

اور کشمیر پر ایک طویل شامِ ستم کے مہیب سائے آہستہ آہستہ پھیلنے لگے اور موسم باد و باراں نے فصل اور کھیت دونوں اُجاڑ دیئے۔ پھر دولت چک نے بہت بڑی سیاسی غلطی غازی خان چک کی مرضی کے خلاف اس کے والدہ سے شادی کر لی اور اس کے حامیوں نے دولت چک کو جب وہ ماہی گیری کے شوق سے لُطف اندوز ہو رہا تھا جھیل ڈل سے اغوا کر لیا اور غازی چک نے کھلی بربریت کا مظاہریت کیا اور دولت چک کو بینائی سے محروم کر دیا تھا اور غازی چک نے اسماعیل شاہ دوم کے فرزند حبیب شاہ کو نام کے سلطان ہونے سے بھی محروم کر دیا۔ کچھ مورخین کہتے ہیں کہ حبیب اشاہ اور غازی چک قریبی رشتہ دار بھی تھے۔ چک قبیلہ پہلے ہنزا اور نگر میں آباد ہوا تھا، اسی

قبیلہ کے کچھ لوگ بھوٹان چلے گئے اور کچھ کشمیر میں آ کر کپواڑہ کے علاقے میں آباد ہوئے تھے۔ اس لئے یہ کہنا کہ چکوں کی حکومت کشمیریوں کی اپنی حکومت تھی یہ ایک طویل بحث طلب سوال ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ بھوٹان کے حکمران آج تک اپنے آپ کو چک کہلواتے ہیں اور کچھ مورخین یہ بھی کہتے ہیں کہ چک دانشتہ طور پر کشمیر کے عام لوگوں میں مدغم نہیں ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ یہ قبیلہ دسویں صدی میں کشمیر میں آباد ہوا تھا۔ اور دولت چک اور غازی چک کی حکومت حاصل کرنے تک اس قبیلہ کو کشمیر میں آباد ہوئے پانچ صدیاں گزر چکی تھیں۔ بلکہ عام کشمیری عوام اور چکوں میں کُھلی رقابت موجود تھی۔ یہ سب قیاس آرائیاں اس لئے اہم ہیں چونکہ پنڈت کلہن نے اپنی راج ترنگنی میں خاص طور پر "لنگر چک" کا تذکرہ کیا ہے جو راجہ بٹ سہا کا سخت مخالف تھا اور جس نے دردستان کے حکمران خان دان کی خوبصورت خاتون سے بیاہ کیا تھا۔

اِن لوگوں نے لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کو اپنا شیوہ بنایا تھا اور کپواڑہ، سوپور اور بارہمولہ تک کوئی بھی شخص ان کی جارحیت سے اپنے آپ کو محفوظ تصور نہیں کرتا تھا اور بڈشاہ کو زینہ گیر علاقہ میں ایک فوجی چھاونی قائم پڑی تھی تا کہ لوگوں کو چکوں سے محفوظ رکھا جاسکے اور سلطان زین العابدین نے چک خاندان پر ظلم وستم کا بازار گرم کیا تھا اور پانڈو چک جوان کا سردار تھا۔ اسے قتل کروایا تھا۔ یہ سب کہانیاں مورخ سری وارہ نے اپنی تحریرات میں درج کی ہیں۔ ان لوگوں سے محفوظ رہنے کے لئے سلطان زین العابدین نے ایک حکمت عملی کے تحت ان ہی لوگوں کو پھر اپنی فوج میں بھرتی کیا تھا۔ لیکن بعد ازاں چکوں نے ہی محمد شاہ اور فتح شاہ کے دور میں بیہقی سادات کا خاتمہ کیا تھا اور کاچی چک نے خود سلطان بننے کے بجائے سلاطین کشمیر کو ہی سلطان بنا کر بہ طور کٹھ پتلی استعمال کیا تھا۔ لیکن پھر چکوں پر مشکلات کا کوہ ہمالہ ٹوٹ پڑا۔ مرزا حیدر دوغلات

1540ء میں کشمیر پر قابض ہوا اور A.D 1551 تک چکوں پر بے انتہا مظالم ڈھائے تھے اور پھر میر شمس الدین عراقی نے انہیں اسلام سے مشرف کیا تھا۔اس طرح دولت شک کو نابینا بنا کر پہلی بار غازی چک نے سلطان کا لقب اختیار کر کے کشمیر میں چک خاندان کی بنیاد ڈالی تھی۔غازی چک کے حالات سکھا نے تحریر کئے ہیں۔غازی چک بہت ظالم تھا۔مگر اس کی شہریت اس وقت پھیل گئی جب اس نے راجوری کے مقام پر مرزا حیدر دوغلات کے چچا زاد بھائی مرزا قرہ بہادر کو A.D1561 میں شکست دے دی تھی جس کا تذکرہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں کیا ہے۔اس سے قبل غازی چک نے شاہ ابوسانی کو A.D1557 میں شکست دی تھی۔جس کو اکبر بادشاہ نے لاہور میں نظر بند رکھا تھا۔مگر جس کو یوسف چک نے اکبر کی قید سے فرار ہونے میں امداد دی تھی اور اسی ترغیب پر A.D1557 میں کشمیر پر حملہ آور ہوا تھا ۔کشمیر کی تاریخ ان واقعات کے بیان کرنے میں کتنی مشکوک ہے۔اس بات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سکھا کے مطابق ابوثانی اور غازی چک کا مقابلہ پر ہاس پورہ کے مقام پر ہوا تھا اور بہارستان اور تاریخ اعظم کے مطابق ''ہانجی ویرہ'' کے مقام پر جنگ ہوئی تھی اور قرہ بہادر کی 1561 کی ہزیمت کا سبب آئین اکبری میں اس وقت راجوری میں خراب موسم تھا۔ایک وبائی بیماری تھی مسلسل بارشیں اور تقریباً ان وباؤں میں پانچ صد مغل سپاہیوں کی اموات جتلایا گیا ہے۔لیکن کشمیری مورخین تاریخ حیدر ملک اور نارائین کول نے اپنے تاریخ نامہ میں قُرہ بہادر کی شکست کو کشمیری فوج کی قابلیت قرار دیا تھا۔غازی چک نے کشمیر میں نہیں بلکہ راجوری جا کر قرہ بہادر سے مقابلہ کیا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب لداخ میں بغاوت نے سر بلند کیا تھا۔ A.D 1562 میں غازی چک نے اپنے فرزند احمد خان کو لداخیوں کی بغاوت ختم کرنے

کے لئے بھیجا۔ مگروہ کامیاب نہ ہوااس لئے وہ خود لداخ کی بغاوت ختم کرنے کے لئے گیا۔ لیکن موسم اتنا خراب تھا کہ غازی خان چک کی ہاتھوں کی اُنگلیاں ناکارہ ہوگئیں اوراس کی آنکھوں کی بینائی چلی گئی تھی اور 1562 میں وہ تخت سے دستبردار ہوگیا تھا اور اس کا برادر حسن چک سلطان کشمیر بن بیٹھا تھا۔ حسن چک A.D 1562 میں کشمیر کے تحت پر متمکن ہوا۔ ہندوستان میں اکبر جلال الدین سے گزر کر اکبر اعظم بن چکے تھے۔ اور شاہ جم جاہ کی شان شکوہ کو مات دے چکے تھے۔ مغل تہذیب اپنے عروج کی طرف پرواز کررہی تھی۔ اور اکبری رنگنی، ایام کی داستانیں، ہندوستان کے سورماراجپوتو ں کے وارفتہ عزائم کوحسن وخاشاک یا گردسفر بنا چکی تھیں ۔یاں حسن چک مصائب کا شکار تھا۔ غازی چک کے فرزندوں نے علم بغاوت بلند کیا تھا اور ایک شخص خان زمان اپنی سازشوں کے لئے انتہائی بدنام تھا اور وہ سکھا کے کہنے کے مطابق اس کو زینہ کدل پُل سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی تھی، اسی دوران غازی چک بھی انتقال کرگئے۔ حسین شاہی چک نے کشمیر میں نوروز کا جشن منانے کی روائت قائم کی تھی۔ اس کے دورتک کشمیر میں جشنِ نوروز کا کوئی تذکرہ موجودنہیں ہے ۔حسین چک کے حالات کی خبر اکبر اعظم کو ملی تو اکبر اعظم نے 1568ء میں مرزا اصفہانی اور میر یعقوب کو بطورِ سفیر کشمیر کے حالات جاننے کے لئے بھیجا۔ حسین چک نے ان دونوں کا شاہانہ استقبال کیا۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مرزا مقیم اصفہانی کٹر شیعہ مسلک سے تعلق رکھتا تھا اوراس سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ اکبر کے دربار میں بہت سے لوگ اہلِ تشیعہ تھے۔ مغل شہزادے ایرانی سرداروں کی عورتوں سے نکاح کرتے تھے۔ اس لئے حسین شاہ چک اکبر اعظم کی خوشنودی حاصل کرنے کے حواہاں تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اکبر اعظم کے سفیروں کی آمد کے بعد کشمیر میں پہلا

شیعہ سُنی فساد برپا ہوا تھا۔ جب یہ سفیر کشمیر سے روانہ ہوئے تو حسین شاہ چک نے انہیں بہت سے تحفے عنایت کئے اور اپنی دختر کو دہلی روانہ کیا تا کہ وہ شہزادہ سلیم سے اگر شہزادہ مناسب سمجھے نکاح کر سکے اور حسین شاہ چک نے اکبر اعظم کی شہنشائیت کا اقبال تسلیم کیا تھا۔ لیکن طبقات کے مصنف کے مطابق شہزادہ سلیم نے حسین چک کی دختر سے نکاح کرنا تسلیم نہ کیا۔ اکبر اعظم نے اس کی دختر کو عزت اور احترام کے ساتھ واپس کشمیر روانہ کیا تھا۔ لیکن حسین شاہ چک سے چک قبیلے کے لوگ نالاں تھے اور A.D1569 میں وہ تخت سے دستبردار ہو گیا تھا۔ اس کا برادر علی خان 1569 میں تخت نشین ہوا اور دس برس تک کشمیر کا حکمران رہا، اور یہ بات قابلِ غور ہے کہ A.D 1572 میں علی شاہ نے راجہ کشتواڑ راجہ بہادر سنگھ کو مغلوب کرنے کے لئے کشتواڑ پر فوج کشی کی تھی۔ لیکن راجہ بہادر سنگھ نے اپنی بہن جس کا نام شنکر دیوی تھا کی شادی علی شاہ کے پوتے یعقوب خان سے کرنے کی تجویز پیش کی اور تاریخ ملک حیدر چاڈورہ کے مطابق سرکاری دھوم دھام سے یہ شادی رچائی تھی۔ اسی طرح علی شاہ چک نے راجوری کے راجہ محمد خان کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کئے تھے۔ ان باتوں کا حوالہ طبقات اکبری میں ملتا ہے اور طبقات اکبری کشمیر فتح کرنے کے بعد اکبر اعظم کے کہنے پر نظام الدین احمد نے تحریر کی تھی ۔لیکن طبقات اکبری کی Chromology مشکوک ہے اور کئی واقعات صرف سنی سنائی حکایات پر مبنی ہیں۔ اور ''تاریخ فرشتہ'' اور بھی مشکوک ہے چونکہ فرشتہ نے صرف ''طبقات اکبری'' کے حوالہ جات پر ہی انحصار کیا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ A.D 1573 میں اکبر اعظم نے پھر دو سفیر کشمیر کے حالات جاننے کے لئے روانہ کئے تھے۔ جن کے نام مُلا عشقی اور قاضی صدر الدین بتائے جاتے ہیں اور علی شاہ سلطان کشمیر نے نہ صرف

ان کا شاندار استقبال کیا تھا بلکہ اکبر اعظم کے نام کا سِکہ بھی جاری کیا تھا۔ اور 1579 میں یہ سفیر واپس دہلی روانہ ہوئے تھے۔

مجھے ان باتوں کا تذکرہ اس لئے ضروری محسوس ہوا کہ قاری کو اِس بات کا اندازہ ہونا چاہیے کہ اکبر اعظم کشمیر کے حالات پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ چکوں کی یا اہل شیعہ حکومت کا مخالف نہیں تھا بلکہ اس کے چکوں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اس کے دربار میں اہلِ تشیعہ کا غلبہ تھا اور وہ بیرم خان کو احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا جو اہل تشیعہ مسلک سے تعلق رکھتا تھا۔ 1579 تک کے حالات بتاتے ہیں کہ اکبر اعظم کا کشمیر پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ لیکن 1576 میں ایک آفت ناگہانی قحط کی صورت میں کشمیر پر نازل ہوا چونکہ موسم گرما میں شدید برفباری ہوئی اور شالی کے کھیت تباہ و برباد ہوگئے اور اسی زمانے میں شہرِ سرینگر میں آگ کی واردات نے نصف شہر کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ یہ سب معاملات اکبر اعظم کے سفیروں نے دیکھے تھے جو اس وقت کشمیر میں قیام کر رہے تھے۔ ان سفیروں کی واپسی کے فوراً بعد علی شاہ گھوڑے سے گر کر وفات پا گیا اور اس کا فرزند یوسف شاہ کشمیر کے تخت پر بیٹھا۔

یوسف شاہ چک انتہائی خوب رُو نوجوان تھا اور عاشقانہ مزاج کا بادشاہ تھا اور ایک اچھا شاعر اور موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اور ملک حیدر چاڈورہ کی تاریخ کے مطابق وہ اکبر اعظم کے دربار میں حاضر ہوا اور کئی بار تان سین کی موسیقی کی مجلسوں میں شامل ہوا تھا۔ حبہ خاتون سے اس کا ازدواج انتہائی عاشقانہ تھا۔ اور حبہ خاتون خود ایک اچھی شاعرہ اور گانے والی تھی۔ وہ چندر ہارہ کے مضافات میں جو موضع پانپور میں واقع ہے پیدا ہوئی تھی۔ اس کی خوابیدہ نگاہوں کا فسون اس کے ہونٹوں کے کنول، اس کے حُسن کی داستانوں نے کشمیر میں دھوم مچا رکھی تھی۔ اس کی آواز میں جادو تھا۔ اور سننے والے

کہتے ہیں کہ حبہ خاتون کی آواز زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح دل وجگر میں اُتر جاتی تھی۔ یوسف شاہ چک نے ایک بار پانپور سے گزرتے ہوئے اس کی آواز سُنی جب کہ وہ کوئی گانا کسی کھیت میں گا رہی تھی۔ تو یوسف شاہ چک نے اس دہقان زادی کو اپنی ملکہ بنایا تھا اور یہ لڑکی جس کو اس کے شوہر نے پہلے طلاق دیا تھا اور جس کا اصلی نام زون تھا۔ حبہ خاتون کے نام سے ملکۂ کشمیر بن کر مشہور ہوئی۔ اس کی شادی شدہ زندگی یوسف چک کے ساتھ مثالی تھی۔ اور رب الجلال نے حبہ خاتون کو نہ صرف متاع سوز عطا کیا تھا بلکہ وہ نطق گران بار کی بھی مالک تھی اور اتنے اچھے شعر کہتی تھی کہ اُن میں درد دل کی گرانِ مایہ کیفیات عقل و دانش کو محو حیرت کر دیتی تھیں۔ لیکن یوسف شاہ چک کا زمانہ انتہائی شورش زدہ تھا۔ 1576 کے سیلاب اور قحط نے کشمیر کے معاشی حالات انتہائی ابتر کر دیئے تھے اور پوری وادی افلاس زدہ ہو چکی تھی۔ غربت کے شور نالہ و ماتم میں لوگ سینہ کاوی کر رہے تھے اور ملک کا نظم و نسق تباہ ہو چکا تھا۔ سیاسی حالات انتہائی مخدوش تھے اور کشمیری تہذیب اور زندگی کے وسائل ناکارہ سے ناکارہ ترین رہے تھے ۔ یوسف چک صاحبِ تقدیر تھا۔ مگر تقدیر اور حالات کی سازش کا شکار تھا اور گردشِ ایام اس سے انتقام لینے پر بضد نظر آ رہی تھی۔ اور پوری سلطنت پر ظلم و جبر کے سیاہ بادل منڈلانے لگے تھے۔ میں قاری کی توجہ اس بات کی طرف خاص طور دلانا چاہتا ہوں کہ اگر یوسف چک نے اکبر اعظم کے دربار میں حاضری دی تھی تو اکبر اعظم اگر چاہتا تو اسے گرفتار کر سکتا تھا اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب مبارک بیہقی نے یوسف شاہ چک کو سرینگر میں عیدگاہ کے مقام پر شکستِ فاش سے دوچار کیا اور اس کے فوراً بعد سید مبارک بیہقی کا خاتمہ یوسف چک کے یکجدی لوہار چک نے 1599 میں ہی کر دیا اور حکومت پر تخت نشین ہوا تو یوسف چک 3 جنوری 1580 A.D کو اکبر اعظم کے دربار میں فتح پور سیکری کے مقام پر زمین بوس ہوا اور اکبر اعظم سے امداد

طلب کی تھی۔اس واقعہ کا تذکرہ نظام الدین احمد نے ''طبقات اکبری'' میں اور ''فرشتہ '' نے تاریخ فرشتہ میں کیا ہے اور اکبر اعظم نے مان سنگھ اور مرزا یوسف رضوی کے نام فرمان جاری کیا تھا کہ یوسف شاہ چک کو پھر سے کشمیر کے تخت پر متمکن کریں۔ لیکن یوسف شاہ چک فرار ہو کر لاہور آیا چونکہ وہ اکبر اعظم پر بھروسہ نہ کر سکتا تھا اور محمد بٹ جو ایک اہم کشمیری کردار تھا کے ہمراہ بھمبر کے علاقہ کی طرف روانہ ہوا اور یہ سُن کر لوہار چک اس قدر حواس باختہ ہوا چونکہ وہ سمجھا تھا کہ مغل فوج، حملہ کر رہی ہے کہ اس نے اپنی رضامندی سے تخت سے دستبرداری دے دی اور حکومت یوسف شاہ چک کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا۔ لوہار چک نے اس وعدہ سے جلدی انحراف کیا۔ اور اسی طرح 8 نومبر 1580 کو سوپور کے مقام پر ایک مختصر لڑائی ہوئی ۔ لوہار چک نے ہزیمت اُٹھائی اور یوسف شاہ چک نے دوبارہ کشمیر کا تخت حاصل کیا۔ یہ بات کسی بھی تاریخ میں واضح نہیں کہ یوسف چک اکبر اعظم کے دربار سے فرار کیوں ہوا؟ اور پھر بھمبر کے مقام سے سوپور کیوں گیا اور پھر اس نے انتہائی بے دردی سے لوہار چک کی بصیرت چھین لی تھی اور یہ بھی بہارستان شاہی میں درج ہے کہ سید مبارک کے ساتھ جو اکبر اعظم کا مداح تھا یوسف چک نے بہت اچھا سلوک کیا اور اپنی دختر کی شادی سید مبارک خان کے فرزند سے انجام دی تھی اور اکبری احکامات پر عمل کیا تھا۔ بیگار، جزیہ اور میر بحری کے عائد ٹیکس معاف کر دیئے تھے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اکبر اعظم نے یوسف چک سے کوئی انتقام نہ لیا بلکہ جب 1581 میں سفیر اکبر اعظم کابل سے واپس ہندوستان آیا تو اس نے یوسف شاہ چک کے دربار میں دو سفیر روانہ کئے تھے اور یوسف شاہ چک اکبر کے سفیروں کا استقبال کرنے خود بارہمولہ گیا اور اِن کے ہاتھ چومے اور اکبر اعظم کے خط کو آنکھوں سے لگایا تھا۔ اس نے اپنے نابالغ فرزند حیدر خان کو اکبر کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔ اس خط میں اکبر نے یوسف چک کو مغل

دربار میں حاضر ہونے کی تاکید کی گئی تھی۔ لیکن اکبر کے سفیروں نے اکبر سے اظہار کیا تھا کہ یوسف چک مغل دربار میں حاضر نہیں ہونا چاہتا ہے۔ اکبر نے حیدر خان کو جو شیخ یعقوب صرفی کے ہمراہ اکبر کے دربار میں حاضر ہوا تھا۔ A.D1582 میں واپس کشمیر بھیج دیا۔ اگر اکبر چاہتا وہ شیخ یعقوب صرفی اور حیدر خان دونوں کو قیدی بنا سکتا تھا ۔اس کے باوجود اکبر نے کشمیر کا رُخ نہ کیا۔ اور A.D1584 میں یوسف چک نے اپنے دوسرے فرزند کو اکبر اعظم کے دربار میں حاضری دینے کے لئے بھیجا تھا اور پھر اکبر اعظم کے عتاب سے بچنے کے لئے A.D1585 میں خود اکبر اعظم کے دربار میں حاضری دی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اکبر اعظم کے ارادے نیک نہیں تھے وہ یوسف شاہ چک کو A.D 1585 میں ہی قیدی بنا سکتا تھا۔ لیکن اکبر نے چوتھی مرتبہ دو سفیر حکیم علی جیلانی اور بہاؤالدین کو کشمیر یوسف چک کے دربار میں روانہ کیا۔ لیکن یوسف شاہ چک کا قبیلہ اور سردار مغلوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ سے بدظن ہو چکے تھے اور A.D1586 میں جب یوسف چک نے اکبر اعظم کے دربار میں جانے سے انکار کر دیا تو اکبر نے راجہ مان سنگھ کی سربراہی میں ایک قلیل فوج جو 5000 افراد پر مشتمل تھی کشمیر بھیج دی اس فوج کی رہنمائی اور راستہ دکھانے کا کام شیخ یعقوب صرفی اور حیدر چک نے انجام دیا تھا لیکن اس وقت ایبٹ آباد میں مان شہرہ میں شدید برفباری ہوئی یہ منصوبہ عمل میں نہ لایا جا سکا۔ اکبر اعظم نے پکھلی کے راستہ کشمیر فوج بھیجنے کا فرمان جاری کیا۔ یوسف شاہ چک نے زمستانی موسم کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے مغل فوج کی یلغار کو روکنا چاہا۔ موسم انتہائی ناخوشگوار ہو گیا اور مان سنگھ نے یوسف شاہ چک کو دربار اکبری میں حاضر دینے پر بات چیت کے ذریعہ آمادہ کیا تھا کہ معاملات طے کیئے جائیں اور راجہ بھگوان داس نے یوسف شاہ چک کو ہمراہ لیا اور 28 مارچ A.D1586 میں اکبر اعظم کے دربار میں حاضر کیا۔ اکبر اعظم نے دو سال

تک یوسف شاہ چک کو خلاف ورزی وعدہ وحاضرِ دربار نہ ہونے میں پاداش میں بند کردیا تھا مگر دو سال کے بعد یوسف شاہ چک کو رہا کیا گیا اور ایک چھوٹی سی جاگیر بہار میں عطا کی اور پانچ صد سوار رکھنے کی اجازت عطا کی تھی اور یوسف شاہ چک کو مغل فوج میں ایک سردار کے طور پر بھرتی کیا تھا اور فتح بنگال کے وقت یوسف شاہ چک 500 مغل سواروں کے ہمراہ معرکہ میں شامل ہوا تھا اور اس طرح 11 ستمبر A.D1592 کو یوسف شاہ چک نے انتقال کیا اور بہار میں مدفن ہوا۔ یہ سب باتیں تفصیل کے ساتھ اکبر نامہ میں درج ہیں لیکن سب سے زیادہ حزن اور ملال کی کہانی یہ ہے کہ حبہ خاتون، یوسف شاہ چک کی جدائی برداشت نہ کرسکی اور حوادث کی یلغار ایسی شدید تھی کہ اس کی زندگی بے خواب گزرگاہوں میں بھٹکتے گزرنے لگی اور اس کے لئے اب سیاہ چاند شبِ غم کا دائم ہوگیا اور راہ وفا میں خود منزلوں نے اس کا راستہ روکنا چاہا اور اس کے ہجر کا ہر دن، ہزار صدیوں سے زیادہ طویل ہوگیا لیکن اس کی اُمید کی کرن اس کے نغموں کی روح میں تحلیل ہوگئی تھی۔ اس کی آواز کا درد شبِ غم کے ماتھے پہ صلیب بن گیا تھا۔ اس کی آواز نے روحِ دانش آدم اور ضمیر کی افسردہ مزاجی کو پکارا تھا اس کے گیت قریہ، قریہ زبان زدعام ہوگئے اور حسین مشیر علوی کی زبان میں۔

مطربہ گیت سنا، گیت سنا، گیت سنا

گیت وہ گیت کہ آکاش سے تارے ٹوٹیں
گیت وہ گیت کہ مضراب سے شعلے لپکیں
گیت وہ گیت کے انفاس سے لپٹیں نگاہیں
گیت وہ گیت کہ یزدان کے بھی آنسوں ٹپکیں

اور حبہ خاتون نے فقیری اختیار کی تھی اور پنتھ چوک کے مقام پر انتقال کیا۔ اس کی مظلومیت دیکھ کر خود یزدان کے آنسوں ٹپک پڑتے ہوں گے۔

☆☆☆

# کشمیر مغلیہ دور میں (باب دوم)

اکبر کے وفادار سردار نے مغل سلطنت کے نقیب بن کر اور مغل شان وشکوہ کے علمبردار، تاریخ کی نیم روشن تاریکی راہوں سے گزر کر 15 اکتوبر 1586 میں وارِدِ کشمیر ہوا تھا اور اکبر اعظم کے نام کا خطبہ جاری کیا اور اکبر اعظم کے نام سے سِکہ جات جاری کیئے تھے۔ لیکن چک خاندن کے لوگوں نے یعقوب چک کو کشتوار سے واپس بُلایا اور مغلوں سے نبرد آزمائی کرنا چاہی۔ بیجبہاڑا قصبہ سے چودہ میل دور لڑائی کی تیاری کرلی گئی۔ قاسم خان نے مبارک خان کو سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ لیکن یعقوب چک اس دوران شنکر آچاریہ پہاڑی پر اپنا ڈیرہ جمانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ 19 نومبر 1886 کو اس نے مغل فوج پر شب خون مارا مگر مغل شاہ سواروں نے اس کے ساتھیوں کا خاتمہ کردیا اور جان بچا کر یعقوب چک واپس کشتواڑ چلا گیا۔ اس کے حامی نہایت کسمپرسی کی حالت میں قاسم خان کے دربار میں قدم بوس ہوئے اور اکبر اعظم کی وفاداری کا اعلان کردیا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ابوالفضل کے مطابق جن لوگوں نے قاسم خان کی قدم بوسی کا شرف حاصل کیا تھا اُن میں یعقوب چک کا برادر حسین خان چک بھی شامل تھا۔ لیکن یعقوب چک نے مغل فوج سے براہ راست جنگ کرنے کے بجائے گوریلا طرز کی مداخلت شروع کی۔ اسی دوران قاسم خان کے بجائے مرزا یوسف خان رضوی نے کشمیر کی صوبیدار حاصل کی اور یعقوب چک اور اس

کے ساتھیوں کو کچل ڈالا تھا۔ یعقوب چک، یوسف خان رضوی کے عتاب سے محفوظ رہنے کے لئے کشتواڑ بھاگ کر چلا گیا اور شمس چک کو امان ملی اور اس نے اپنی دختر کسی مغل شہزادے کے حرم میں داخل ہونے کے لئے پیش کی تھی۔ ان سب واقعات کا تذکرہ اکبرنامہ میں موجود ہے۔ یعقوب چک نے یہ حالت دیکھتے ہوئے اپنے برادر کو یوسف خان رضوی کے پاس روانہ کیا اور یہ واقعہ 11 جولائی 1589 A.D کا ہے اور یوسف چک وہ خط جس میں اس نے اپنے گناہوں کی معافی چاہی تھی۔ یوسف خان رضوی کو پیش کیا تھا اکبر اعظم نے یوسف چک کو معاف کر دیا اور اس کو اس کے والد یعنی یوسف چک کے پاس بہار جاگیر پر 28 جولائی 1589 A.D کو روانہ کر دیا اور یوسف چک اور یعقوب چک کو پٹنہ بہار کے نواحی علاقہ میں جاگیر عطا کی گئی تھی۔ ان سب باتوں کا ذکر بدایونی نے اپنی تاریخ میں کیا ہے اور اس طرح اکبر اعظم کے خلاف مدافعت کا کشمیر میں خاتمہ نظر آتا ہے۔

پہلی بار جب اکبر اعظم وارِد کشمیر ہوئے، اُنہوں نے بیگار اور ہندوؤں سے جزیہ لینا منسوخ کر دیا اور کشمیر کی خوشحالی کیلئے کئی اقدام اُٹھائے اور اکبر اعظم کا سب سے عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے زمین یعنی زرعی زمین کے بندوبست کے احکام جاری کئے۔ شیخ فیضی کو مراز علاقہ جات یعنی جنوب کشمیر کی زرعی زمینوں کے بندوبست کے لئے مقرر کیا اور خواجہ شمس الدین کافی اور ایک شخص جس کا نام کنور مان سنگھ تھا شمالی کشمیر یعنی کامراج علاقہ جات کے بندوبست اراضی کے لئے معمور کیا۔ اُنہوں نے قائدۂ کلیہ قائم کیا اور ساری فصل لوٹنے کے بجائے کاشت کاروں کو صرف خریف فصل کا 1/3 حصہ بٹائی شاہی خزانہ میں دینے کے لئے ہدایت جاری کیں تھیں۔ ہر دیہات میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ کتنے خروار شالی پیدا ہوتی ہے اور اسی حساب سے پیسے مالیہ

وصول کرنے کے احکامات صادر کیئے گئے۔ اُس زمانے میں اکبر نامہ کے مطابق اکبر اعظم کے منتظمین نے پوری وادی کی پیداوار کا تخمینہ لگایا اور 22 لاکھ خروار شالی پیدا ہونے کی توقع ظاہر کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شالی کی پیداوار بہت زیادہ تھی مگر مرزا یوسف خان دراصل غبن اور رشوت خوری میں ملوث تھا۔ اس کی خبر طوطہ رام نے اکبر کو دینا چاہی تو مرزا یوسف نے اسے زندان میں ڈال دیا تھا مگر طوطہ رام فرار ہو کر اکبر اعظم کے دربار میں پہنچ گیا اور اکبر اعظم کے پاس شکایت درج کی اور اکبر نامہ کے مصنف کے مطابق اکبر نے صحیح واقعات جاننے کے لئے 27 جولائی 1591 کو قاضی نوراللہ اور قاضی علی بغدادی کو کشمیر روانہ کیا جس نے انتہائی جانفشانی سے ازسرِ نو رکشمیر کی زرعی اراضی کا بندوبست کیا اور اندازہ لگایا کہ تیس لاکھ خروار اراضی پیدا ہونی تھی۔ قاضی نور ایک بلند شخصیت کا مالک تھا اور اس نے اپنی کتاب ''مجالس مومنین'' میں ان باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اس نے کشمیریوں کو مغل فوج میں بھرتی ہونے کی ترغیب دی تھی اور اس نے تجویز پیش کی تھی کہ فوجی لوگوں کو کاشت کاری کے لئے زمین دینے کے بجائے نقد تنخواہ دینی چاہیے۔ اس نے کشمیر کو 4 پرگنوں میں تقسیم کیا اور ہر پرگنہ کے لئے الگ فوج بھرتی کی تھی۔ قاضی نوراللہ دراصل شیعہ مسلک سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی فوج میں چک قبیلہ کے لوگ بھرتی کیئے گئے تھے۔ کشمیر میں چک قبیلہ کے لوگ کافی تعداد میں بھرتی کیئے گئے تھے۔ اس بات کا تذکرہ خود جہانگیر نے تزک جہانگیری میں کیا ہے۔ اکبر اعظم کشمیر میں بھی شیعوں کے مخالف نہیں تھے۔

میں نے ان باتوں کی تفصیل اس لئے بیان کی ہے کہ یہ کہنا کہ اکبر اعظم نے یوسف شاہ چک کو دھوکہ سے گرفتار کیا تھا بالکل غلط ہے۔ اسے راجہ مان سنگھ نے اکبر اعظم کے دربار میں آنے کی ترغیب دی تھی تا کہ وہ اکبر کے عتاب اور جلال شاہی سے

محفوظ رہے اور کوئی اچھا منصب پا سکے۔ یہ مان سنگھ کی اپنی قیاس آرائی تھی اس میں اکبر اعظم کا کوئی دخل نہ تھا اور کشمیر پر مغل راج قائم ہونے کے بعد مغل صوبہ داروں نے کشمیری لوگوں کو مغل فوج میں بھرتی کیا تھا اور فوجوں کا کاشت کاری کے لئے اراضی دی تھی اور قاضی نور اللہ نے فوجیوں کو نقد رقم دینے کی تجویز پیش کی تھی اور مغلوں نے ہی کشمیر میں خوشحالی کے لئے زرعی اراضی کا بندوبست کرایا تھا اور جب مرزا یوسف خان کے خلاف طوطہ رام نے شکایت پیش کی تھی تو اکبر اعظم نے قاضی نور اللہ کو جو ایک کٹر شیعہ تھا از سر نو بندوبست کے لئے مقرر کیا تھا۔ اس لئے اکبر اعظم کے دربار میں شیعہ سنی تفریق کا کوئی رویہ موجود ہی نہ تھا۔ بلکہ اہلِ شیعہ اہم خدمات پر معمور کئے جاتے تھے ۔ اگر اکبر اعظم کے خلاف کسی نے بغاوت کی تھی وہ افغان اور مغل نژاد منصب دار تھے۔ خود اکبر اعظم کے خلاف مرزا یوسف خان کے چچا زاد بھائی مرزا یادگار نے بغاوت کی تھی اور اپنے آپ کو کشمیر کا حاکم قرار دیا تھا اور اپنے ہی رشتہ دار مرزا یوسف کے خاندان کے ساتھ انتہائی نازیبا سلوک کیا تھا اور ان حالات کو کچلنے کے لئے 22/ جولائی 1592 میں اکبر اعظم نے دوسری بار کشمیر کا رُخ کیا تھا اور شاہی فوجوں نے پیر پنجال کے درّہ پر مرزا یادگار کی فوجوں کا قلع قمع کر دیا اور وہ ہری پور کی طرف فرار ہو گیا لیکن مرزا یوسف خان کے وفاداروں نے اسے گرفتار کر کے اس کا سر قلم کر دیا تھا۔ اکبر اعظم کو جب یہ خبر ملی وہ 7/ اکتوبر 1592 کو دوسری بار وارِدِ کشمیر ہوئے تھے اور پانپور کے مقام پر کشمیر کے زعفران زاروں سے جو اس زمانے میں بھی مشہور تھے محظوظ ہوئے اور سرینگر پہنچ کر ہندوؤں کے ساتھ دیوالی کا تہوار منایا تھا اور کہا جاتا ہے کہ شمس چک کی دختر کو اکبر نے اپنے حرم میں شامل کیا تھا اور اسی پکھلی کے راستے سے اکبر اکتوبر 1592 میں واپس دہلی روانہ ہوئے تھے۔ اس لئے یہ کہنا کہ مغل صرف

کشمیر میں داو عیش لیتے تھے بالکل غلط ہے۔ بلکہ مغلوں نے کشمیر میں شادی بیاہ سے بھی کشمیریوں کے ساتھ رشتے ناطے جوڑے تھے۔ A.D1593 میں مرزا یوسف خان کے بدلے آصف خان کو کشمیر کا صوبیدار مقرر کیا تھا۔ جو ایک بہت بڑا شاعر تھا ایک بہت بڑا عالم تھا اور ایک انتہائی قابل منتظم ثابت ہوا۔ چونکہ جاگیرداری نظام کی خرابیوں کی وجہ سے کشمیری عوام عام طور پر A.D 1592 کے زمانے میں کافی افلاس زدہ ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ آصف خان کشمیر میں بہت مختصر عرصہ رہا تھا اور پھر آصف خان کی جگہ محمد قلی خان کو کشمیر کا صوبیدار مقرر کیا گیا تھا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ تیسری مرتبہ اکبر 6/جون 1597 کو واردِ کشمیر ہوئے ان کے ہمراہ دو پادری فادر زیویئر اور نٹ ڈکٹ گوز بھی تھے اور ان سب باتوں کا پتہ فادر زیویئر کے خطوط سے ملتا ہے۔ فادر زیویئر اکبر کے دربار میں 23 برس تک ٹھہرے تھے۔ اور کشمیر سے متعلق فادر زیویئر نے اپنے تاثرات رقم کئے ہیں اور اسی سال یعنی A.D 1597 میں کشمیر میں قحط سالی نے ملک کو تباہ کر کے رکھدیا اور قحط سے نجات دینے کے لئے اکبر نے قلعہ ہری پربت بنانے کا فرمان جاری کیا تھا۔ اور اکبر اعظم نے فراخ دلانہ مزدوری دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس طرح اکبر اعظم نے کشمیریوں کو مفت میں مالی امداد حاصل کرنے کے بجائے محنت اور مشقت سے روزی کمانے کی ترغیب دی تھی۔ ان سب باتوں کا تذکرہ فادر زیویئر نے کیا ہے۔ صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی مزدوری پر مامور کی گئیں گئیں اور اُن کی اجرتیں چھ آنے یومیہ مقرر کی گئی اور اگر کنواری لڑکی تھی تو چار آنے یومیہ اجرت دی جاتی تھی اور اس بات کی تائید جہانگیر نے تزک جہانگیری میں کی ہے اور قلعہ ہری پربت پر جو عبارت کندہ ہے اس کے مطابق اس کی تعمیر پر ایک کروڑ دس لاکھ اکبر شاہی دینار خرچ ہوئے تھے اور یہ قلع تعمیر کرنے کا مقصد مغل فوج کو لوگوں سے

الگ رکھنا تھا تاکہ عوام فوجی زیادتیوں کی شکایت نہ کرسکیں اور ملک میں امن قائم ہوسکے۔

یہاں میں کچھ باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔ یہ کہنا کہ اکبر اعظم نے کشمیر کو غلام بنایا شاعرانہ تعلیٰ ہے۔ اکبر اعظم نے سارے شمالی ہندوستان کو مفتوح کیا تھا ۔مغلوں نے کشمیر میں دادِ عیش لینے کے بجائے اس وادی رنگین کو از سرِ نو منظّم کیا۔ بندوبست اراضی کا اہتمام کیا اور مغل فوج میں کشمیریوں کو بھرتی کرنے کی ترغیب دی تھی اور جہاں تک یعقوب چک کی آزادی پسندی اور مزاحمت کا تعلق ہے تو اسے اکبر اعظم کو جو خط روانہ کیا تھا اس میں شہنشاہ سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنا پاپوش عنایت کریں تاکہ یعقوب شاہ چک اُس پاپوش کو اپنی کلاہ میں سجا کر اپنی کلاہ کی زینت میں اضافہ کرے اور یہ خط یعقوب شاہ چک نے 11 جولائی A.D1589 میں اپنے برادر کے ذریعہ بھیجا تھا اور اس کا تذکرہ اکبر نامہ میں موجود ہے اور سکھا نے بھی اس واقعہ کا تذکرہ اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ اگر یعقوب خان چک نے اکبر بادشاہ کے سامنے ایسی عاجزی کا اظہار کیا تھا تو اس میں اکبر اعظم کا کیا قصور تھا؟ کیا یہ خط ''رمیدہ خاطر ناشاد'' تحریر کیا گیا تھا؟ یا یعقوب شاہ چک اپنے شوقِ رُسوائی کی پذیرائی چاہتا تھا۔ وہ اپنے عہدِ وفا کا حق میدانِ جنگ میں اپنی جان دے کر سرفروشی کا حق ادا کرسکتا تھا لیکن اس نے ایسا کچھ نہ کیا۔ اس میں اکبر اعظم کی کیا خطا تھی؟

کسی کشمیری قوم پرست نے اس سوال کا جواب نہیں دیا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ کشمیری قوم پرست نے جو اکبر کو الزام دیتے ہیں کہ کشمیر کی عام محرومیوں، ناکامیوں، رُوسیاہیوں اور تباہ کاریوں کا سبب اکبر اعظم کا کشمیر پر دھوکہ سے قبضہ کرنا جتلاتے ہیں اور اکبر اعظم کی وجہ سے کشمیر کے گلستان، سبزہ زار، لہلاتے ہوئے کھیت

شاداب اور نو خیز نورس شگوفے۔ بہاروں کا ناز، فضاؤں کی خوشبو، نسیم سحرا اور روح پرور صبا کے مسکن سب تاراج ہو گئے اور کشمیر پر احساس بے بسی محیط ہو گیا۔ اور اکبر اعظم نے ایک بے رحم راہزن کی طرح فرومایہ کشمیر کی متاع حیات لوٹ لی۔ میری تحروں سے برہم ہوں گے چونکہ اکبر اعظم نے کشمیر کی بہتری کے لئے سب اقدام کئے تھے۔ چونکہ وہ مخالفین کو حقیقت کے آئینہ میں نہیں بلکہ اپنی آرزو کے درپن میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ اکبر اعظم نے کشمیر میں استحکام پیدا کیا تھا اور کشمیر کی خوشحالی کے لئے سب اقدام کئے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یوسف شاہ چک نے ایک چھوٹی سی جاگیر کو بہار میں حاصل کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھا تھا اور اکبر اعظم کی فوج میں پانچ صد سواروں کا افسر بن کر وہ ایک وفادار سپاہی کی طرح بنگال اور بھی کی مہات میں شامل ہوا اور یوسف شاہ چک کا انتقال اوڑیسہ کی جنگ کے دوران ایک مہلک بیماری کی وجہ سے ہوا تھا اور یوسف شاہ چک کا جسد خاکی اوڑیسہ سے بہار لایا گیا اور پٹنہ کے پاس اس کا جسدِ خاکی سپرد خاک کیا گیا اور اسی طرح یعقوب چک نے اکبر کو جو خط تحریر کیا تھا اس میں خواہش ظاہر کی تھی کہ اکبر اعظم اپنا پاپوش روانہ کریں تا کہ وہ اس پاپوش کو اپنی کلاہ کی زینت بنا سکے اور چک نے اپنی دختر شاہی حرم میں شامل ہونے کے لئے پیش کی تھی۔ اس لئے میں اکبر اعظم کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا۔ تاریخ غیر جانبدار ہونی چاہیے۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ چک دور کے اور خاص طور پر یوسف شاہ چک کے زمانے کے عام حالات صرف غیر کشمیر فارسی تاریخ نویسوں نے قلم بند کئے ہیں اور کسی کشمیری نے ان کا کوئی تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا ہے اس لئے ہمیں صرف ''اکبر نامہ''، ''طبقات اکبری''، ''تزک جہانگیری''، ''مُلا بدایونی'' پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اگر کچھ اور لکھا گیا وہ ملک حیدر چاڈورنے جو نور جہاں کا منظور نظر تھا یا اعظم دیدہ مری نے

اپنی تاریخ میں لکھا ہے اور واقعات کشمیر جو محمد اعظم دیدہ مری نے تحریر کیا وہ سال 1774 میں مرتب ہوئے ۔ اللہ ملک حیدر چاڈور نے سال 1586 سے A.D1627 تک کے حالات تحریر کئے ہیں ۔ دراصل جب جہانگیر نے شیر افگن کو قتل کروایا تو ملک حیدر چاڈورہ بردوان میں موجود تھا اور اس نے مہرالنساء بیگم کو پناہ دی تھی اور پھر مہرالنساء ہندوستان ہی میں نور جہاں بن کر ہندوستان کی تقدیر بن گئی تھی ۔ نور جہاں ایک انتہائی خوبصورت اور انتہائی ذہین ایرانی لڑکی تھی اور جو حیدر ملک چاڈور پر انتہائی مہربان ہوئی اور جہانگیر کو ملک حیدر کو مصاحب بنانے کی ترغیب دی تھی ۔ نور جہاں شیعہ مسلک سے تعلق رکھتی تھی ۔ ملک حیدر چاڈورہ اہلِ شیعہ تھا ۔ مگر جہانگیر کے دور کے مغل سرداروں کو بھی نور جہاں کی شیعت پر اعتراض نہ تھا ۔ بلکہ بابر نے خود ایک زمانے میں ہندوستان آنے سے قبل کھلم کھلا شیعہ مسلک اختیار کیا تھا اسی طرح ہمایوں بھی شیعہ مسلک سے وابستہ رہا ہے ۔ اور شاہ ایران نے شاہوں کی طرح اس سے سلوک کیا اور اسی طرح اکبر اعظم کا سب سے وفادار اتالیق بیرم خان ایک کٹر شیعہ تھا اور اکبر ذہنی اور مذہبی طور بیرم خان سے متاثر ہوا تھا اور خود شیعہ اعتقادیت رکھتا تھا ۔ انہی حالات میں جہانگیر 1605 میں ہندوستان کے تحت پر متمکن ہوا اور 23 برست تک یعنی A.D1628 تک حکومت کی تھی اور اس کے دورِ حکومت میں امبا خان چک نے لداخیوں اور بلتوں کی امداد سے مرزا علی اکبر خان گورنر کشمیر سے بغاوت کی تھی لیکن مرزا علی اکبر نے بغاوت کچل دی تھی ۔ علی اکبر خان کے فوراً بعد اعتقاد خان کشمیر کا صوبیدار مقرر ہوا اور اس نے 1622 میں چک خاندان کی اہم شخصیات کا قتل عام کروا دیا تھا اور پھر بھی شورش ختم نہ ہوئی تھی ۔ لیکن یہ قتل عام کی کہانی ہمیں تاریخ اعظم دیدی مری میں ملتی ہے جو تقریباً پونے دو سو سال بعد تحریر کی گئی

اور تاریخ اعظم دیدمری میں کوئی بھی حوالہ جات موجود نہیں جن سے تقدیق واقعات کی جاسکے۔ یہ سب قیاس آرائیوں کا مجموعہ ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغل شہنشاہ کشمیر کا گورنر مقرر کرنے میں شیعہ سنی مسلک کا امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ مرزا یوسف خان شیعہ گورنر تھا اور اکبر اعظم جب پہلی بار 1589 میں کشمیر آیا تو وہ مرزا یوسف کے دولت کدہ پر جلوہ افروز ہوا تھا اسی طرح احمد بیگ جسے جہانگیر نے مقرر کیا تھا ایک انتہائی کٹر سُنی مسلمان تھا۔ لیکن 1617 میں جہانگیر نے اسے ملازمت سے برخواست کر دیا تھا چونکہ اس کی حکومت انتہائی ناقص تھی اور لوگ جوق در جوق مر رہے تھے اور یہ وبا قابو نہ ہو رہی تھی جب کشمیر کی جامع مسجد 1619 میں جل کر مکمل خاکستر ہو گئی تھی اور جب مرزا بیگ نے ملک حیدر چاڈور پر الزام لگایا تھا کہ اس نے شیعوں کی مدد سے جامع مسجد کو آگ لگائی ہے تو جہاں گیر نے ملک حیدر چاڈور کو جامع مسجد کی تعمیر نو کا حکم دیا اور یہ بھی فرمان جاری کیا کہ تعمیر کا سارا خرچ ملک حیدر چاڈور برداشت کرے گا۔ تزک جہانگیری کے مطابق اس ہولناک آگ سے مزار ملکان راکھ ہو گئے تھے مگر طاعون کی وبا ختم ہو گئی تھی۔ احمد بیگ نے اہلِ تشیعہ سے اچھا سلوک نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود ملک حیدر چاڈور نے جامع مسجد تعمیر کی اور جہانگیر کا خاص متمند تھا جہانگیر کے زمانے میں اس قدر خوشحالی پھیل چکی تھی کہ صرف ملک حیدر چاڈور نے رقم کثیر خرچ کر کے جامع مسجد کو انتہائی جہان زیب عمارت بنایا تھا اور یہ ساری داستان جامع مسجد کے محراب پر کندہ کی گئی ہے اور آج بھی یہ عبارت ایک تاریخی دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ جامع مسجد ایک اہلِ شیعہ نے تعمیر کی ہے اور شیعوں نے کشمیر میں ہمیشہ فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔

یہاں ضمناً اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ سلطان سکندر بت شکن کے دور

تک کشمیر میں کسی اہم مسجد کے موجود ہونے کا کوئی تذکرہ ہی موجود نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ کا کوئی انتساب نہیں ہوتا۔ یہ زمانہ کے نام بھی معنون نہیں ہوسکتی چونکہ زمانہ انحطاط کو قبول نہیں کرتا اور تاریخ واقعات کی کہانی ہوتی ہے۔ واقعات کا عکس نہیں ہوتا۔ اس لئے تاریخ پڑھنے سے ہمیں کبھی صحیح واقعات نہیں ملتے۔ کشمیری زبان اتنی افلاس زدہ تھی کہ اس کا اپنا کوئی رسم خط ہی نہ تھا۔ ملک حیدر چاڈور کے زمانے تک ایک بھی کشمیری زبان ہمیں تحریر کی ہوئی نہیں ملتی ہے۔ کلہانہ، جون راجہ اور سری ورہ نے سنسکرت اور پالی رسم الخط کا سہارا لے کر داستانیں تحریر کیں ہیں جنہیں کشیری نکتہ نگاہ کہا ہی نہیں جاسکتا اور پھر فارسی تاریخ نویسیوں نے صرف اس وقت کے بادشاہ جہاں، والی ماسوا، نائب المدنی، ارض الٰہی کی کرم فرمائیوں کو مد نظر رکھ کر واقعات کو حرف لطف کا آہنگ دے کر شہنشاہ اعظم کی خوشنودی کو مد نظر رکھا ہے۔ اس لئے ان کی تاریخ میں افلاس زدہ عوام، افسردہ جان دہقان، کرم خوردہ ضاعون اور کاریگروں اور اس وقت کے تاناشاہ افسروں، اُن کی زیادتیوں، دہقانوں پر جبر اور استحصال اُن کے کھیتوں سے فصل لوٹ لینے کے معرکے، مالیہ کی وصولی کے ناجائز حربوں اور خواتین کے ساتھ وحشیانہ سلوک اور بھی بہت سے انسانی حقوق کی پامالیوں کا کوئی سراغ ہی نہیں ملتا ہے۔ بقولِ فیض احمد جو میرے پسندیدہ شاعر ہیں:

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں ہے لہو کا سراغ
نہ دست و ناخن قاتل نہ آستین پہ نشان!

اور پھر کس دلچسپ انداز میں فیض نے کہا:

نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی علم پر رقم ہوا کہ مشتہر ہوتا

پکارتا رہا ہے بے آسرا یتیم لہو!
کسی کو بہر سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ
نہ مدعی نہ شہادت حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاکِ نشاں تھا رزقِ خاک ہوا!

اس لئے کشمیر کی کوئی Sub Altern تاریخ ہی موجود نہیں ہے اور تاریخ نویس شہنشاہ وقت کے نام التجا کرتے رہے ہیں:

اک سخن اور کہ پھر رنگ تکلم تیرا
حرف سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ!

لیکن واقعات جن سوالات کو جنم دیتے ہیں وہ کسی عنوان کے محتاج نہیں ہوتے۔ وہ جواب کے متقاضی ہوتے ہیں۔ وقت کی عدالت میں اُن کا کوئی دعویٰ منسوخ نہیں ہوتا وہ آج بھی قائم ہے۔اور اس دعویٰ کی رُو سے پہلا سوال جو ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر اکبر اعظم کشمیر کی شیعہ حکومت کو تاراج کرنا چاہتے تھے تو یہ کیا وجہ ہے کہ اکبر اعظم نے جو کشمیری فوج مرتب کروائی تھی اس میں زیادہ تعداد چک قبلہ کے لوگوں کی تھی؟ کشمیر کے اہل سنت فوج کی نوکری سے احتراز کرتے تھے اور قاری کو یاد ہوگا کہ کشمیر میں اراضی بندوبست کے بعد اکبر کے صوبیدار قاضی علی نے وادی کشمیر کو 41 پرگنہ میں تقسیم کیا تھا اور ہر پرگنہ کے لئے لوکل فوج تشکیل دی گئی تھی۔اس بات کا تذکرہ آئین اکبری میں موجود ہے۔1586 میں کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے بعد اکبر اعظم نے کشمیر پر اکیس برس تک حکومت کی تھی اور اکبر کی فوج میں اہلِ تشیعہ لوگوں کا غلبہ تھا۔اکبر اہلِ تشیعہ کے خلاف بالکل نہیں تھا اور یہ سلسلہ جہانگیر کے دور میں بھی قائم رہا۔ جہانگیر نے کشمیر پر تیس برس تک حکومت کی تھی اسے کشمیر کے

حالات تزک جہانگیری میں درج کیئے ہیں۔ میں صرف ایک اقتباس تزک جہانگیری سے نقل کروں گا جس سے میرے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اکبر نے جب پہلی بار مان سنگھ کو کشمیر فتح کرنے کے لئے روانہ کیا تو مغل فوج صرف 5000 افراد پر مشتمل تھی اور اس فوج کی قیادت شیخ یعقوب صرفی اور حیدر چک کر رہے تھے جو شیعہ فرقے کے حامی تھے۔ یہ سچ ہے کہ اعتقاد خان نے چکوں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے ان کے قتل عام سے احتراز نہیں کیا تھا لیکن جب جہانگیر وارِدِ کشمیر ہوا اس وت بھی کشمیری فوج میں چک قبیلے کے لوگوں کا غلبہ تھا۔ جو سب اہلِ تشیعہ تھے۔ جہانگیر کے تزک جہانگیر کا مندرجہ ذیل اقتباس دلچسپ ہے۔

اقتباس (تزک جہانگیری)

"کشمیر کے راجاؤں کے حالات راج ترنگنی میں درج ہیں جو میرے والد کے احکام سے سنسکرت سے فارسی زبان میں ترجمہ کی گئی ہے 1312 کشمیر میں اسلام کا نور روشن ہوا۔ تیس سلاطین نے اس پر 282 برس حکومت کی 1586 میں میرے والد نے کشمیر پر غلبہ حاصل کیا۔ تب سے آج پنتیس برس گزر چکے ہیں۔ سرینگر خاص شہر کا نام ہے اور جہلم دریا اس کے درمیان بہتا ہے...... اگر کشمیر کے قدرتی مناظر کی تعریف کی جائے تو کتب ہا تحریر کرنی پڑیں گی۔ کشمیر کے شال بہت مشہور ہیں...... یہاں کے تاجر، صناع اور کاری گر زیادہ تر اہلِ سنت جماعتوں سے تعلق رکھتے ہین لیکن سپاہی پیشہ لوگ خاص طور پر امامیہ اہل تشیعہ ہیں۔

اس اقتباس سے میں وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ جب جہانگیر نے کشمیر کا دورہ کیا تھا تو پنتیس برس گزر چکے تھے۔ مگر کشمیری فوج جو مغلوں نے ترتیب دی تھی اس میں سپاہی پیشہ لوگ اہلِ تشیعہ تھے اس لئے مغلوں پر شیعہ دشمنی کا الزام لگانا محض ایک

بہتان ہے۔ حالانکہ جہانگیر کے زمانے میں اہل تشیعہ چک قبیلے کے لوگوں نے کافی شورش برپا کی تھی۔ اعتقاد خان نے شورش پسندوں کے ساتھ انتہائی ظالمانہ رویہ اختیار کیا تھا اور شاہ جہاں نے اس جرم کی پاداش میں اعتقاد خان کو کشمیر کی صوبہ داری سے برطرف کر دیا تھا۔ چونکہ وہ اہلِ تشیعہ کی پاسداری چاہتا تھا۔

تاریخ کو سمجھنے کے لئے ایک دانستہ سعی مسلسل اور سعی جان گداز کی ضرورت ہے۔ کیونکہ تاریخ کی روشنی سے ہی آئندہ کی راہیں منور کی جاسکتی ہیں۔ مغلوں کے دور کو جاننے کیلئے ہمیں داخلی اور خارجی عوامل کا غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنا پڑے گا ورنہ ہم خود فریبی کے حقدار بنے کبھی بھی ذہنی آزادی حاصل نہیں کر سکتے ہیں بلکہ ہمیشہ ذہنی غلام رہیں گے۔

جہانگیر کے دور میں مغلوں نے کشتواڑ پر قبضہ کر لیا اور جموں کے راجہ سنگرام کو باج گزار بنا لیا اس طرح جہانگیر نے جموں و کشمیر ریاست کو ایک اکائی بنانے میں پہلا قدم اُٹھایا تھا۔ بلکہ کشتواڑ کا علاقہ مفتوح کرنے کے لئے جموں کے راجہ سنگرام نے مغلیہ سردار دلاور خان کی بھرپور امداد کی تھی اور وہ اپنے کو مغلوں کا ممنون سمجھتا تھا۔ 1628 میں شاہ جہان کشمیر پر ہی نہیں بلکہ سارے شمالی ہندوستان کے حکمران کے طور پر متمکن ہوا اور پورے تیس برس تک حکومت کی تھی اور پہلا کام تو شاہ جہاں نے کیا وہ اعتقاد خان کو اہلِ شیعہ پر ظلم رواں رکھنے کی پاداش میں کشمیر کے گورنر کے عہدے سے معزول کیا تھا۔ شاہ جہاں نے اعتقاد خان کے ظالمانہ بیگار کے قانون کو اسی طرح معطل کیا جیسا کہ اکبر اعظم نے کیا تھا اور شاہ جہاں نے حکم دے دیا کہ کشمیر میں امن اور اتفاق کی حکومت قائم کرنے کے لئے اس کے احکامات سنگِ سخت پر کندہ کر کے جامع مسجد کشمیر میں نصب کئے جائیں۔ جو آج بھی موجود ہیں اور اس فرمان میں کشمیر

کے مغل صوبیداروں کو عمل کرنے کی ترغیب دی تھی اور حکم دے دیا کہ بیگار بالکل ممنوع ہے اور اگر زعفران کا پودا حکومت کی اراضی پر کاشت ہو تو جو لوگ اس کی خوشہ چینی کریں انہیں پورا معاوضہ دیا جائے اور شالی پر تمام ٹیکس ہٹا دیئے تھے اور اسی طرح کشمیر کے کشتی بانوں سے بھی ٹیکس وصول میں کمی کرنے کو کہا اور کشمیر کے میوہ باغات سے مغلوں کو کوئی حصہ لینے پر بھی پابند عائد کر دی تھی۔ ان احکامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعتقاد خان جیسے وفادار گورنر کو بھی اگر اس کی زیادتیوں کا علم مغل شہنشاہ کو ہوا تو اُس کو معاف نہیں کیا گیا اور ہندوستان کے مغل شہنشاہ کشمیر کے اندرونی حالات میں دلچسپی لیتے تھے اور عوام کی بہبودی کے لئے ہمیشہ احکامات صادر کرتے تھے اور شاہجہاں کے زمانے میں بھی لداخ اور بلتستان پر بھی مغل حکومت کا پرچم لہرایا گیا اور جموں کشمیر اور لداخ مغل حکومت کے زیرِ اثر آچکے تھے۔ اس لئے یہ کہنا کہ راجہ گلاب سنگھ کے زمانے میں جموں و کشمیر اور لداخ گلگت ایک ریاست کے طور پر اُبھری ہے حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ شاہجہاں نے یہ اکائی قائم کی تھی اور بلتستان کے راجہ علی رائے نے اپنی دختر شہزادہ کے نکاح میں دی تھی۔ اس سے قبل اظفر خان کشمیر کے مغل گورنر نے اسکردو کو مفتوح کیا تھا اور شاہجہاں کا خطبہ کشمیر، بلتستان، اسکردو اور گلگت تک پڑھا جاتا تھا ان سب باتوں کا تذکرہ انگریزی مورخ ایلیٹ اور ڈاسن نے اپنی کتاب ہندوستان کی تاریخ میں کیا ہے۔ اس لئے ریاست جموں و کشمیر و گلگت کو ایک اکائی کی شکل دینے میں شاہجہاں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے انگریزوں نے جموں و کشمیر سے متعلق شاہجہاں کے حالات کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے گلاب سنگھ کو انگریزی فوج کی مدد سے گلگت فتح کرنے کی ترغیب دی تھی۔ شاہجہاں بلتستان اور اسکردو کے راجہ ابدال کو ظفر خان گرفتار کر کے سرینگر لایا تھا اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ 1635 میں

دوسرا شیعہ سُنی فساد مائسمہ کے شہتوت کے باغات کی ملکیت پر ہوا تھا اور شیعہ بہت قلیل تھے مگر اس فساد میں سُنی آبادی پر غالب ہوئے تھے اور جب اہلِ سنت مولویوں نے ظفر خان سے اہلِ تشیعہ کے خلاف تازیبی کاروائی کرنے کی التجا کی تھی تو ظفر خان نے اہلِ تشیعہ کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی تھی۔ ان پر نقشبندی خواجہ خواند محمد نے سُنی عوام کو بھڑکایا اور اہل تشیعہ کے گھروں کو آگ لگادی تھی۔ لیکن ظفر خان نے اس بات کا سخت نوٹس لیا تھا اور نقشبندی عالم خواجہ خواند محمد کو ملک بدر کرنے کے احکامات صادر کروائے تھے۔ حتیٰ کہ اس رویہ سے کشمیر کے اہلِ سنت مغلوں سے بدظن ہوئے تھے اور مغلوں کو اپنے لئے منحوس کہا کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود جب کشمیر میں 1641 میں قحط سالی نے ملک کو بُرباد کیا تو شاہجہاں نے مغل خزانے سے امداد بھیجی لاکھوں روپے عوام میں تقسیم کیئے اور شاہی خرچ پر دس لنگر قائم کیئے تھے۔ اور پوری وادی میں پانچ مقام منتخب کیئے تھے۔ جہاں لوگوں کو مفت کھانے پینے کی اشیاء تقسیم ہوتی تھیں۔ ان کا تذکرہ ''لاہوری بادشاہ نامہ'' میں بھی ملتا ہے اور اس قحط کے زمانے میں کشمیر سے 30,000 ہزار لوگ لاہور میں پناہ گزین ہوئے تھے۔ اس کے بعد A.D1658 میں تحت نشینی کی جنگوں کے بعد اورنگ زیب ہندوستان بطور شہنشاہ متمکن ہوا اور 1707 میں اس نے وفات پائی اور اس طرح اس نے کشمیر میں 49 سال تک حکومت کی ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں حکم صادر ہوا تھا کہ ہندو مسلمانوں اور ہندوؤں کے ساتھ انتہائی مناسب اور برابر کا سلوک روا رکھا جائے اور ذراسی غفلت شعاری پر کشمیر کا گورنر عہدہ سے برطرف کردیا جاتا تھا اور اپنے منصوبہ پر عمل کرتے ہوئے اورنگ زیب کے زمانے میں 12 بارہ مرتبہ گورنر تبدیل کردیئے گئے۔ اعتماد خان 1662-1659 تک، ابراہم خان 1664-1662 تک،

اسلام خان 65-1664 تک گورنر رہا اور اسی کے زمانے میں اورنگ زیب کشمیر میں بہت سخت بیمار ہونے کے بعد صحت یاب ہونے کے لئے آیا تھا اور اورنگ زیب نے ہی شہر سرینگر میں خواتین کو پھرن کے نیچے کرتا پاجامہ پہننے کی ہدایات جاری کی تھیں ورنہ پھرن کے نیچے کچھ نہ زیب تن کیا جاتا تھا۔ اورنگ زیب نے چرس اور افیون کی کاشت ممنون قرار دے دی اور پھر 1665 میں اورنگ زیب نے سیف خان کو کشمیر کا صوبیدار مقرر کیا تھا اور اورنگ زیب غنی کشمیر کی شاعری سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اُس نے سیف خان کو ہدایات کی تھی کہ وہ ملا طاہر غنی کو مغل دربار میں پیش کرے مگر غنی کشمیر رضا مند نہ ہوا اور خود کو دیوانہ ظاہر کر کے کچھ عرصہ بعد وفات پائی تھی۔ اور سیف خان نے ہی کشمیر میں دھوکہ دہی کی سزا موت قرار دی تھی اور خواجہ محمد صادق جو حکومت کا کارندہ تھا اور غبن کے الزام میں گرفتار ہوا تھا کو تعزیز کے طور پر عوام کے روبرو کوڑے لگائے گئے تھے اور سیف خان نے ہی لداخ کے گردونواح میں جسے 'مغربی تبت'' کہا جاتا تھا جامع مسجد تعمیر کروائی تھی۔ اور سیف خان کے زمانے مین ہی کشمیر میں بہت سے زلزلے آئے تھے اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ افتخار خان 1662-1675 کے زمانے میں کشمیر میں ایک آگ کی ہولناک واردات میں جامع مسجد خاکستر ہوئی تھی اور اورنگ زیب نے اس مسجد کو از سر نو جدید طرز پر تعمیر کروایا تھا۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اورنگ زیب کو ایک جنونی سُنی مسلمان کہا جاتا ہے مگر اُس نے 1675 میں قوام الدین خان جو ایک ایرانی شیعہ تھا کو کشمیر کا صوبیدار یا گورنر مقرر کیا تھا۔ اِس سے صاف عیاں ہے کہ اورنگ زیب ایرانی شیعوں پر نہ صرف مہربان تھا۔ بلکہ انہیں اہم عہدوں پر فائز کیا جاتا تھا۔ اور قوام الدین خان شیعہ ہونے کے باوجود کشمیر کی سنی آبادی کے لئے عین رحمت ثابت ہوا تھا۔ لیکن شیعہ سنی اختلاف

ختم نہ ہوئے اور ابراہم خان کے زمانے میں 1685 میں شہر سرینگر میں شیعہ سُنی فسادات برپا ہوا اور وجہ یہ تھی کہ گورنر کشمیر ابراھیم خان کے فرزند فدا خان نے حسن آباد محلّہ کے شیعوں کے حق میں آواز بلند کی تھی۔ لیکن مغل سلطنت کے سُنی عہدہ داروں نے اس قدر شورس برپا کی کہ گورنر ابراھیم خان نے ایک شخص عبدالشکور کو سُنی فرقے کے حوالے کیا تھا۔ جنہوں نے اسے قتل کردیا تھا۔ لیکن جب اورنگ زیب کو اطلاع ملی تو اس نے گورنر ابراہم خان کو اہلِ تشیعہ کے فسات کے منافی احکامات صادر کرنے کی پاداش میں برطرف کردیا تھا اور حافظ اللہ خان کو کشمیر کا صوبیدار مقرر کیا جس نے شہر سرینگر میں امن و امان قائم کیا تھا اور پھر جب مغل فضل خان کا دور آیا تو اس مغل صوبیدار نے کشمیری زبان بولنے والوں کو بلند و بالا منصب پر فائز کیا تھا اور اِسی کے دورِ حکومت میں پیغمبر اسلام کا موئے مقدس حضرت بل کی درگاہ میں محفوظ رکھا گیا تھا۔

یہ A.D1699 کا واقعہ ہے۔ اس لئے اورنگ زیب کو ایک جُنونی سُنی مسلمان یا شیعوں کا دشمن قرار دینا حقیقت کے برعکس ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے اکتیس سال بعد مغل حکومت برائے نام رہ گئی تھی۔ چونکہ ایرانی اور تورانی امراء اور ہندوستانی نژاد درباریوں کے اختلافات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ تورانی امراء نے نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر فوج کشی کی دعوت دی تھی اور مغل سلطنت پارہ پارہ ہو کر مشتہر ہو چکی۔ میں مغلوں کا ثناخوان نہیں ہوں لیکن مغلوں نے کشمیر ہی نہیں شمالی ہندوستان فتح کیا تھا مگر اُنہوں نے ہندوستانیوں کو زندہ رہنے کا فن سکھایا۔ ہندوستان کو ایک اکائی کے طور پر منتظم کیا ورنہ ہندوستان پارہ پارہ ہو کر منقسم تھا اور کئی راجہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر راج کرتے تھے اور کارل مارکس کی زبان میں حکومت کا مقصد صرف لوگوں کا استحصال کرنا تھا۔ گاؤں اور شہر میں راستے موجود نہ تھے ۔ ہر

گاؤں، ہر فرقہ دوسرے سے جدا تھا۔ زندگی ہر فرقہ اور ہر دیہات میں سکڑ کر محدود ہوگئی تھی۔ ہندوستانی تہذیب صرف اونچی ذات کے برہمنوں کے رہن سہن کا نام تھا اور عوام ادراکِ شعور زندگی سے بالکل محروم تھے ہر فرقہ ہر دیہات کا نظم ونسق الگ تھا۔ متاعِ عصمت فکر ونظر صرف برہمنوں کے میراث تھے۔ اور عوام کی زندگی کا مقصد ہی صرف حکومت کے کارندھوں کو خراج عطا کرنا تھا۔ عوام کا رہن سہن (savage) بہیمانہ تھا اور حقوق کا کسی کو احساس ہی نہ تھا۔ وقت کے تیور پہچاننا تو دور کی بات تھی اور اپنا دیہات اور اپنی جنم بھومی سے باہر کی دُنیا کا بہت کم لوگوں کو علم تھا اور محنت کش طبقہ ایڑیاں رگڑ کر، ظلم وجور کے حصار میں رہنا اپنی زندگی کا تقاضا سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں کوئی زندہ تہذیب نہ تھی۔ یہ ایک مردہ اور بے معنی تہذیب تھی جہاں فنِ دریوزہ گری ہر تلخی کا مداوا تھا۔ بلکہ ہندوستان میں حقیقی معنوں تہذیب مرچکی تھی کوئی کلچر اور تہذیب کسی بھی علاقہ میں قابلِ ستائش نہ تھی۔ ہندوستانی ایک دیہات کا رہنے والا دوسرے دیہات میں اجنبی تصور کیا جاتا تھا۔ عوام میں لباس پہننے تک کا سلیقہ نہ تھا۔ اخلاقی اقدار ایک موہوم خیال سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتے تھے اور صبح شام کرتے ہوئے عمر گزر جاتی تھی۔ کارل مارکس نے ہندوستان کی تہذیب اور تمدن پر جو اظہارِ خیال کیا ہے وہ تہمت نہیں بلکہ کافی حد تک حقیقت کا صحیح ادراک ہے اور اس نے ہندو حکومتوں کا صحیح نقشہ چند الفاظ میں کھینچا ہے۔

مغلوں نے ہندوستان کو رنگینی ایام کا درس سکھایا۔ کشمیر میں ہی نہیں دلی اور آگرہ، لاہور اور دیگر اہم مغل جگہوں پر جنت بدامن باغات بنائے۔ حسین صبح وشام کا تصور پیش کیا۔ گلہائے رنگارنگ کو رخسار یار کا رقیب بنا ڈالا۔ اور تاریک راتوں کو رِندی حافِظ وخیام عطا کی۔ رقص کی محفلیں سنائیں، شبستانوں میں مغنیون کی آواز نے جادو

جگایا اور ہندوستان کی جہانِ فکر میں ایک نیا انقلاب لایا تھا۔ میوہ اور پھلوں کے باغات لگائیے، سڑکیں تعمیر کیں، کشمیر میں ہی نہیں پورے ہندوستان میں بندوبست اراضی کا اہتمام کیا۔ ایک نظام قائم کیا۔ منصب داروں کو جوابدہ بنایا۔ احتساب کا نظام قائم کیا۔ انصاف کی عدالتیں قائم کیں۔ قاضی شہر مقرر کیئے۔ لوگوں کو صحیح معنوں میں ایک کلچر، ایک تہذیب ایک سوچ عطا کی ہے۔ فن تعمیر کے شاہکاران کی رعنائی خیال کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ مغلوں نے صرف دربار ہی نہیں محفل کے آداب قائم کیئے اور لباس زیب تن کرنے کی رسم کو مذاق انجم بناڈالا تھا اور ہندوستان کے نیم برہنہ قوم کو لباس پہننے کا شعور عطا کیا اور یہ سمجھایا کہ نیم برہنہ حسینائیں حریری لباس میں ملبوس بہاروں کو دوام بخش سکتی ہیں اور جگر سوختہ عشاق حسن کے نئے پیمانے قائم کر سکتے ہیں اور کاکل خمدار کی ٹھنڈی چھاؤں میں نیند نہیں خُمار آتا ہے جو زندگی کی افسردہ مزاجی کا مداوا ہے۔ ورنہ اس سے قبل ہندوستان کے ہندو صرف نیم برہنہ رہ کر زندگی گزارتے تھے۔ اس طرح مغلوں نے ہندوستان کو سوئی دھاگے کا استعمال اور لباس پہننے کا فن سکھا کر تہذیب کی نئی حکایات جمیل کو ساغر و مینا کی کھنک عطا کی تھی۔ اس لئے مغلوں نے صحیح معنوں میں ہندوستان کو ہندوستان بناڈالا اور ایک مُہذب ادراک و شعور زندگی عطا کیا۔ ورنہ ہندوستان کے دھوتی پوش ایک مری ہوئی تہذیب کے علمبردار ہوتے۔ مغلوں نے نہ صرف مدرسے قائم کیئے۔ یہاں کے لوگوں کو بھی حکومت کے اصول اور اپنی جنم بھومی سے محبت کرنا سکھایا تھا۔ عقل و دانش کی محفلیں قائم کیں اور ہندوستان کے طرزِ کہن کو یکسر بدل ڈالا۔ مغل تاجداروں نے جینے کا انداز سکھایا اور تجارت کے فروغ نے جو گرینڈ ٹرنک روڈ کی مرہونِ منت تھی ایک علاقے کو دوسرے علاقے کا شریک بناڈالا اور مغل سلطنت نے ہندوستان کو ایک ملک بناڈالا ہے۔ انگریزوں نے مغلوں کی

روشن کی ہوئی مشعل کی روشنی میں اپنے وارفتہ عزائم کی تکمیل برٹش انڈیا بنا کر مکمل کی تھی اور ہندوستان سے سرمایہ لوٹ کر انڈسٹریل انقلاب کے بعد انگلستان کو ایک عالمی طاقت بنا ڈالا تھا۔ اسکے برعکس مغلوں نے ہندوستان کے سرمایہ نہ تو فرغانہ لیا اور نہ ہی کابل۔ بلکہ ہندوستان کے سرمایۂ سے ہندوستان کے عظیم شہر تعمیر کئے اور ایک نئی شہری زندگی کا احساس قائم کیا۔ اُنہوں نے اسلام کو ہندوستان پر کبھی ٹھونسا نہیں۔ لیکن جب کچھ ادارے اخلاقی اقدار کے منافی، نازیاں آتش بدن کی خرید وفروخت کا مرکز بن گئے تھے تو انہیں مسمار کر دیا تھا۔ صرف اورنگ زیب پر تعصب کا الزام عائد ہے جو کہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے ورنہ بقولِ Stass laft wal poole اکبر عظم نے چھ سو مندر منہدم کروائے تھے اور اورنگ زیب نے کئی مندر اپنی مالی امداد کا مرکز بنائے تھے۔ لیکن اکبر اعظم بن بیٹھا اورنگ زیب ایک تعصبی بلائے جان کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

جنون کا نام خرد پڑھ گیا اور خرد کا جنون

جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے!

تاریخ دانوں نے اورنگ زیب کا ایک غلط تصور پیش کیا ہے۔

جہانگیر وہ پہلا تاجدار ہے جس نے وادی کشمیر کی کشن گنگا سے لے کر عیشمقام تک چپہ بہ چپہ پیمائش کروائی تھی۔ کشمیر کا حدود اربعہ قائم کیا تھا۔ جغرافیائی طول وعرض بلند مقرر کیا۔ یہاں کی وادی، پاتال چٹانوں، کوہ ساروں، جھرنوں سے واقفیت حاصل کی تھی اور ویری ناگ کے چشمے کے اردگرد ایک باغ جہاں تعمیر کروایا۔ مغل باغات سرینگر کی زینت بنے۔ شہر میں فنون تعمیر کے نئے معیار قائم کئے تھے۔ کشمیر میں فون اور صناعی کے نئے معیار مقرر کئے اور قالین، ایران طرز پر بنائے جانے لگے۔ جہانگیر

نے تزک جہانگیری میں درج کیا ہے کہ کشمیریوں کی غذا بھات یعنی ٹھنڈے اُبالے ہوئے چاول تھے جو وہ ایک روز پکاتے اور دوسرے روز کھاتے تھے اور ابالی ہوئی ترکاری میں مرچ ملا کر کھایا کرتے تھے اور جو امراء تھے وہ اس سبزی میں تھوڑا سا اخروٹ کا تیل ملا لیتے تھے۔ لیکن کھانہ پکانے کا رواج نہ تھا۔ مغلوں ے مغلی کھانا پکانے کی سوغات کشمیری کو عطا کی اور آشپازوں کی جماعت وجود میں آئی تھی۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ مغلوں نے کشمیر کو کلچر دیا۔ کشمیری زبان رسم الخط کی محتاج ہوگئی۔ مغلوں سے قبل کسی بھی کشمیری شاعر کی شاعری نثار کی نثر نگاری، دانشور کی کسی کتاب کا کوئی وجود ہی نہیں ملتا ہے۔ اورنگ زیب کے عہد تک فارسی زبان و ادب نے کشمیریوں کو ایک نئی سوچ دی تھی اور اورنگ زیب کے زمانے میں ملا طاہر غنی فارسی کلام کو کافی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ مُلا طاہر غنی سے قبل کوئی شاعری کا کشمیری لٹریچر ہی موجود نہیں ہے۔ اس لئے شیخ محمد عبداللہ کا یہ کہنا کہ مغل اور افغان سلاطین کشمیر میں صرف داد عیش لیتے تھے عوام کے جذبات بھڑکانے کے لئے ایک بہتان تھا۔ اورنگ زیب نے شہر سرینگر میں پھرن کے نیچے برہنہ رہنے کی ممانعت کر دی تھی اور پھرن کے نیچے کرتا پاجامہ زیب تن کرنے کے احکامات جاری کئے تھے۔ اس طرح کشمیر میں سوئی دھاگا اور کپڑا سینے کا فن وجود میں آیا۔ جہانگیر نے تزک جہانگیری میں خاص طور پر لکھا ہے کہ کشمیری لوگ پھرن کے نیچے بالکل برہنہ ہوتے تھے۔ جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا شہر سرینگر میں عمارتیں شہر کے درمیان وسط میں دریائے جہلم کے کنارے تعمیر کی گئی ہیں۔ مگر نہانے کا رواج نہیں تھا اور پانی ان لوگوں کے بدن کو چھوتا تک نہیں تھا۔ جہانگیر اپنی تزک جہانگیری میں رقمطراز ہے کہ ملا حیدر دوغلات نے کشمیر میں صناعی اور کاری گری کو فروغ دیا تھا اور ایران اور بخارا سے ایسے کاری

اور بعض شواہد سے [illegible] میں ایک دوسرے سے مختلف [illegible]
کیا تھا اور بعض شواہد [illegible] کشمیر آیا تھا کیے کشمیری لوگوں نے [illegible] کے [illegible]
[illegible]
سے اتفاق کے [illegible] خیالات سے [illegible]
ہماری تاریخ [illegible] اگر بعض شواہد [illegible] اسلام [illegible]
اور [illegible] ان کی [illegible] اور عوام نے ان کے خلاف [illegible] بغاوت کیوں [illegible]
کی تھی؟ [illegible] روایت سے [illegible] کیوں [illegible] تھی؟ کیا
سب لوگ مغل شاہوں کے [illegible] اور [illegible] رکھتے تھے؟ کیا [illegible] مغل شاہوں کی تقلید
کر کے ہم مسلمان ہوئے تھے؟ کیا مغل شاہ [illegible] ہمارے کشمیر آیا تھا؟ اس کا
ثبوت ہمارے پاس کیا ہے؟ ہماری تاریخ میں کوئی [illegible] واقعہ ایک عظیم انقلاب
کا اچانک باعث نہیں بن سکتا ہے۔ چونکہ ہماری تاریخ واقعات کے تسلسل کا نام ہے اور
تسلسل ایک ماحول کو تشکیل دیتا ہے اور وہ نیا ماحول ایک نئی تبدیلی کو ابھرنے
[illegible] تیار ہوتا ہے۔ کلہانہ نے جن ملیچھ لوگوں کی موجودگی کا تذکرہ کیا وہ کون لوگ
تھے؟ وہ آٹھویں صدی میں کب اور کہاں سے آئے تھے۔ یہ لوگ عربی، تاتاری یا ترک
اور کون سی زبان بولتے تھے۔ ان کی تعداد کیا تھی؟ ان کے قبیلے کے سردار کون تھے
کیا یہ لوگ تاجر تھے اور اگر تاجر تھے تو کون سی تجارت کرتے تھے اور اگر یہ لوگ [illegible]
تصور کیے جاتے تھے تو عوام ان سے قریب کیسے آ سکتے تھے؟ اور ہم کن تاریخی بنیادوں
پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ آٹھویں صدی سے لے کر گیارویں صدی تک ان ملیچھ لوگوں
کی آبادی میں اضافہ ہوا تھا۔ ہم کن بنیادوں پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کلہانہ نے راجہ
دتیا (A.D 770-763) زمانے میں جن ملیچھ لوگوں کا تذکرہ کیا ہے وہ [illegible]

مسلمان تھے اور اگر وہ مسلمان تھے تو ان پر ہندو مذہب کے [illegible]

[illegible] کے پیچھے کا مقصد صرف [illegible] سے قریب تھا

[illegible] کے ایک [illegible] کشمیر کی [illegible] سے ایک [illegible]

[illegible] سے [illegible] تک کشمیر میں [illegible] تھے۔ [illegible]

[illegible] لوگ [illegible] سوال پیدا کرتے تھے

[illegible] راج ترنگنی ان [illegible] ان کے [illegible] ان کے

ہونے کے متعلق خاموش ہے۔ یہ لوگ [illegible] سے آئے تھے اور اس لیے عرب تھے

کوئی ثبوت ہی موجود نہیں ہے۔ [illegible] سے آئے تھے ایک [illegible] ہے۔ افغانستان

[illegible] ایک [illegible] حقیقت ہے اور اسی طرح ایک

تو اسی صرف سے بغیر کسی ثبوت اور حوالہ جات کے یہاں تک اپنے تخیل کی اڑان

بھری اور کہہ دیا کہ A.D.895 میں منصور بن ملاح عرب سے کشمیر صرف یہاں کے

دانشوروں سے ہم کلام ہونے کے لیے آیا تھا۔ مگر اس کا کوئی ثبوت نہ تو راج ترنگنی میں

ملتا ہے اور نہ ہی کوئی مستند تاریخ [illegible] کب اس دور کی [illegible] ہے۔ اس

طرح یہ کہنا کہ یہی پہچے مسلمان کشمیر کے ہندو راجاؤں کی فوج میں اونچے عہدوں پر

تھے صرف تصوراتی شبیہ و پرواز ہے اور سب تصورات کلہانہ کے پراگندہ افکار کے

[illegible] ہیں۔ کلہانہ ایک "کوی" تھا جو شاعرانہ تخیل کا مالک تھا۔ اس کا [illegible]

اسباب و تحلیل سے گریز کرتی ہے۔ اس کے رموز و کنایہ اشارات اور علامتی پیرایہ

کی عکاسی کرتی ہیں۔ خود کلہانہ کی راج ترنگنی کسی بھی تاریخ کے حوالے سے معرا ہے۔ [illegible]

ایک ناقص کتاب ہے جس کی کوئی (Chronology) ہی موجود نہیں ہے۔

اس لیے جدید تحقیق اور تاریخی ماخذ کی کھوج کرنا ایک ضرورت ہے بلکہ [illegible]

اور رینچن شاہ نے آپس میں کس زبان میں ایک دوسرے سے گفت وشنید کا سلسلہ قائم کیا تھا اور رینچن شاہ کو جو غیر کشمیری تھا کیسے کشمیری لوگوں نے یا اس وقت کے امراء اور وزراء اور فوج کے سربراہان نے برسر اقتدار آنے دیا تھا؟ یہ واقعات کہاں اور کن ماخذ سے اخذ کئے جاسکتے ہیں؟ صرف چند فرضی خیالات سے جذباتی وابستگی قائم کر کے تاریخ مرتب نہیں کی جاسکتی ہے۔ اگر رینچن شاہ مشرف بہ اسلام ہوا بھی تو اس کے ہندو اور بدھ درباریوں، اس کی فوج اور عوام نے اس کے خلاف علمِ بغاوت کیوں بلند نہیں کی تھی؟ روایت سے بغاوت کے جرم میں اس پہ تعزیر کیوں نہ قائم ہوئی تھی؟ کیا وہ سب لوگ بلبل شاہ کے وعظ اور پند سنتے اور سمجھتے تھے؟ کیا وہ بھی بلبل شاہ کی تعلیمات کے زیر اثر مسلمان ہوئے تھے؟ کیا بلبل شاہ واقعی بخارا سے کشمیر آیا تھا؟ اس کا تاریخی ثبوت ہمارے پاس کونسا ہے؟ تاریخ طور پر کوئی معمولی واقعہ ایک عظیم انقلاب کا اچانک باعث نہیں بن سکتا ہے۔ چونکہ تاریخ واقعات کے تسلسل کا نام ہے اور یہ تسلسل ایک ماحول کو تشکیل دیتا ہے اور وہ نیا ماحول ایک نئی تبدیلی کو اُبھرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ کلہانہ نے جن ملیچھ لوگوں کی موجودگی کا تذکرہ کیا وہ کون لوگ تھے؟ وہ آٹھویں صدی میں کب اور کہاں سے آئے تھے۔ یہ لوگ عربی، فارسی یا ترکی یا اور کون سی زبان بولتے تھے۔ ان کی تعداد کیا تھی؟ ان کے قبیلے کے سردار کون تھے؟ کیا یہ لوگ تاجر تھے اور اگر تاجر تھے تو کون سی تجارت کرتے تھے اور اگر یہ لوگ ملیچھ تصور کئے جاتے تھے تو عوام ان سے قریب کیسے آسکتے تھے؟ اور ہم کن تاریخی بنیادوں پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ آٹھویں صدی سے لے کر گیارویں صدی تک ان ملیچھ لوگوں کی آبادی میں اضافہ ہوا تھا۔ ہم کن بنیادوں پر یہ دعوی کرتے ہیں کہ کلہانہ نے راجہ وجر دتیا (A.D 770-763) زمانے میں جن ملیچھ لوگوں کا تذکرہ کیا ہے وہ واقعی

مسلمان تھے؟ اور اگر وہ مسلمان تھے تو ان پر راجہ وجر دتیا کیسے اعتماد کر سکتا تھا؟ اور ہم کن بینادوں پر کہتے ہیں کہ کلہانہ کے ملیچھ کا مقصد صرف مسلمانوں سے منسوب تھا؟ کلہانہ کے ایک دو اشعار پر کشمیری دانشوروں نے ایک پوری تاریخ تعمیر کی ہے کہ مسلمان آٹھویں صدی سے گیارویں صدی تک کشمیر میں آباد ہو چکے تھے۔ آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا یہ ملیچھ لوگ عربی، ترکی، فارسی یا پشتو زبان میں بول چال کرتے تھے ؟خود کلہانہ کی راج ترنگنی ان کی زبان، ان کے اتہاس، ان کے رہن سہن، ان کے عقائد کے متعلق خاموش ہے۔ یہ لوگ سندھ سے آئے تھے اور اس لئے عرب تھے؟ کوئی ثبوت ہی موجود نہیں ہے۔ سمرقند و بخارا سے آئے تھے ایک معمہ ہے۔ افغانستان کے پشتو تھے، قیاس آرائی کی حدود سے باہر ایک فرضی حقیقت ہے اور سی طرح ایک فرانسیسی مصنف نے بغیر کسی ثبوت اور حوالہ جات کے یہاں تک اپنے تخیل کی آڑان بھری اور کہہ دیا کہ A.D895 میں منصور بن ملاج عرب سے کشمیر صرف یہاں کے دانشوروں سے ہم کلام ہونے کے لئے آیا تھا۔ مگر اس کا کوئی ثبوت نہ تو راج ترنگنی میں ملتا ہے اور نہ ہی کوئی مستند تاریخی کتب اس دور کی ہمیں اس کا پتہ دیتی ہے۔ اس طرح یہ کہنا کہ یہی ملیچھ مسلمان کشمیر کے ہندو راجوں کی فوج میں اونچے عہدوں پر فائز تھے صرف تصور کی شعبدہ بازی ہے اور سب تصورات کلہانہ کے پراگندہ افکار کے رہن منت ہیں۔ کلہانہ ایک ''کوی'' تھا جو شاعرانہ تخیل کا مالک تھا۔ اس کی ''سرگزشت، اسباب وتحلیل سے گریز کرتی ہے۔ اس کے رمز و کنایہ اشاریت اور علامتی پرچھائیوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ خود کلہانہ کی راج ترنگنی کسی بھی تاریخ کے حوالے سے معرا ہے۔ اور ایک ناقص کتاب ہے جس کی کوئی (Chronology) ہی موجود نہیں ہے۔

اس لئے جدید تحقیق اور تاریخی ماخذ کی کھوج کرنا ایک ضرورت ہے بلکہ نا

گزیر ضرورت اور ہمیں اُس دور کے عقائداور روایت کو گہرائی اور گہرائی سے تلاش کرنا ہوگا۔سچ مچ کشمیر کے دانشوروں کے لئے یہ بہت بڑا چیلنج ہے۔بقولِ

''جانے کس منزل دشوار پہ لائی ہے حیات''

اور مغلوں کو کشمیر کی بدنصیبی کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے وہ اس لئے کہ کشمیر کی تاریخ پر کبھی تحقیق نہیں ہوئی ہے۔

میں نے جدید تحقیق پر اس لئے زور دیا ہے کہ تاریخ کو مسخ کیا جاتا رہا ہے ۔اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل سلطنت 46 سال میں پارہ پارہ ہوگئی ۔مغل سلطنت کے زوال کے تاریخی اسباب کیا تھے؟ ہندوستان میں مغل سلطنت A.D 1857 تک برائے نام قائم رہی ۔مگر کشمیر میں A.D1753 میں اختتام پذیر ہوئی تھی ۔اسکے اسباب کیا تھے ہم کشمیری تو صرف کہہ سکتے ہیں :

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رُو کے ساتھ<br>
پہنچانتا نہیں ہوں ، ابھی راہبر کون ہیں<br>
پھر بے خودی میں بھول گیا راہ کوئے یار<br>
جاتا وگر نہ ایک دن اپنی خبر کو میں !

غالب کی زبان میں ہم کشمیریوں کو اپنے وجود کو تلاش کرنا ہے۔ یہ صرف تاریخ کو تلاش کرنے کی سعی نہیں۔ بلکہ چشمِ دِل کی خونیابی کا تقاضا ہے کہ ہم حکایات جمیل کے دائروں سے نکل کر اپنی حقیقت کو حقیقت کی نظر سے پرکھیں ۔آنے والی نسلیں اس فرض کو انجام دیں گی میرا محکم یقین ہے اور کشمیر کی پوری تاریخ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

اس لئے میں نے چند حروف اس پس منظر میں مغل سلطنت کے زوال سے

متعلق کہوں گا۔ مغل سلطنت کا زوال ایک اتفاقیہ حادثہ نہیں تھا۔ مغل شان وشکوہ کے افگار میں کئی عوام شامل ہوئے تھے۔ مغل اقتدار اپنے عروج پر تھا۔ اس زمانے میں مغل حکومت کو ناقابلِ تسخیر تصور کیا جاتا تھا۔ مغل تاجداروں کا ہندوستان کے ہندو امراء میں حکومت کی روایات قائم ہونے کے بعد انضمام کا ایک عمل بھی شروع ہوا تھا اور مغل حکومت نے ہندوستان کو اندرونی انفراغ عطا کیا۔ جس سے ہندوستانی معیشیت نے فروغ پایا اور ہندوستانی امراء کا ایک متمول طبقہ وجود میں آیا تھا۔ تجار کا ایک مڈل کلاس قائم ہو گیا تھا۔ مغل فوج زیادہ تر ہندوستانی خاص طور پر شمالی ہندوستان کے دہقان طبقے کی آمیزش سے وجود میں آئی تھی اور ہندوستان میں ہندوستانی قومیت سکھ مذہب اور مراٹھا ہندتوا (Hinduta) کے وجود سے بھڑک اُٹھنا شروع ہوئی تھی۔ اورنگ زیب نے لوگوں کی توجہ جنوبی ہندوستان کی تسخیر کی طرف موڑ دیا تھا۔ مگر افغانستان کے اندر جو ہلچل وہاں کے اندرونی حالات کی وجہ سے معروضِ وجود میں آئی تھی وہ اورنگ زیب کی دسترس سے ماوراتھی۔ افغانستان کا مغل اثر ورسوخ سے دور ہونا نئی تحریک کو وجود دے چکا تھا اور افغان قومیت ایک آزاد افغانستان کی تکمیل میں مصروف تھی۔ اور ہندوستان میں مغل دربار غبن کینہ پروری اور رشوت ستانی کا اڈہ بن چکا تھا۔ حقیقت میں افغانستان میں نادر شاہ کا نئی افغان قومیت کا علم بردار بننا اور ہندوستان میں مغل دربار میں ہندوستانی امراء، ایرانی اور تورانی امراء کی آپس کی رقابت کا عروج پر پہنچنا جب کہ خاص طور پر ہندوستانی نژاد کے امراء، اب ایرانی اور تورانی امراء سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے اور تورانی امراء کی تعداد کافی گھٹ چکی تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد تخت نشین جنگوں نے ہندوستانی، ایرانی اور تورانی امراء کی رقابتوں کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ ایرانی اب تورانیوں کو برداشت نہیں کرنا چاہتے

تھے۔ افواج کی وفاداری، افراط زر کی کرشمہ سازیوں کی مرہونِ منت ہوچکی تھی۔
افغانستان میں نادر شاہ ایک نئی طاقت بن کر اُبھر چکا تھا۔ وہ ایرانی نژاد افغان تھا اور
ہندوستان میں اب تورانی امراء مغل دربار میں ہندوستانی اور ایرانی امراء کے اثر و
رسوخ سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے 1727 میں یعنی اورنگ زیب کی
وفات کے بیس سال بعد ہی آصف جاہ نے دکن میں اپنی آزاد ریاست قائم کرلی تھی،
اور اسی سال سعادت خان نے نواب اودھ ہونے کا اعلان کردیا تھا اور صرف
13 سال بعد A.D1740 میں علی وردی خان نے نواب بنگال کے نام سے حکومت
شروع کردی اور مغل دربار کے اہم رکن زوالفقار علی خان نے بہادر شاہ مغل تاجدار کو
مشورہ دیا کہ مراٹھا سردار ساہو کو مغل جیل سے رہائی دے کر ستارا کا راجہ بنا ڈالا جائے
اور ساہو مراٹھا نے دکن کے نواب حسین علی خان کے ساتھ سازش کر کے فرخ سیر کے
زمانے میں دلی پر چڑھائی کرلی اور فرخ سیر کو قیدی بنا ڈالا۔ اتنا ہی نہیں اسے اندھا کیا
گیا اور پھر قتل کر ڈالا تھا۔ اس کے وارث محمد شاہ کو مغل سلطنت اس شرط پر حوالے کی کہ
وہ ساہو مراٹھا کو آزاد راجہ تسلیم کرے۔ اس کے بعد مراٹھا قومیت بالاجی پیشوا کے فرزند
اور پیشوا کی ریشہ دوانیوں سے آگے ترقی پذیر ہونا شروع ہوئی اور مراٹھوں نے وسط
ہندوستان سے مغل راج کے خاتمے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس وقت مغل دربار کے ایرانی
امراء اب تورانیوں سے تنگ آچکے تھے۔ ہندوستانی امراء تورانیوں کی سازش میں
شریک تھے اس لئے آب نئی نئی ریاستیں 1737 تک وجود میں آچکی تھیں۔ ایرانی
امراء کی ترغیب پر نادر شاہ افغانی کے ہندوستان پر حملہ کرنے کی ٹھان لی۔ نادر شاہ ایک
آندھی کی طرح اُٹھا اور ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ کرنال کے مقام پر مغل فوج سے نبرد
آزما ہوا اور مغل افواج کے پرخچے اڑا دیئے۔ اور دلی پر قابض ہوا۔ معمولی سے

جھگڑے پر اس کی فوج برہم ہوئی اور دلی والوں کو سبق سکھانے کے لئے قتل عام کا حکم صادر ہوا اور یہ قتل عام نو گھنٹے جاری رہا۔ دلی کے گلی کوچے انسانی لاشوں کے ڈھیروں کی لاشوں سے لد گئے۔ دلی سہم گئی اور دلی کو لوٹنے کے بعد نادر شاہ واپس افغانستان آیا اور افغانستان ایک آزاد ملک بن گیا تھا۔ نادر شاہ کے حملے نے ثابت کر دیا کہ مغلوں کی ہندوستانی فوج مٹی کا ایک ڈھیر ہے۔ اور مغل ناقبلِ تسخیر نہیں بلکہ نام کے شاہ قالین ہیں۔ اسی دوران مغلوں کی خستہ حالی دیکھ کر باجی راؤ کا فرزند مراٹھوں کا پیشوا بن چکا تھا اور پیشوا مراٹھا حکومت کے علمبردار بن بیٹھے تھے۔ گجرات، مالوہ، بندھیل کھنڈ پر اور کئی علاقوں پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا 1747 میں نادر شاہ کا انتقال ہو گیا اور احمد شاہ ابدالی اب افغان تاجدار بن چکا تھا۔ احمد شاہ ابدلی نے 1752 پہلا کام جو کیا وہ پنجاب پر فوج کشی کی تھی اور مغل گورنر محسین الملک کو شکستِ فاش دے دی تھی۔ اسی سال میر مقیم کنٹھ نے جو کشمیر کے اس وقت کے حکمران یعنی مغل گورنر سے تنگ آچکا تھا نے احمد شاہ ابدالی کو کشمیر پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی۔ احمد شاہ ابدالی نے اپنے کمانڈر عبداللہ خان اشک زی کو کشمیر پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کیا اور احمد شاہ ابدالی کی فوج نے شوپیان کے مقام پر ابوالقاسم کی کشمیری فوج کو شکست دے کر ابوالقاسم کو گرفتار کر کے کابل روانہ کیا اور 1753 میں کشمیر افغان حکومت کا حصہ بن چکا تھا۔

☆☆☆

# باب سوم

# کشمیر افغان دور میں

افغان دور کو سمجھنے کے لئے افغانستان کے حالات کو سمجھنا انتہائی اہم ہے۔ کشمیری پنڈت مورخین، فارسیٹر، ہوگل لارنس، خود مُلا حسن نے پٹھان دور کو کشمیر کی طویل استبداد سے تشبیہ دی ہے اور پٹھان حکومت کو ظلم، جبر، استبداد قیامت، بربریت، بہیمانہ مظالم کا زمانہ تصور کیا ہے۔ جہاں فانی بدایونی کی زبان میں کشمیریت کا یہ حال تھا:

ہڈیاں ہیں کئی لپیٹی ہوئی زنجیر میں
لئے جاتے ہیں جنازہ تیرے دیوانے کا

یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ کشمیر کی ویرانی نے افغان حاکموں کے شبستانوں کو گل رنگ شبستان بنا دیا تھا اور وہ کشمیر میں داد عیش لیتے رہے۔ اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ افغان کشمیر میں صرف جستجوئے نشاط پیہم حاصل کرنے کے لئے آئے تھے اور لوگوں کی زبوں حالی اور اپنے ذاتی عیش کو برہم ہونے نہیں دیتے تھے۔ زنا بالجبر اُن کا شیوہ تھا یہاں تک کہ کشمیری پنڈت اپنی حسیناؤں کے سر کے بال منڈوا دیتے تھے چونکہ افغانوں کی آمد زیست کو مژدہ کہ مرجائے اسمان ہوگیا اور جب زلفیں ہی نہ رہیں کون کہے گا:

اور ہی بل ہے تیری زلفوں میں آج

جن ہوش رُبا میں کون گرفتار ہوگا؟

اس طرح افغانوں کی رُسوا نگاہوں کو کشمیر کی تاریخ بنا ڈالا ہے۔ میں نے افغان کی اس شبیہ کو زیر نظر رکھتے ہوئے کشمیری نفسیات کا ایک سرسری جائزہ اپنی انگریزی کتاب Reflxecion on Kashmiri Polities جو دوسری بار Understanding Kashmiri اور تیسری بار Contemporary Pakistan and Kashmir Polities کے عنوان سے شائع ہوئی میں کیا ہے۔ لیکن کیا افغان دور حکومت کی یہ تصویر حقیقت سے کوئی مطابقت رکھتی ہے؟ احمد شاہ ابدالی کے لئے کشمیر صرف ثانوی اہمیت کا حامل تھا۔ وہ افغان قومیت کا سب سے نمایاں علم بردار تھا مغل سلطنت کی نادر شاہ افغانی کے ہاتھوں تباہی کا احوال کسے معلوم تھا۔ شمالی ہندوستان میں مراٹھا طاقت اب تمام مسلمانوں کے شاہوں اور نوابوں سے خراج اور چوتھ وصول کر رہی تھی۔ بیجا پور اور رنگ آباد پر مراٹھا قابض ہو چکے تھے اور نواب اودھ 1751 میں ہولکر اور سندھیا کی مدد کا طلب گار تھا تاکہ بنگش افغان اس کی حکومت کا تختہ نہ الٹ دیں۔ حیدر آباد کا حاکم نظام مرہٹوں کا نام سُن کر کانپ اُٹھتا تھا۔ اب مرہٹہ حکومت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ بھونسلے خاندان کھولا پور، تجور اور ناگپور پر حکمران تھا۔ گجرات مالوہ اور مندھیل کھنڈان کے اثر ورسوخ میں آچکا تھا اور اب مرہٹہ بنگال کو تہراج کر رہے تھے۔ بنگالی مرہٹوں کے سایۂ سے خوفزدہ تھے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے اولاً احمد شاہ ابدالی نے تیسری بار 1752 میں محمود غزنوی کی روائت کو قائم رکھتے ہوئے پنجاب پر فوج کشی کی تھی اور پھر احمد شاہ ابدالی نے میر مقیم

کنٹھ اور خواجہ زہیر الدین دیدی مری کی دعوت اور التجا پر کشمیر میں مغل صوبیدار ابو القاسم سے کشمیر چھین لیا اور عبداللہ خان اشک زی نے ابو القاسم مغل کو نہ صرف 1753 میں شوپیان کے مقام پر شکست دی تھی بلکہ ایک قیدی بنا کر اسے کابل کے زندان میں محبوس کر دیا تھا۔ لیکن احمد شاہ ابدالی کو کشمیر کے حالات پر توجہ دینے کی فرصت ہی نہ ملی تھی اس نے 1753 کے بعد لاہور پر قبضہ کر لیا اور اپنے فرزند تیمور شاہ کو پنجاب کا گورنر مقرر کر دیا۔ لیکن چند ہی عرصہ بعد مرہٹہ سردار یہ دیکھ کر احمد شاہ کے فرزندہ تیمور شاہ کی فوج لا انتہائی قلیل ہے مرہٹہ سردار رگھوناتھ راؤ جو پیشوا کا سگا بھائی تھا۔ سندھیا اور ہولکر کی افواج کے ساتھ مل کر لاہور کا محاصرہ کرنا چاہا۔ تیمور شاہ اُن کے نرغے سے نکل کر واپس افغانستان چلا گیا اور احمد شاہ ابدالی کو مرہٹوں کے ہندوستان پر غلبہ حاصل کرنے سے آگاہ کیا تھا۔ 1760 میں مرہٹوں نے نظام حیدر آباد کو شکست سے فاش کر دے کر اسے اپنا محتاج بنایا تھا اب حیدر آباد سے پنجاب تک ہندوستان مرہٹوں کے زیر اثر آ چکا تھا۔ اس مرہٹہ طاقت کو ختم کرنے کے لئے احمد شاہ ابدالی ایک جرار افغان فوج لے کر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ مرہٹہ سردار داتا جی سندھیا کو شکست فاش دے کر قتل کر ڈالا پھر اُس نے یہی حشر طاقتور مرہٹہ سردار ہولکر کا کر ڈالا ۔ یہ سُن کر بالاجی راو نے ایک کثیر فوج تیر کی اور یہ فوج بھاو جی کی سربراہی میں آگے بڑھی اور پیشوا کا اپنا فرزند وشوراؤ اس فوج کی رہنمائی کر رہا تھا۔ مسلمان سردار ابراھیم خان گاردی توپ خانہ کا منتظم بنا دیا گیا تھا۔ یہ وہی ہولکر جو جان بچا کر پنجاب سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا اپنے ہم مذہبوں سمیت اس فوج میں شامل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مرہٹہ سردار جانکی سندھیا اور کئی یک واڑ کی فوج بھی اس عظیم فوج میں شامل ہو گئی تھی اور یہ عظیم فوج مارچ 1760 میں دکن سے روانہ ہوئی اور پھر بھرت پور کے

مقام پر جاٹ فوج بھی اس میں شامل ہوگئی۔ سورج مل جاٹ احمد شاہ ابدالی کا خاتمہ چاہتا تھا۔ یہ فوج دہلی میں زبردستی داخل ہوگئی اور باوا صاحب مرہٹہ سردار نے اعلان کیا کہ پیشوا کے فرزند کو یعنی وشوراؤ کو مغل تخت احمد شاہ ابدالی کے خاتمے کے بعد حوالے کیا جائے گا اور مغل قبروں تک کو مسمار کیا گا اور مغل شہزادوں کے محلات کو لوٹ لیا گیا یہ بارشوں کا موسم تھا۔ احمد شاہ ابدالی دلی میں مرہٹہ افواج کی آمد کا سُن کر دہلی کی طرف روانہ ہوا اور پانی پت کے میدان پر ڈیرہ ڈالا۔ 19 اکتوبر 1760 کو مرہٹوں نے پہلی افغان چوکی پر حملہ کر دیا اور جو چند افغان ہراول دستے کے طور پر وہاں تھے۔ انہیں قتل کر ڈالا۔ پھر بہاو صاحب نے پانی پت میں اپنی فوجوں کو قیام کا حکم دے دیا اور ابراہیم گاروی نے اپنی چالیس عدد توپ ایک اونچے مقام پر نصف کر دیں تھیں لیکن پہلا کام جو احمد شاہ ابدالی نے کیا اس نے مرُہٹہ فوج کے رسد لانے کے راستے روک دیئے تھے اور اس طرح اب مرہٹوں نے جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور 14 جنوری کو یہ جنگ شروع ہوئی اور پھر واقعی خون ریز لڑائی شروع ہوئی۔ وشواراؤ تیر و تفنگ کے حملے میں مارا گیا، اور پھر افغانوں کا دوسرا حملہ اتنا شدید تھا کہ مرہٹوں نے پیٹھ دکھا دی اور میدان چھوڑ کر بھاگنا شروع کیا۔ لیکن افغانوں نے اُن کا تعاقب کیا اور اس عظیم فوج کا قتل عام شروع ہوا اور دوسرے روز پانی پت کا علاقہ افغانوں کے قبضے میں آیا۔ باوا صاحب مرہٹہ میدان جنگ میں مارا گیا۔ ابراہیم گاری اور سندھیا گرفتار کر لئے گئے اور قتل کر دیئے گئے اور کئی لاکھ مرہٹہ فوج تباہ اور برباد کر دی گئی۔ پیشوا نے جب یہ خبر سُنی تو وہ پونا بھاگ گیا تھا۔ اس طرح ہندوستان میں مرہٹہ طاقت کا عبرتناک خاتمہ ہوگیا تھا صرف مہادیو جی سندھیا، ملیاراؤ ہولکر، اور نانا فرنویس میدان جنگ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی کو کشمیر پر توجہ دینے کی فرصت ہی

نہ زمانے نے دی تھی۔ کشمیر پر کل افغان حکومت 66 برس قائم رہی۔ ان 66 برسوں میں افغانستان میں پانچ حکومتیں وجود میں آئی تھیں ۔ احمد شاہ ابدالی نے 1753 سے 1772 تک، تیمور شاہ نے 1772 سے 1793 تک، زمان شاہ نے 1800-1793 تک اور شاہ شجاع اور محمود شاہ نے 1801 سے لے کر 1819 تک کشمیر پر برائے نام حکومت کی تھی۔ چونکہ افغانستان کے حالات ایسی خانہ جنگی میں تبدیل ہو چکے تھے کہ وہاں کے حکمرانوں کو کشمیر پر توجہ دینے کی فرصت ہی نہ ملی ۔اور جو گورنر مقرر ہو کر کشمیر آتے تھے وہ تقریباً کابل کی حکومت سے بے نیاز ہو کر کشمیر پر حکمرانی کرتے تھے اس لئے راجہ سکھ جیون مل نے 1753 میں خود کو گورنر ظاہر کر کے A.D1762 تک کشمیر پر حکومت کی تھی۔ سکھ جیون مل ذات سے کھتری نژاد تھا اور کہتے ہیں کہ جب افغانوں نے واپس کشمیر لینا چاہا تو سکھ جیون مل نے انہیں پونچھ کے مقام پر بھی دیا تھا۔ اس لئے احمد شاہ ابدالی نے نور الدین خان بام زای کو کشمیر روانہ کیا جس نے توشہ میدان کے پاس سکھ جیون مل کو شکست فاش دے کر گرفتار کر کے احمد شاہ ابدالی کے دربار میں ایک قیدی کے طور پر حاضر کیا تھا اور پھر اسے ہاتھیوں کے قدموں تلے روند ڈالا گیا تھا۔ دراصل سکھ جیون مل شاہ ولی خان جو احمد شاہ ابدالی کا ایک سردار تھا کا ملازم تھا جو عبداللہ خان اشک زی کی امداد کے لئے کشمیر بھیجا گیا تھا لیکن عبداللہ خان اشک زی کی غیر حاضری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کشمیر کا گورنر بن بیٹھا تھا۔ افغان حکومت کے 66 برسوں میں کل 28 گورنر کشمیر پر حکمران رہے۔ جن میں کچھ صرف تین ماہ، چھ ماہ یو نو ماہ تک حاکم رہے۔ صرف کچھ کو تین چار برس تک حکومت کرنے کا موقعہ ملا صرف عبداللہ خان اشک زای افغان نے 11 سال اور چھ مہینے ، وزیر شیر محمد خان نے سات سال اور سردار اعظم خان

نے 1813 سے 1819 تک یعنی چھ سال حکومت کی تھی۔ اور ان سب کے علاوہ امیر خان شیر نے 1770 سے 1776 تک حکومت کی تھی۔ کشمیر میں افغان گورنر کبھی کابل سے اپنے وارفتہ عزائم کی تکمیل کے لئے اذن حاصل نہ کرتے تھے بلکہ اُن کی تقرری کے بعد ان کا کابل سے مکمل انقطاع ہو جاتا تھا اور وہ نیم خودمختار حکمران بن جاتے تھے اور کشمیر کے لوگ زندگی کو جبر وظلم کی بے رحم داستان سمجھتے تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ان ظالموں کی موجودگی میں اُن کا شعلۂ احساس روشن نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ذہنوں میں مایوسی کے احرام تعمیر کر لئے گئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان اس زمانے مختلف قبائل کی خانہ جنگوں کا آماجگاہ بن چکا تھا۔ افغانستان کبھی ایک متحد ملک نہ تھا اکثریت آبادی پشتون تھی۔ لیکن افغانستان کی آبادی کا تیس فی صد حصہ ازبک، تاجک، ترکوں اور ہزارہ کے ایرانی نژاد افغانوں پر جو پشتو نہیں بولتے تھے پر مشتمل ہے اور یہ قبیلے آپس میں خانہ جنگی میں صدیوں سے مصروف تھے۔ احمد شاہ ابدالی کا زیادہ تر وقت پشتون قومیت کو منظّم کرنے میں صرف ہوا اور پھر وہ ایران سے جنگ میں اُلجھ گیا تھا۔ نادر شاہ نے افغانستان کو متحد کر کے مغلیہ سلطنت کو تاراج کر کے افغانستان کو آزاد ملک بنا دیا تھا۔ بابر کے زمانے سے لے کر نادر شاہ کے دورِ حکومت تک مغل اثر ورسوخ صرف کابل تک محدود تھا۔ ورنہ افغانستان ایک بلا حکومت نیم خودمختا علاقہ تصور کیا جاتا تھا۔ ابدالی کا فرزند تیمور شاہ اندرونی انتشار کے ہاتھوں ازحد عاجز ہو چکا تھا۔ اس لئے افغانوں نے پنجاب چھوڑ دیا تھا اور افغانستان اب انتشار کا منبہ بن چکا تھا۔ تیمور شاہ کا 1793 میں انتقال ہوا تو اس کا فرزندہ زمان شاہ تخت نشین ہوا تھا۔ یہ زمان شاہ تھا جس نے رنجیت سنگھ کو اپنی جانب سے لاہور کا گورنر بنایا تھا۔ مگر رنجیت سنگھ کو انگریزوں کی اعانت حاصل تھی کہ وہ سکھ قوم کو منظّم کر کے ایک فوجی اور سیاسی طاقت

بنانا چاہتے تھے تاکہ افغانستان پھر کبھی پنجاب کی طرف نگاہیں نہ اُٹھا سکے۔ اس طرح
جب کہ زمان شاہ افغان خانہ جنگوں میں مصروف تھا۔ رنجیت سنگھ نے خود مختار بن کر
80,000 افراد پر مشتمل سکھ فوج منظّم کر لی ۔ سکھ ایک جنگو قوم بن چکے تھے اور
انگریزوں کا منشاء ہندو اور سکھوں کی امداد سے مسلمانوں کا خاتمہ کرنا تھا۔ اس لئے
رنجیت سنگھ 500 تعداد کا توپ خانہ قائم کر سکا تھا۔ فوجی تربیت انگریز بہم کر رہے تھے
۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز ہندوستان پر تسلط جما رہے تھے ۔ 23 جون 1757 کو
لارڈ کلایو نے سراج الدولہ نواب بنگال کو پلاسی کے میدان میں شکست دے کر اُس کا
خاتمہ کر دیا تھا اور کلکتہ کے 24 پرگنوں پر حکومتی اختیارات حاصل کر لئے تھے اور
1758 میں لارڈ کلایو بنگال کا پہلا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ اسی دوران زمان شاہ کی غیر
موجودگی کا فائدہ اُٹھا کر رنجیت سنگھ نے کشمیر، پشاور اور ملتان پر تسلط حاصل کر لیا تھا اور
نواب اودھ کو اپنا باج گذار بنا کر 1773 میں روہیلہ افغانوں اور دھ کے علاقہ جات
خالی کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور 1778 میں انگریز حیدر علی میسور کے حکمران کے ساتھ
جنگ پر آمادہ ہوئے تھے اور اس طرح 1835 تک انگریز اب شمالی ہندوستان پر بھی
غلبہ حاصل کر چکے تھے۔ زمان شاہ کا انتقال A.D1800 میں ہوا تھا۔ اس دوران
کابل اور کشمیر کے درمیان رنجیت سنگھ کی سکھ حکومت قائم ہو چکی تھی اور کشمیر میں صرف
ایک مختصر افغان فوج وہاں کے گورنر کی امداد کے لئے موجود تھی اور جب خانہ جنگوں کے
نتیجہ میں دوست محمد بارک زی نے افغانستان کی حکومت پر قبضہ کیا تو شاہ شجاع نے
لدھیانہ میں پناہ لی تھی۔ شاہ شجاع احمد شاہ ابدالی کا پوتا تھا اور 1809 میں جان بچا کر
لدھیانہ پہنچا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایران اور روس اتحادی بن چکے تھے۔ اس لئے
دوست محمد بھی روس کا ہمنوا تصور کیا جاتا تھا۔ اس لئے انگریزوں نے رنجیت سنگھ کی

افواج اور انگریزی فوج کی مدد سے دوست محمد خان کو تخت سے دستبردار کر کے شاہ شجاع کو افغانستان کا حاکم بنا دیں گے تاکہ وہ انگریزوں کے مفاد میں حکومت کرے۔ اس لئے 1838 میں ایک معاہدہ تحریر ہوا تھا جس پر لارڈ آک لینڈ وائسرائے رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے دستخط ثبت ہیں۔ اس لئے دوست محمد خان کو کشمیر پر توجہ دینے کا موقعہ ہی نہ ملا تھا اور 1819 میں رنجیت سنگھ کشمیر پر قابض ہو سکا تھا۔

اس پس منظر میں قاری یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ کشمیر میں جو بھی افغان گورنر تھے اُن کا کابل سے برائے نام رابطہ تھا۔ اور کشمیر میں افغان گورنر کے ظلم و جبر میں افغان حکومت کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اور کشمیر کے افغان گورنر ایک قلیل افغان فوج کے ساتھ نیم خود مختار حاکموں کی طرح حکومت کرتے تھے۔ اس زمانے میں یہی حال روہیلہ افغان کا رویہ تھا۔ جن کا پیشہ لوٹ مار اور غارت گری تھا اور جنہوں نے روہل کھنڈ میں قیامت برپا کی تھی اور نواب اودھ اتنا خوفزدہ ہوا تھا کہ اس نے انگریزوں سے امداد طلب کی تھی ۔ کشمیر پر افغان تسلط صرف 66 برس قائم رہا۔ یعنی 1753 سے لے کر 1819 تک جب رنجیت سنگھ نے اس بات کا فائدہ اُٹھا کر کہ اعظم خان افغان فوجیوں کے ہمراہ کابل کے بادشاہ کی امداد پر گیا ہے اور حکومت اپنے برادر جبار خان کے حوالے کی ہے جس کے پاس برائے نام فوج رہ گئی تھی اور ہری پور کے مقام کثیر تعداد سکھ فوج نے غلبہ حاصل کیا اور 15 جون 1819 کو جبار خان اور اس کے ساتھی قابل چلے گئے۔ کشمیر پر سکھ تسلط قائم ہو گیا تھا ۔ سکھ فوج جس کی تعداد اندازے کے مطابق 30,000 ہزار سے زائد تھی ۔ جبار خان اور اس کے افغان ہمراہیوں کا نہ تو تعاقب کر سکتی تھی اور نہ ہی جبار خان کو گرفتار کر سکتی تھی ۔ اور جبار خان کابل جانے میں سکھ فوجی کی انتہائی نااہلی کی وجہ سے کامیاب ہو گیا تھا۔

میں یہ اجمالی خاکہ کشمیر میں افغان حکومت کا اس لئے پیش کیا ہے کہ کشمیر کے حالات کو افغانستان کی روشنی میں پرکھا جائے۔ چونکہ یہ افغانوں کی بدقسمتی ہے کہ افغان دور میں کوئی غیر جانبدار تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔ اس لئے افغانوں کے مظالم کا کوئی تاریخی مواد موجود نہیں ہے۔ یہ کہانیاں فارسٹر، ہوگل، لارنس، ملا حسن نے تحریر کی ہیں۔ مُلا حسن سکھ دور حکومت میں 1832 میں پیدا ہوا تھا اور وہ پنڈت گنیش کول کے اولاد میں سے تھا اور پھر تاریخ کشمیر پر پنڈت بیر بل کاچرو نے رائے زنی کی۔ یہ 1835 کا زمانہ تھا اور ان کی تاریخ سکھ حکومت کے دور میں تحریر ہوئی تھی۔ اور پھر گلزار کشمیر اور گلاب نامہ دیوان کرپا رام نے تحریر کیا تھا۔ اس لئے کشمیر میں افغانوں کے مظالم کا اور کوئی تحریری مواد موجود ہی نہیں اور نہ ہی کوئی ثبوت موجود ہے۔ پنڈت آنند کول نے بھی تاریخ کشمیر پر خامہ فرسائی کی ہے۔ میں افغانوں کے مظالم کے چشم پوشی نہیں کرنا چاہتا مگر ان کے دور حکومت کے احوال کا تاریخی مواد بہت کم بلکہ نایاب ہے۔ حتیٰ کہ 66 سال کے قلیل عرصہ میں کشمیر میں کابل نے 28 گورنر مقرر کئے تھے اور کچھ ہی گورنر ایسے تھے جن کے عہدِ حکومت پر اُنگلیاں اٹھائی جاسکتی ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس بے دردی سے سختی کشان افغانوں نے پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کو روند ڈالا تھا اس لئے ہندو قومیت پرست عوام کے دلوں میں افغانوں کے خلاف زہر آلودہ نفرتوں کو محرک کیا تھا۔ افغان ستم ایجاد، ظالموں اور وحشیوں کی علامت بن گئے تھے۔ چونکہ ہندوستان سے آبادی میں پچاس گنا قلیل ہونے کے باوجود محمود غزنوی کی یلغاروں سے لے کر احمد شاہ ابدالی کی قہر سامنیوں تک ان لوگوں نے ہندو قوموں کی محرومیوں کو محرومی جاوید بنا دیا تھا۔ اس لئے کشمیر کے ہندو مورخین اور ہندوستان کے شہر آفاق تاریخ دان جادو ناتھ سرکار نے، پٹھانوں کے لئے صرف

دشنام کاری سے اپنی آرزو کا اظہار کیا ہے اور انتہائی مبالغہ آمیزی سے افغانوں کے مظالم کو بیان کیا ہے اور انگریزی عزائم ایشاء میں خلافت کا خاتمہ وسط ایشیاء اور چین پر تسلط ہندوستان سے حاصل کی ہوئی دولت لازوال، اور خام مال سے تجارت کے نئے اصول اور نئی منڈیاں قائم کرنا تھا وہ ایران پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن افغانستان اُن کی راہ میں سنگِ گران کے طور پر حائل تھا۔ حتیٰ کہ افغانستان صد سال سے قبائل کی خانہ جنگی کا مرکز بن گیا تھا۔ اس لئے انگریزوں کے لئے وہ مدعی ستم گر تھا۔ انگریز مورخین کشمیر میں افغانستان کے راج کو زخم پیکانِ جگر تصور کرتے تھے۔ اس لئے اُن سے غیر جانبدار تجزیہ کی توقع ہی نہ رکھی جاسکتی ہے۔ اُنہوں نے جان بوجھ کر افغانوں کو بدنام کیا ہے۔ کشمیر میں افغان تسلط صرف 66 برس قائم رہا تھا اور اس عرصہ میں بھی راجہ سکھ جیون مل نے 1753 کے بعد 1762 تک حکومت کی تھی۔ اس اندازہ سے افغان حکومت صرف اٹھاون برس قائم رہی۔ اور جب افغان گورنر نے کشمیری پنڈتوں پر زیادتی کی تھی تو احمد شاہ ابدالی اپنے گورنر لال خان خٹک پر اتنا برہم ہوا کہ اس نے خرم خان کو فوج لے کر کشمیر روانہ کیا تھا اور لال خان خٹک فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا اور خرم خان نے کشمیری پنڈتوں کو ہر قسم کی مراعات سے نوازا تھا، اور کشمیر میں کیلاش دھر کو مالیہ حاصل کرنے والوں کا سربراہ بنایا تھا۔ اور اس وجہ سے افغانوں نے اس کا ساتھ نہ دیا اور اس کو کشمیر سے فرار ہونا پڑا تھا اور پھر ایک سال کے لئے فقیر اللہ کنٹھ نے بمبے اور کھوکہ راجوں کی امدا سے کشمیر میں تباہی مچا دی تھی۔ اور پھر احمد شاہ ابدالی نے کشمیر کے حالات کیلاش دھر سے خود معلوم کئے جو اس کے ہمراہ کابل میں تھا اور دوبارہ خرم خان کو گورنر بنایا تھا اور پھر 1770 امیر خان کو کشمیر کا گونر بنایا گیا یہ وہی شخص ہے جس نے امیرا کدل پل تعمیر کروایا تھا۔ سونہ لانک کو ڈل میں انتہائی جاذیب بنایا اور

جب 1772 میں احمد شاہ ابدالی کا انتقال ہوا تو اس نے شیر گڑھی کا محل تعمیر کروایا تھا۔ اور جب تیمور شاہ کے حالات خانہ جنگوں کی وجہ سے ابتر ہوئے اور سکھوں نے پشاور پر قبضہ کرلیا تو امیر خان جوان شیر نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن جب تیمور شاہ نے یہ سنا کہ امیر خان نے کشمیر میں فحاشی اور عیاشی کا بازار گرم کیا ہے اور اس لئے کشمیری پنڈت اس سے برہم ہیں اس نے حاجی کریم داد خان کو فوج لے کر کشمیر روانہ کیا جس نے امیر خان کے ظلم وستم کا خاتمہ کر دیا اور 1776 میں گورنر کشمیر کے طور پر حکومت کی تھی۔ حاجی کریم داد خان نے بھی کشمیر میں ظلم روا رکھا تھا۔ اپنے ظلم کی وجہ سے وہ آج بھی بدنام زمانہ ہے۔ 1783 میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے حالات فارسٹر نے تحریر کئے ہیں لیکن تیمور شاہ نے جب آزاد خان کے مظالم کی داستان سُنی تو اس نے مدد خان کو فوج لے کر کشمیر روانہ کیا اور مدد خان نے آزاد خان کو شکستِ فاش دے کر کشمیر سے فرار ہونے پر مجبور کیا اور اس نے پھر خودکشی کر لی تھی۔ میں نے ان واقعات کا اس لئے تفصیل سے جائزہ لیا ہے کہ افغانستان کی خانہ جنگوں کی وجہ سے کشمیر کے گورنر نیم خود مختار بن جاتے تھے۔ لیکن جب بھی اُن کی زیادتیوں کی اطلاع احمد شاہ ابدالی یا اس کے فرزند تیمور شاہ کو ملی تھی تو اُنہوں نے ان کا محاسبہ لازمی قرار دیا اور کشمیریوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کے لئے احکام جاری کئے تھے اور عبداللہ خان الک زای کے دور میں کشمیر خوشحال ہوا تھا۔ 20,000 ہزار کشمیر فوج میں بھرتی کئے گئے تھے، ہری داس تکو دیوان مقرر ہوا تھا۔ اس کا برادر نندرام تکوں بھی دیوان رہ چکا تھا۔ لیکن ہری داس تکو نے اس کے خلاف سازشیں کی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کابل میں زمان شاہ قبائل کی باہمی رقابتوں کی آگ میں جل رہا تھا ان ہی حالات میں عطا محمد خان نے کشمیر کے گورنر کا عہدہ سنبھالا۔ وہ ایک جنسی مریض تھا اور خاص

طور پر کشمیر پنڈت خواتین کا دلدادہ تھا، اور اس نے کشمیر کو زنا و جبر کی وادی بنا دیا تھا۔ ان تین افغان گورنروں کے علاوہ باقی سب نے کشمیر میں احسن سلوک کیا تھا۔ اس وقت یعنی 1801 میں کابل میں زمان شاہ کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا تھا اور محمود شاہ افغانستان کا بادشاہ بن بیٹھا تھا لیکن اس کو بھی حکومت کرنے نہ دی گئی اور 1805 میں شاہ شجاع، شاہ افغانستان بن گیا تھا۔ افغانستان کی افراتفری کے حالات کا فائدہ اٹھا کر عبداللہ خان الک ذی نے بالا حصار کے قلعہ میں قید سے نجات پائی اور کشمیر میں اپنی خود مختار حکومت کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب افغانستان میں طوائف الملو کی پھیل گئی تھی اور شاہ شجاع بھی افغانستان سے جان بچا کر پنجاب میں پناہ گزین ہوا تھا۔ لیکن عطا محمد بارک زی نے نند رام تکو کو شاہ شجاع کے پاس بھیج کر کشمیر بلایا تھا اور جب 1813 میں شاہ شجاع کشمیر آیا تو اسے ہری پربت کے قلعے میں قید کر دیا گیا تھا۔ عطا محمد خان کی گورنری کے دور میں نند رام تکو اور سہاز رام سپرو ہی حکومت کا کاروبار چلاتے تھے اور نند رام تکو افغانوں کے مشیر خاص تھا۔ جس کی کابل کے دربار میں رسائی تھی اور جب فتح محمد خان نے کشمیر کی حکومت حاصل کی اور اپنے برادر اعظم خان کو کشمیر کا گورنر بنایا اور خود نند رام تکو کے ہمراہ 1813 میں کابل چلا گیا تھا تو اعظم خان نے سہاز رام سپرو کو اپنا دیوان بنایا تھا۔ لیکن اعظم خان کشمیری پنڈتوں کے حکومت میں دخل اندازی سے تنگ آچکا تھا حتیٰ کہ اعظم خان نے ہی مالیہ حاصل کرنے کے سربراہ بیربل در، مرزا پنڈت در او سکھ رام صفایا کو مقرر کیا تھا اور یہ پنڈت بیربل در نے کشمیر سے بھاگ کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار تک رسائی حاصل کی تھی۔ اس کا فرزند کاک در اُس وقت کولگام میں تحصیل دار تھا اور اسے بیربل در کو جموں تک پہنچنے امداد دی تھی۔ بیربل در کے راجہ گلاب سنگھ سے بھی تعلقات تھے اور اس وقت راجہ گلاب سنگھ

کا بھائی دھیان سنگھ رنجیت سنگھ کو وزیر خاص تھا اور گلاب سنگھ نے بیر بل در کو ذاتی خط
دھیان سنگھ کے نام پر دیا تھا اور اس طرح بیر بل در نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو کشمیر حاصل
کرنے کی ترغیب دی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغان کشمیریوں پر مہربان تھے۔
یہ وہی زمانہ تھا جب کشمیر میں بھی افغان خانہ جنگی میں مُبتلا تھے۔ اعظم خان، کابل چلا
گیا اور اس کے ہمراہ نند رام تکو تھا۔ اس کے برادر فتح محمد خان کو خرم خان حاکم ہرات
نے نے قید کر کے اندھا کر دیا تھا۔ اس لئے 1819 میں یہ حالات دیکھتے ہوئے
رنجیت سنگھ نے مصر چند، ہر چند، ہری سنگھ نلوہ، اور سردار جولا سنگھ کی سربراہی میں
30,000 ہزار فوج دے کر کشمیر کو فتح کرنے کا منصوبہ روبہ عمل لایا تھا۔ پنڈت بیر بل
در اس فوج کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اور فتح محمد کا بھائی جبار خان یہ دیکھ کر کہ سکھ فوج کثیر
تعداد میں ہے اور افغانوں کی تعداد قلیل ہے، شوپیان کے مقام پر رسمی مقابلہ کرنے
کے بعد اپنے ہمرائیوں سمیت کابل چلا گیا تھا۔ یہ 15 جون 1819 کا واقعہ ہے
جب سکھ افواج سرینگر شہر پر قابض ہو گئی تھی۔ تاریخ کے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا
ہوں کہ 28 گورنر جو کشمیر تعینات ہو کر آئے تھے۔ ان میں سے تقریباً سب نیم خود مختار
تھے اور صرف تین گورنر ایسے تھے جو جنسی مریض تھے اور فحاشی کے دلدادہ تھے اور اُنہوں
نے شہرِ سرینگر میں جنسی بے راہ روی کو فروغ دیا تھا۔ لیکن ان کے علاوہ باقی گورنروں
کی اکثریت کشمیریوں کے تسکین درِ دل اور کشمیر میں امن تلاش کرنے میں مصروف
رہے تھے اور جب بھی کوئی شکایت کابل پہنچتی تو فوراً شاہ کابل نے اپنی خانہ جنگوں کو
بلائے طاق رکھ کر فوج روانہ کر کے اس گورنر کا خاتمہ کر دیا کرتا تھا۔ ورنہ عبداللہ خان
الک زی اپنی فوج میں 20,000 ہزار کشمیریوں کو شامل نہ کرتا اور سوائے چند افغانوں
کے اکثریت نے میزان عدالت قائم کیا تھا اور کشمیر کے کسی بھی دیہات میں بھی کوئی

جرم برداشت نہ کیا جاتا تھا۔ افغان شاہوں نے کشا ئش جوانی کے تقاضوں سے مجبور ہوکر وضع عشق کوفریب دینے کی سعی نہ کی تھی۔ افغانوں نے کشمیر میں شرعی نکاح کیئے اور آداب محبت کو نبھایا تھا۔ یہ الزام کہ پٹھانوں نے کشمیریوں سے توہین آمیز سلوک کیا تھا یہ بھی محرم راز لوگوں کی ستم ظریفی اور شاعرانہ تعلیٰ کا کرشمہ نظر آتا ہے ورنہ کشمیریوں کو ناراض کر کے عبداللہ الک زی 20,000 ہزار کشمیر کے جیالوں کو اپنی فوج میں بھرتی نہ کرتا اور اسی کشمیری فوج کے امداد سے اس نے راجوری کے راجہ کو لوہے کے چنے چبوائے تھے۔ یہ کہنا کہ افغان گورنروں کی حکمت عملی یہ تھی:

"اول خراب آ اور آخر خراب جا"

حقیقت سے کوسوں دور اور بعید ہے۔ پٹھانوں نے کشمیری پنڈتوں کو اہم عہدوں پر فائز کیا تھا اور مالیہ وصول کرنے کے لئے ان پنڈتوں نے سختی سے کام لیا تھا اور کشمیریوں کی زندگی کو جبر بنا ڈالا تھا اور بقولِ فانی بدایونی:

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

اس لئے تاریخ دانوں نے صرف غلو سے کام لے کر افغانوں کو بدنام کیاہ ے۔ کشمیر میں افغان دور پر نئی تحقیق ہونی چاہیے۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ زمان شاہ نے جو احمد شاہ ابدالی کا پوتا تھا پنڈت نند رام تکو کو کابل میں اپنا وزیر مقرر کیا تھا اور ڈاکٹر سر محمد اقبال کے جدِ امجد جو جن کا اسم گرامی سہاز رام سپرو تھا کو رحمت اللہ جو عبداللہ خان الک ذی کا بردار تھا نے مالیہ وصول کرنے کے لئے اپنا مشیرِ خاص مقرر کیا تھا اور پھر اعظم خان کے عہد حکومت میں مالیہ وصولی میں کمی ہوئی اور اعظم خان کو شک ہوا کہ غبن ہوا ہے اس نے شہباز رام سپرو

سے محاسبہ کیا اور سہاز رام سپرو نے کچھ رقم اپنے ذاتی مصرف میں لانے کا اعتراف کیا تھا اور غبن کی سزا موت تھی۔ سہاز رام سپرو نے اسلام قبول کیا تھا اور کشمیر چھوڑنے کی شرط کو تسلیم کیا تھا اور اس طرح سہاز رام سپرو سیالکوٹ میں رہائش پذیر ہوا تھا اور اُن ہی کی اولاد ڈاکٹر سر محمد اقبال شاعرِ مشرق تھے۔ لیکن اُس سے قبل سہاز سپرو اعظم خان کی اہلیہ اور بچوں اور کثیر دولت کو لے کر کابل روانہ ہوا تھا۔ انہیں کابل پہنچایا اور پھر سیالکوٹ میں مقیم ہوا تھا۔ اعظم خان کی حکومت کے دور میں ہرداس تکو بھی وزیر خاص کے عہد پر فائز ہوا تھا۔ اور اعظم خان نے ہی بیر بل در، مرزا پنڈت در اور سکھ رام صفایا کو مالیہ کی وصولی کے لئے سربراہ مقرر کیا تھا۔ لیکن جب بیر بل در نے ایک لاکھ روپیہ غبن کیا اور اعظم خان نے وصولی کی رحم کا دعویٰ کیا تو بیر بل در اپنے فرزند پنڈت راج کاک در کی امداد سے رنجیت سنگھ کو کشمیر پر حملہ کرنے کی ترغیب دینے کے لئے لاہور دربار میں رسائی حاصل کر سکا تھا۔ اس لئے افغانوں کو یہ الزام دینا کہ انہوں ے کشمیری پنڈتوں کو جبراً اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور کیا تھا تاریخ کشمیر کا سب سے زیادہ مسخ شدہ المیہ ہے۔ کابل میں کشمیری پنڈت مورخین کے کہنے کے مطابق کابل میں نندرام تکو کے نام پر سکہ جات جاری کئے گئے تھے۔ اس لئے پٹھان دور کی تاریخ پر کشمیر میں نئ ریسرچ ایک نئے انداز اور ایک نئے حسن طلب کا تقاضا ہے۔ اور کشمیری قوم پیہم خود فراموشی میں گرفتار نہیں رہ سکتی ہے۔ صحیح اوقات کا منظر عام پر آنا، ظلمت شب میں نور سحر سے کچھ کم نہیں ہوتا اور نئ نسل کا یہ فرض ہے کہ اب نئ تحقیق کی نئ راہیں مرتب کی جائیں۔ ورنہ کشمیر میں پٹھان دور کی تاریخ بقولِ مرزا غالب:

اگر دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے  
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

اور ایک اہم سوال جو سوال نہیں بلکہ کشمیر کی تاریخ پر سوالیہ نشان بن گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہندو دور حکومت میں کشمیر کی سلطنت وسطی ہندوستان تک پھیل ہوئی تھی اور کشمیری مورخین کے فرضی مضمون کے مطابق کشمیر کے جیالوں نے سلطان محمود غزنوی کے ازیک ترکوں کو خوفزدہ کیا تھا اور تیمور لینگ بھی گھبرا کر بھمبر سے واپس مراجعت کر گیا تھا۔ مرزا حیدر دوغلات تک کو کشمیر میں قتل کر دیا گیا تھا اور 1480 میں بہلول لودھی کے جنرل تاتار خان کو بھی شکست ملی تھی اور ملک تازی بٹ اس جنگ کا ہیرو تھا۔ اور تناہی نہیں کشمیری مورخین کے کہنے کے مطابق راجوری کے مقام پر اکبر بادشاہ کے قریبی رشتہ داروں قرہ بہادر کو بھی شکست سے دوچار کر دیا تھا اور پھر راجہ بھگوان داس جو مغل فوج کی سربراہی کر رہا تھا۔ یوسف چک کے فوجیوں کے سامنے سے بے بس ہو گیا تھا اور پھر یوسف شاہ چک کو بات چیت سے اور حکمت عملی سے آمادہ کر کے اکبر کے دربار میں پیش ہونے کی ترغیب دی تھی اور اس طرح بہادری، جراتمندی، ہمتی اور جرار ہونے کے معیار قائم ہوئے تھے اور اگر یہ واقعات جس رنگ میں ظاہر کئے جاتے ہیں صحیح ہوں پھر پٹھانوں کی قلیل مدت یعنی 66 سالہ دورِ حکومت میں کشمیر کے جیالوں کی عزم آہنی اداب کیوں مجبوری میں تبدیل ہو گئے؟ اور کشمیری مظلوم بن گئے کہ ہر کشمیری مبتلائے غم حزن ہو گیا؟ جنوں نواز ارادے خاک میں مل گئے آخر کیوں؟ اور افغان ظالموں کے مغرور تیوروں نے کشمیریوں کے یقین کی مشعل کو بجھا دیا؟ اور مدافعت کے عزائم کو مٹی میں ملا دیا تھا؟ اور کشمیریوں کی ہمتی سے شب تار اندھیروں کو اپنی تقدیر کو تاریک کرنے کی کھلی اجازت دے دی تھی۔ آخر کیوں؟ کیا ایک واقعی جری قوم اپنی جوان ہمتی کو ایک دم تھکا ماندہ تصور کرتی ہے؟ اور قوموں کے کردار میں چشم زدن میں اتنا بڑا انقلاب بغیر کسی محرک کے لئے اثر انداز ہو سکتا ہے؟ ماضی کے نقشِ

دلوں سے کیسے یک لخت مٹ سکتے ہیں؟ اور پھر ایک پوری قوم یہ کیسے محسوس کرسکتی ہے کہ اُن کے بے رحم حاکموں نے جہنم کی آگ پھر سے روشن کی ہے؟ اور ایک پوری قوم کیوں یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ سانس بھی لیتی ہے تو رُک رُک کر اور بات بھی کرتی ہے تو دبے لہجے میں کہ بات کرنا بھی جرم وفا ٹھہرا ہے اور بے وفائی کی سزا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زیست گزارنا یا ٹھہرا ہے آخر کیوں؟ کشمیریوں سے کشاکش اور جدو جہد کی دولت بیدار کیسے جلدی چھن لی گئی؟ اور ظلم وجود کو تسلیم کرنے کی خُو کس نے ڈالی تھی؟ کشمیر کی تاریخ کے رنگین افسانوں میں اس سوال کا جواب نہیں ملتا ہے۔ اس لئے جھوٹے قصے بنا کر سارا الزام افغانوں کو دیا جاتا ہے۔ اُس زمانے میں کابل میں جو افغان اپنی قبائل کی خانہ جنگوں میں تباہ و برباد ہوگئے تھے اور کشمیر میں جو افغان صوبیدار بن کر آئے اُن کے افغان ہمراہیوں کی تعداد صرف چند ہزار سے زیادہ نہ تھی اور وہ بھی کشمیر میں، یہ کہہ کر:

کاٹ دیں گے قیامت کا ایک دن اور سہی"

زندگی گزار رہے تھے، اس لئے انہیں کشمیر میں عرصۂ حوادث کا واحد اِختراع کرنے والا قرار دینا صرف جھوٹ ہے اور پھر کشمیری مورخین کا کہنا کہ جبار خان کے کابل روانہ ہونے کے ساتھ ہی ہزار صدیوں پر پھیلا ہوا تاریخ دن ڈوب گیا صبح معلوم نہیں ہوتا۔ نئی تحقیق ہی کئی معمون کو حل کرسکتی ہے ورنہ کشمیر کی تاریخ ایک مفروضہ بن جائے بن جائے گی۔ میں تو کسی اردو شاعر کی زبان میں صرف اتنا کہوں گا:

رہروے شوق ابھی مرحلے غم ہیں بہت

جہد ناکام تیری زیست کا انجام ہے

ہمیں صرف اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کا جواز نہیں ڈھونڈنا ہے بلکہ حقیقت

کو تلاش کرنے کی سعی کرنی ہے تا کہ ہم اپنے آپ کو خود سمجھ سکیں ۔تب ہی ہم مذاق انجمن بدل سکتے ہیں یا اپنے حالات موڑ سکتے ہیں۔ زمانے کی روش کو تبدیل کر سکتے ہیں اور ایک نئی قوم کے نئے کردار کی تشکیل دے سکتے ہیں:

اے حدِ ضبط درد نہ کر دل سے اب دریغ
اک آہ بے صدا کہ دُعا بھی دوا بھی ہے!

افغانوں کی تاریخ پر نئی تحقیق ہونی چاہیے۔ یہ کام اب کشمیری دانشوروں کا ہے۔

☆☆☆

# کشمیر میں سکھ دور

15 / جون یا جولائی 1819 وہ منحوس دن ہے جب کشمیر میں سکھا شاہی کا آغاز ہوا۔ اس روز سکھوں نے کشمیریوں کے بارہ بجا دیئے تھے ۔ آج اس واقعہ کو ایک صد اور ترنوے برس بیت چکے ہیں۔ مگر آج بھی کشمیریوں کے بارہ بج رہے ہیں۔ سکھوں نے صرف 37 برس کشمیر پر حکومت کی مگر اس مختصر عرصہ میں انہوں نے کشمیریوں کی زندگی، حیات کا عنوان بدل دیا اور پھر وہ زمانہ آیا یعنی چاندی سے بھی آگ برسے گی۔ شمع بھی روشنی کو ترسے گی" اور یہ حالات آج تک چلے آ رہے ہیں۔ کشمیر پر ظلم و جور کے بادل منڈلانے لگے اور کھیت کھلیانوں میں وحشت پھیلنے لگی۔ سکھوں نے جامع مسجد سرینگر کو گھوڑوں کا اصطبل بنا ڈالا۔ مسلمانوں کی نماز پر پابندی عائد کر دی اور شہر سرینگر درندوں کا وحشی جنگل نظر آنے لگا اور اس وادی میں مفلس کا خون پینا روایت بن گیا۔ زی عزت لوگوں کو زلیل اور رسوا کیا گیا۔ لوگوں کو ادائیگی ٹیس کے بہانے لوٹ لیا گیا۔ گاؤ کشی کی تعزیر سزائے موت مقرر ہوئی۔ اور پھر وہ وقت آیا یعنی مٹی کا بھی کچھ مُول، مگر انسانوں کی قیمت کچھ بھی نہیں، او ہر فرقہ ہر گاؤں میں دستِ مفلسی دراز ہوتے رہے اور حق بھی تسلیم ہی نہ کیا گیا۔ حقدار تک پہنچنے کا سوال ہی کہاں ہے عورت کو اس کے بلند مقام سے گرا دیا گیا اور محض ایک جسم بنا ڈالا گیا، عزتیں شہرتیں، چاہتیں، اُلفتیں، کو سرِ بازار نیلام کیا گیا۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ سکھ

قومیت پرست نہ تو مغلوں سے جیت سکے تھے اور نہ ہی افغانوں کا حساب چکا سکے تھے۔ وہ انگریزوں کی مدد لیتے قوم بنے تھے۔ تیس ہزار سکھ فوج کشمیر میں اپنی شجاعت کا اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتی تھی۔ چونکہ پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حالات، انگریزوں کی خوشنودی پر قائم تھے۔ پنجاب اور پشاور میں سکھ حکومت بے بسی کا شکار بن چکی تھی۔ حکومت کو قائم رکھنا، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لئے ایک مسئلہ بن چکا تھا۔ حکومت کو دوام دینا اس کی دسترس سے دور تھا۔ اور حالات تیزی سے گردش کر رہے تھے۔ تاریخ کی ستم ظریفیاں بڑی شاعرانہ ہو کرتی ہیں۔ زمان شاہ حاکم افغانستان نے رنجیت سنگھ کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا تھا لیکن رنجیت سنگھ ہمیشہ زمان شاہ سے بدظن رہا اور اُسے ہمیشہ خوف رہا۔ لیکن رنجیت سنگھ انتہائی خوش قسمت تھا۔ افغانستان زمان شاہ کے زمانے میں قبائل کی باہمی رشہ کشی اور جنگ کے شعلوں میں جل رہا تھا۔ یہ نظارہ انگریز بھی دیکھ رہے تھے۔ اس لئے اعظم خان گورنر کشمیر کو افغان ہمراہیوں کے ساتھ کشمیر چھوڑ کر افغانستان روانہ ہونا پڑا تھا۔ اس لئے 1813 میں رنجیت سنگھ نے اٹک کے قلعہ پر قبضہ کیا تھا اور 1818 میں ملتان کو اپنی سلطنت میں شامل کر سکا تھا۔ ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ زمان شاہ کے خلاف برک زی قبیلہ نے اس زمانے میں فتح محمد کی سرداری کے تحت بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ اور زمان شاہ پشاور سے واپس افغانستان جانے پر مجبور ہوا تھا اور ہرات میں زمان شاہ کے سگے برادر محمد مرزا نے علم بغاوت بلند کیا تھا اور 1801 میں زمان شاہ کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور مرزا نے شاہ محمد کا لقب اختیار کر کے 1801 میں کابل کے حکمران ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ لیکن شاہ محمد نے قزل باش قبیلہ کی امداد حاصل کی تھی۔ قزل باش اہلِ تشیعہ تھے اس لئے پشتون قبائل مذہبی فرقہ داری کی بنا پر اس کے مخالف ہو گئے تھے۔

اب شاہ شجاع نے کابل پر حملہ کر کے شاہ محمد کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا دیا اور 1809 میں کابل کا حکمران بن بیٹھا تھا۔ اس کے لئے انگریزوں نے اُس کے ساتھ معاہدہ تحریری کیا تھا چونکہ انگریز شاہ محمد کی حکومت کا خاتمہ چاہتے تھے اور اُن کی تمنا تھی افغانستان میں خانہ جنگی قائم ودائم رہے یہی وجہ ہے کہ جب اعظم خان افغان گورنر نے انگریزوں سے کشمیر میں مدد طلب کی تھی تو انگریزی زیزڈنٹ اکٹرلونی نے جو اس وقت دلی میں تعینات تھا، امداد دینے سے انکار کیا تھا اور اعظم خان کے نام جو خط تحریر کیا تھا اس میں لکھا تھا کہ انگریز حکومت رنجیت سنگھ کی حکومت کی سب سے بڑی حمایت کرنا چاہتی ہے۔ اس طرح کچھ مورخین کے مطابق 15 جون کو نہیں بلکہ 15 جولائی A.D 1819 میں سکھ فوج نے سرینگر پر قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ لیکن سکھوں کا پہلا گورنر دیوان موتی رام کشمیریوں کی بدقسمتی کی علامت بن گیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے جب دیوان دیوی داس کو کشمیر کے حالات دریافت کرنے کے لئے روانہ کیا۔ اُسے مکتوب میں لکھا تھا کہ قانون کی عمل داری ختم ہو چکی ہے۔ بھوک اور پیاس کھلیانوں میں اُگتی ہے۔ ناداری اور مُفلسی لوگوں کا مقدر بن چکا ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو سرِ عام فروخت یا نیلام کر رہی ہیں۔ بہت سے لوگ کھیت چھوڑ کر مفرور ہو چکے ہیں اور گورنر موتی رام کی حکمرانی سے کسی فائدہ کی اُمید نہیں کی جاسکتی ہے۔ یہ خط آج بھی موجود ہے حالات کشمیر میں بہتری کے بجائے بدتری کی جانب زوال پذیر ہو رہے تھے۔

حقیقت میں اب کشمیری قوم کے غموں کا کوئی مداوا ہی نہ تھا۔ ظلم اور مشقِ جفا، سکھوں کے لئے مرحلۂ شوق کو سر کرنے کا دوسرا نام بن گیا تھا۔ سکھوں کے ظلم اور جبر، تشدد، بربریت اور بہیمانہ مظالم کا میں مرثیہ تحریر نہیں کرنا چاہتا۔ چونکہ سکھ اپنی بے بسی کے احساس کا بدلہ فرومایۂ کشمیر قوم سے لینا چاہتے تھے چونکہ وہ مغل اور پٹھان لوگوں سے

انتقام نہ لے سکتے تھے۔ افغانوں سے انتہائی نفرت کے باوجود وہ افغان بادشاہوں سے جو کابل پر سرِ اقتدار تھے حکمت عملی سے ہی کام لے سکتے تھے۔ انگریز رنجیت سنگھ کے حامی اس لئے تھے کہ وہ افغانستان پر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ پشتون قبائل ایک دوسرے کی دشمنی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ اور برک زی اور سدوزی قبیلہ ایک دوسرے کی گردن کاٹنے پر آمادہ تھا۔ نفرتوں کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دوست محمد خان سے رنجیت سنگھ کو خدا واسطے کی دشمنی تھی اور 1825 میں دوست محمد خان نے کابل پر باراں سال حکومت کی تھی۔ لیکن دوست محمد خان کے خلاف برک زی اور سدوزای سردار ہو چکے تھے اور جب دوست محمد نے شاہ شجاع کو فوجی شکست دی تھی اور دوست محمد خان کے دور میں افغانوں کی مالی حالت خستہ تر ہو چکی تھی اور وہ کوئی فوج تک مرتب نہ کر سکتے تھے۔ ان حالات کا فائدہ اُٹھا کر رنجیت سنگھ نے پشاور پر قبضہ کر لیا تھا اور یہ بات سکھ تاریخ نویس بھول جاتے ہیں کہ آفریدی اور یوسف زی قبیلوں کی آمد سے اور ان کی خوشنودی حاصل کر کے رنجیت سنگھ پشاور پر قبضہ کر سکا تھا، اور یہ بھی ایک اہم تاریخی واقعہ ہے کہ رنجیت سنگھ نے شاہ محمود کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ اور 1811 میں شاہ محمود کو اپنا بھروسہ دیا تھا کہ دونوں نے اپنی دستار بدل کر برادری قائم کرنے کا فیصلہ راولپنڈی کے مقام پر کیا تھا۔ اس کے بعد پشاور حاصل کیا گیا۔ اب سکھ مورخ پشاور پر قبضہ سکھوں کی بہادری کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ اس سے قبل عبدالرحیم خان نے ایوب خان فرزند شاہ محمد سے غداری کر کے اٹک کا قلعہ رنجیت سنگھ کے حوالے کیا تھا۔ رحیم خان کی چٹھی آج بھی موجود ہے اور ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ رحیم خان نے رنجیت سنگھ کے جنرل دیوی داس کے حوالے قلعہ کی

چابیاں کی تھیں اور اس طرح پٹھانوں کی آپس کی خانہ جنگوں سے صوبہ سرحد کے کوہ، صحرا اور سنگ حدید موم کی طرح پگھل اُٹھے تھے اور کشمیر میں افغان گورنر کو اب کابل سے کوئی بھی امداد نہ مل سکتی تھی اس لئے 1812 میں افغانی رقابتوں کا یہ عالم تھا کہ افغان اور سکھ فوجوں نے مل کر وزیر فتح خان اور مخام چند کی سربراہی میں کشمیر پر پہلا حملہ کیا تھا۔ لیکن افغانوں کی خانہ جنگوں نے ان کے زوال کو یقینی بنا دیا تھا اور 1819 میں جب سکھ کشمیر پر قابض ہوئے تھے۔ اُنہوں نے کشمیری مسلمانوں سے اپنی نفرتوں کا اظہار کر کے کشمیریوں کے خونِ قلب و جگر سے اپنی اُمنگوں اور آرزوؤں کو سیراب کیا تھا۔ جن سکھ گورنروں نے سکھا شاہی کے عروج کے زمانے میں کشمیریوں کو لہو رُلایا تھا اُن میں ہری سنگھ نلوہ فاتح پشاور 1823-1820 جس نے تلوار کی نوک پر کشمیریوں کو سکھ مذہب قبول کرنے کی ترغیب دی تھی۔ اور بہت سے لوگوں نے سکھ مذہب قبول کیا تھا اور ہری سنگھ نلوہ نے ہی مٹن اور بارہمولہ اور کاٹھی دروازہ میں سکھ گردوارے قائم کئے تھے۔ پھر دوبارہ دیوان موتی رام کو 1824-1823 تک گورنر مقرر کیا تھا پھر 1825-1823 تک دیوان چونی لال اور پھر دیوان چونی لال کی خود کشی کے بعد دیوان کرپا رام نے 1830-1826 تک کشمیر پر سکھوں کی جانت سے حکومت کی تھی اور 1828 کے ہولناک زلزلہ کے بعد بھما سنگھ ازادلی نے 1831 میں اپنے عہدہ کا چارج سنبھالا تھا۔ پھر کنور شیر سنگھ 1834-1833 میں گورنر رہا اور پھر کرنل مہان سنگھ 1841-1834 تک گورنر رہا تھا جس نے کشمیر کے حالات کو ٹھیک کرنے کی طرف کچھ توجہ دی تھی۔ باقی سب سکھ گورنر کشمیریوں پر تیرگی جال پھیلانے میں مصروف رہے تھے اور فیض احمد فیض کی زبان میں:

تیر گی جال ہے اور بھالا ہے نور
اک شکاری ہے دن اک شکاری ہے رات
جگ سمندر ہے جس میں کنارے سے دُور
مچھلیوں کی طرح ابن آدم کی ذات
جال تھامے کوئی ، کوئی تھالا لئے

اور عام کشمیری عوام سکھ حاکموں سے کہہ رہے تھے:

''میری باری کے بھالے سے مجھ کو کریں گے شکار
رات کے جال میں یا کریں گے اسیر ؟

اور جمیل الدین عالی کی زبان میں:

جل کے اوپر جال وہی جو جل کے اندر جال
مچھلی بچ کر جائے کہاں ؟ جب جل ہی سارا جال

سکھوں نے جو افغان وں کے سامنے بے بس تھے۔ افغانوں کا بدلہ خوب کشمیری مسلمانوں سے لیا ہے۔

شیخ عبداللہ کشمیری قومیت کو جگانے کے لئے ہمیشہ اپنی تقریروں میں کہتے رہے کہ پٹھانوں اور مغل کشمیر میں داد عیش لیتے رہے ہیں۔ لیکن اُنہوں نے کبھی بھی سکھ دورِ حکومت کے مصائب کو اپنا موضوع نہیں بنایا تھا۔ آخر کیوں؟۔ مغلوں نے کشمیر کو کلچر دیا ہے۔ کشمیری زبان کو فارسی رسم الخط دیا ہے۔ کشمیر کو ہندوستان میں صحت روح افزا مقام کا درجہ دیا ہے اور افغان 66 سال تک کشمیر میں اپنی خانہ جنگوں کی بدولت خود زوال کی بستی کو چھونے لگے تھے سوائے تین یا چار افغان گورنروں کو جو جنسی مریض تھے

اور جو جنسی جنون کا شکار تھے۔اور کسی گورنر کو کشمیر کے حالات کی طرف توجہ دینے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ پھر بھی کشمیریوں سے احسن سلوک کیا تھا۔ اس کے برعکس رنجیت سنگھ خود جنسی اُلجھنوں کی وجہ سے جسمانی طور معذور بن چکا تھا اور کشمیر کے سکھ گورنروں نے احمرین آنکھوں اور مرمرین جسموں کی تذلیل سے ایک رقت انگیز ماحول قائم کیا تھا۔ گورنر کنور شیر سنگھ کے زمانے میں بے راہ روی کو کشمیر میں عروج پر پہنچ ادیا تھا۔ چونک میں اخلاقی گراوٹ کی تاریخ نہیں لکھ رہا میں اس موضوع کو ختم کر کے قاری کی توجہ 1841/1846 کے حالت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں ورنہ رنجیت سنگھ 1790 میں پیدا ہوا اور 1839 میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ اپنی زندگی کی 50 واں جنم دن بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ مگر جنسی بے راہ روئیوں کی وجہ سے وہ جسمانی طور مفلوج بن چکا تھا اور انگریز اس کی ذاتی کمزوریوں پر کڑی نگارہ رکھے ہوئے تھے۔ انہیں پنجاب پر تسلط قائم کرنا تھا وہ پنجاب دربار کے حالات کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ چونکہ تاریخ ایک اور کروٹ بدلنے والے تھی۔ سر یہل گرفن نے رنجیت سنگھ کے خلاف انتہائی سخت اور ہتک آمیز لہجہ اختیار کیا ہے اور اظہار کیا کہ رنجیت سنگھ اخلاقی گراوٹ کی زندہ جاوید مثال تھا وہ انتہائی خود غرض، کذب بیاں اور شرابی، اوباش قسم کا انسان تھا۔ اس کی حکمت عملی اس کی عظمت صرف انگریزوں کی وفاداری سے قائم تھی۔ اس وقت کی سکھ سوسائٹی جبر، فراڈ اور لالچی اصولوں پر اپنی اساس قائم کئے ہوئے تھی۔ اور رنجیت سنگھ کی ذاتی اخلاقی بے راہ روی کی وجہ سے اس پر فالج کا دورہ بھی پڑا تھا اور اس کی بینائی بھی کم زور ہوئی تھی۔ ان سب کمیوں کے باوجود وہ سکھ قوم کو متحد کر سکا تھا، لیکن رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد انگریزوں نے سکھ راج کے خاتمے کی ٹھان لی تھی۔ وہ پنجاب پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے ارادوں کو کامیاب بنانے میں مہاراجہ گلاب سنگھ کا ہاتھ

واضح طور پر دکھائی دیتا ہے اور اس طرح پہلی انگریز، سکھ لڑائی 13 دسمبر 1845 کو ہوئی اور پھر دوسری لڑائی 10 فروری 1846 کو ہوئی تھی اور سکھ حکومت کا خاتمہ ہو گیا ۔سر گرفن Sir Lapel Grifins کے مطابق گلاب سنگھ کو سکھوں سے غداری کرنے کا معاوضہ کشمیر کی ریاست حوالے کر کے انجام دیا گیا تھا۔اور اس طرح رنجیت سنگھ کی سکھ حکومت کا خاتمہ نہ صرف پنجاب میں ہوا تھا بلکہ سکھا شاہی کشمیر میں بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچی تھی ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں فرانس کا اثر ختم ہوا تھا اور وہ ہندوستان میں بھی اپنے اردوں کا خیر باد کہہ چکے تھے۔اب انگریزی راج کے دور کا صحیح معنوں میں آغاز ہوا تھا۔

☆☆☆

# کشمیر میں ڈوگرہ شاہی
# کا عروج اور زوال

مجھے دُکھ اس بات کا نہیں کہ انگریزوں نے کشمیر کو قطعہ اراضی تصور کر کے معہ چرند و پرند، عوام اور نباتات فروخت کر دیا تھا، ملکوں کی خرید و فروخت اس وقت کے بین الاقوامی قوانی ن میں بالکل جائز تھی کشمیر کے علاوہ کئی علاقے فروخت بلکہ نیلام کئے گئے تھے۔ مگر مجھے دُکھ اس بات سے کہ بیع نامہ امرتسر تحریر ہوتے وقت گلاب سنگھ نے کشمیر کے عوض اپنی خودداری کا سودا اس انداز میں کیا کہ حیا کے تمام مقام، خطا کی بستیاں بن گئے۔ گورے سوداگروں کے رُوبرو گلاب سنگھ ہاتھ جوڑے ہوئے لرزہ براندام تھا۔ آواز پر رقت طاری تھی۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سانس آہ سرد بن چکی تھی، بے بسی کا عجب عالم تھا۔ چہرے پر وحشت طاری تھی۔ گورے سوداگر یہ نظارہ اپنی عظمت کی بلندیوں کی انتہا تصور کر رہے تھے اور گلاب سنگھ گڑگڑا کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ایک فرد مایۂ دریوزہ گر کی طرح فریاد کر رہا تھا۔ وہ سرکار کا زرخرید غلام ہے اور غلام تھا اور غلام رہے گا۔

ملکوں کی خرید و فروخت کی تاریخ میں اتنی زیادہ بے غیرتی کی مثال تلاش کرنے پر بھی نظر نہیں آتی ہے۔ سید ضمیر جعفری نے کہا ہے:

چمن میں گریۂ شبنم غلط سہی لیکن

## سوال یہ ہے کہ پھولوں کو کیوں ہنسی آئی ؟

سید ضمیر جعفری کو پھولوں کی ہنسی کا جواز نہیں ملا۔ لیکن انگریزوں کے تبسم زیر لب کا جواز تھا وہ گلاب سنگھ کی بے غیرتی کی انتہا دیکھ کر، انگریزی سلطنت کا عروج دیکھ رہے تھے۔ ابھی ہندوستان پر کمپنی راج قائم تھا اور کمپنی انگریزی سوداگروں نے قائم کی تھی اور انگریز سوداگر گلاب سنگھ کی بے بسی دیکھ کر کہہ رہے تھے۔ اپنے کو خوش نصیب جان، وقت مہربان جان تجھ جیسے دریوزہ گر کی اُلجھنیں دیکھ کر ہم تمہیں کشمیر فروخت کرتے ہیں۔ قیمت اقساط میں دے دینا" اور پھر بیعنامہ امرتسر 16 مارچ 1846 کو گلاب سنگھ ڈوگرہ کی غیرت اور حمیت کے خون میں اُنگلیاں ڈبو کر تحریر کیا گیا۔ اس وقت انگریزی سوداگروں کے کانوں میں ٹیپو سلطان کی آواز گونج رہی تھی کہ "ذلت کی ہزار سالہ زندگی سے موت بہتر ہے" اور انگریزوں نے جس خون کو سرنگا پٹنم کے قلعے کی دیواروں میں روکنا چاہا وہ خون صرف دس سال بعد 1857 کے ہنگامہ پر آشوب میں دلی شہر کے کوچہ و بازار کو مزّین کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔ وہ ہر فرقہ، ہر مقام پر بہہ نکلا تھا۔ تاریخ کہتی ہے کہ جب غلامی کا رواج عام تھا اور اس زمانے میں سیاہ فام لوگوں کو غلام بنا کر اُن کی تجارت ہوتی تھی۔ یہ سیاہ فام لوگ افریقہ سے امریکہ منتقل کیے جاتے تھے۔ یہ اپنے مالکوں کے کوڑے سہتے تھے۔ یہ ظلم و جبر کو اپنی تقدیر سمجھتے تھے۔ یہ تڑپتے تھے، بے چین ہوتے تھے۔ ان کا خون کف قاتل پر بھی جم جاتا تھا۔ لیکن یہ کبھی اپنے آقاؤں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر ظلم کی اداؤں کا شکوہ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ گورے ان کے خوف سے خوفزدہ تھے۔ اِن سے الگ رہنا، انقلاب دہر کو ٹالنے کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ لیکن گلاب سنگھ نے انگریزوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر ہندوستان کے سینے پر کمپنی راج کی بنیادیں سنگ و حدید سے مستحکم بنا دی

تھیں اور بے غیرتی کی تمام حدود عبور کرلی تھیں اور گلاب سنگھ کے وارثوں کی زندگی بھی اس طرح انگریزوں کی نظرِ کرم کی محتاج ہوگئی۔ تاریخ کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ جو ہر دور میں ہر زبان میں ہر زمان میں گزری داستانوں کی یاد دلاتی ہے۔ یہ واقع اتنا عبرتناک ہے کہ تاریخ کشمیر بھی اپنے ظلم کی قسمت پر ناز نہیں کرسکتی۔ گلاب سنگھ کی بے غیرتی ہندوستان کی تاریخ کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بن گئی ہے۔ گلاب سنگھ کو کشمیر تو مل گیا ۔مگر ہندوستان کے غرور اور بانکپن کو رسوائیاں ملیں۔ جموں و کشمیر کے عوام کو رسوائیاں ملیں۔ اور وہ روایت ختم ہوگئی۔ جس کے متعلق ساحرلدھیانوی نے کہا:

وہ مسیحا نفس نہیں جس کا

سلسلہ دار تک نہیں پہنچا!

گلاب سنگھ کا حکومت حاصل کرنا ایک کارنامہ نہیں تجارت تھا۔ کشمیری فروخت ہوئے مگر غلام نہیں بنے۔ لیکن گلاب سنگھ انگریزوں کی غلامی کا درخشندہ ستارہ بن کر غلام ہندوستان کے افق پر روشن ہوا۔ یہی گلاب سنگھ کشمیریوں کی کشاکش آزادی کی علامت بن گیا اور کشمیر کی وادی پر آزادی کی تمنا دہکی گھٹا کی طرح چھا گئی۔ اور کشمیر کی رُوحاب شیوہ ماتم کے بجائے نئی راہ کی جانب چل دی اور ناصر کاظمی کی زبان میں:

گئے دنوں کی لاش پر پڑے رہو گے کب تلک

ستم کشو، اُٹھو کہ آفتاب سر پر آگیا!

1847/1846 میں پہلی بغاوت شیخ امام الدین نے اپنی اہلیہ کی ترغیب پر کی۔ جو غضب کی عورت تھی۔ بلند ہمت، ارادے کی پکی اور تقدیر کی قائیل گلاب سنگھ نے جب اپنے سب سے قابل سپہ سالار لکھپت رائے کو فوج لے کر روانہ کیا تو شیخ امام الدین اور پہاڑی راجاؤں نے مل کر ان کا خاتمہ کر دیا۔ لکھپت رائے خود مارا گیا تھا۔

اب انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ گلاب سنگھ کو کشمیر کی وادی کا حکمران مقرر کرنا ان کی حکمت عملی کے لئے اہم ہے اور پھر 5000 انگریز فوجی معہ توپ خانہ راجوری کے درہ سے گزر کر ڈوگرہ فوج کی امداد کو پہنچ چکی تھی ۔ فتح الدین خان نے شیخ امام الدین کو ہتھیار ڈالنے پر آمادہ کیا اور راجہ گلاب سنگھ کرنل رائس صاحب کے ہمراہی میں 9 نومبر 1846 کو سرینگر شہر پر غلبہ حاصل کر سکا تھا۔ لیکن پھر پہاڑی راجوں نے بھمبر، راجوری، کرناہ اور کشتواڑ میں گلاب سنگھ کو لوہے کے چنے چبوائے تھے۔اب گلاب سنگھ نے ظلم، جبر اور بربریت کے تمام معیار توڑ دیئے ۔ کچھ حالات آرتھر برنک میں نے اپنی کتاب The wrong of Kashmir میں نقل کئے ہیں اور کچھ لیفٹ کرنل ٹارنس نے بیان کئے ہیں اور کچھ نائیٹ صاحب کی کتاب Thirty years in Kashmir میں درج ہیں اور کچھ مرزا سیف الدین کی اپریل 1848-38 کی رپورٹ میں درج ہیں اور کچھ دوست محمد شاد کی کتاب جلد نمبر 6 تاریخ احمدیت میں درج ہیں۔ حالات کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کی حکمت عملی نہ تھی کہ مسلمان ریاست میں جان بُوجھ کر اقلیتی راج قائم کیا جائے۔ کشمیر کی وادی میں اٹھانوے فی صد مسلمان تھے۔ جموں کے صوبہ میں 67% مسلمان تھے اور ڈوگرے صرف ایک اقلیت تھے۔ راجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے صرف استدعا کی تھی کہ اس کو صوبہ جموں کا راجہ تسلیم کیا جائے۔ مگر انگریزوں نے اسے کشمیر کا صوبہ خریدنے پر مجبور کیا تھا تا کہ مسلم ریاست میں اقلیتی ہندو راج ہمیشہ غیر مستحکم رہے اور ڈوگرہ راج خستگی کی وہ علامت بنے جو احساس کمتری کا مسلسل شکار رہے اور انگریزوں کی محتاج، انگریز خود زار روس اور حاکمان چین و تبت کو اپنے ہجوم شوق سے خوفزدہ رکھنا چاہتے تھے اس زمانے میں زار روس وسط ایشیاء پر اپنا قبضہ قائم کرنے میں مصروف تھے

۔اور انگریز جانتے تھے کہ ایران اور افغانستان روس کے قریب آسکتے ہیں۔اس طرح گلاب سنگھ جیسے گمنام راجہ کو کشمیر عطا کر، انگریز یہ تصور کرتے تھے کہ کشمیر حاصل کرنا ان کے لئے سعی بے حاصل ثابت ہوگا۔انگریزوں کا شوق بے پایاں انہیں وسط ایشیاء پر قبضہ کرنے کا محرک ثابت ہورہا تھا۔جس کے لئے ان کی حکمت عملی میں ترکی میں مسلم خلافت کا خاتمہ ضروری تھا۔ان کے ارادے اور تھے اور ہندوستانی راجے مہاراجے اور تمام ہندو رعایا چاہتی تھی کہ انگریز ہندوستان میں برائے نام مغل راج کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دیں۔مسلمان نواب اور حکمران اس مقام پر پہنچ چکے تھے کہ:

مقام اپنا سمجھتے ہیں نہ ہم منزل سمجھتے ہیں؟

اور اس ماحول میں ایک کے بعد ایک مسلم نواب اور صوبیدار کا خاتمہ ہورہا تھا۔مغل بادشاہ، بہادر شاہ ظفر اسی برس کی عمر میں پیری کی آخری منزلیں طے کررہا تھا اور اس اُمید پر زندہ تھا کہ ایران سے ایک بار پھر امداد آئے گی اور وہ مغل سلطنت کو نئی رنگین محفل عطا کرسکے۔لیکن ایران کے حالات بدل رہے تھے۔افغانستان کی خانہ جنگوں نے افغانستان کو غیر جانب دار رہنے پر مجبور کردیا تھا اور اب انگریز مغل سلطنت کے خاتمے کے اور اُن کے پندار کے حصار کو مسمار کرنے کی آخری تیاریوں میں مصروف تھے۔اس لئے مہاراجہ گلاب سنگھ کی احساس کمتری نے اسے کشمیر حاصل کرتے ہی ایسے اقدامات پر مجبور کردیا جو ظلم اور جبر کی اساس پر قائم تھے۔اور عوام اور ڈوگروں میں نفرت کی خلیج حاصل ہوگئی اور بقول جوش ملیح آباد:

جس کو کہتے ہیں مروّت سے ہجومِ رحمت
وہ بھی اِک قہر کا عنوان ہے معلوم نہ تھا

ڈوگرہ شاہی کی رحمت بھی کشمیریوں کے لئے قہر بن کر برسی۔اور یہ قہر ڈوگرہ

شاہی کی عمارت گری میں تبدیل ہو گیا۔ ظلم کا رواج قائم ہو گیا چونکہ کشمیریوں میں اب ڈوگروں کے خلاف نفرت کے جذبات گریہ گوشۂ طوفان میں تبدیل ہو گئے تھے اور اب عوام میں ایک کرب بیدار ہونا شروع ہوا تھا۔ جس نے ڈوگروں کو غیر کشمیری بنا دیا۔ اور سینہ بہ سینہ یہ نفرت آہستہ آہستہ باقاعدہ طور پر پھیلتی رہی۔ اور لوگوں کو احساس ہوا:

"اتنی ارزاں تو نہ تھی درد کی دولت پہلے
جس طرف جائیے زخموں کے لگے ہیں بازار!

اور کشمیر زخموں کا بازار بن گیا تھا۔

کشمیر میں ڈوگرہ راج کو سمجھنے کے لئے ہمیں ہندوستان میں انگریزوں کی حکمت عملی کا سرسری جائزہ لینا ہوگا ورنہ ہم کشمیر کے حالات کا جو ہندوستان کے حالات سے ربط ہے کو سمجھ نہیں سکتے اور میں کچھ کہنے سے پہلے مرزا محمد رفیع سودا کے الفاظ میں کہوں گا:

اے ساکنانِ کُنجِ قفس! صُبح کو صبا
سنتی ہی جائے گی سوئے گلزار، کچھ کہو!

چونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہم کشمیری آج بھی "ساکنانِ کنجِ قفس" ہی ہیں اور اس لئے:

گر فکرِ زخم کی تو خطا کار ہیں کہ ہم
کیوں کہ محو مدحِ خوبیٔ تیغ ادا نہ تھے

اور اب میں انگریزوں کی خوبیٔ تیغ ادا کا کچھ ذکر کروں گا جس نے مسلمان نوابوں اور شاہوں کو ہندوستان میں گدا نما بنا دیا تھا اور یہ دریوزہ گر کشکول گدائی لئے انگریزوں کے سامنے دستِ سوال دراز کیئے ہوئے تھے اور پھر مسلمان شاہوں پر وہ

دور آیا کہ:

جن کی ہیبت سے دُنیا لرزتی رہی
آج جن پر آنسو بہانے کو کوئی نہ تھا!

اور 1857 کے ہنگامے تک سارا ہندوستان جنگاہ عدل وستم بن گیا تھا۔ انگریزوں کے سیاسی مقاصد کیا تھے؟ یہ ایک دقیق بحث طلب سوال ہے۔ کچھ باتیں واضح ہیں جن کا اختصار سے جایزہ لیا جا سکتا ہے۔

اس زمانے میں انگریزی حکمت عملی کے بنیادی اصول اس جذبے پر قائم ہوئے:

مجھے کائنات کی سروری
مجھے دولت دو جہاں ملے!

انگریز ہندوستان کی ہندو رعایا کے ایما پر ہندوستان آئے اور ان کی اعانت سے وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں برائے نما مغل راج غارت کر دیا جائے، اس لئے پنجاب میں سکھ حکومت کے خاتمے پر انگریزوں کے سب سے زیادہ وفادار اور حامی پنجاب کے سکھ اور جموں کے ڈوگرے تھے۔ دوم وہ خلافت کا خاتمہ چاہتے تھے اس لئے وہ افغانستان اور ایران پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر افغانستان کے ساتھ پہلی اور دوسری جنگ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ افغانستان پر قبضہ رکھنا آسان نہیں۔ البتہ شمالی مغربی صوبہ سرحد کے علاقے میں وہ افغانوں کو آمادہ کر سکے کہ پشاور اور صوبہ سرحد کا اہتمام کرنے کے لئے ان علاقوں کو سلطنت کا علاقہ تصور کریں۔ انگریز 1846 میں چاہتے تھے کہ غدر ہونے والا ہے اس لئے اُنہوں نے اس سے قبل ہی ایران پر حملہ کر کے بوشہر کے علاقے پر 1856 میں قبضہ کر لیا تھا اور ایران کو مجبور کیا کہ

وہ افغانستان میں ہرات کا علاقہ خالی کر دے۔اس کے معاوضہ میں شاہ دوست محمد نے انگریزوں کو کسی بھی ہندوستانی کو جدوجہد کی صورت میں غیر جانبدار رہنے کا یقین دلایا تھا۔اور جب 1857 میں غدر ہوا تو نہ تو دوست محمد خان اور نہ ہی ایران نے کوئی امداد بہادر شاہ ظفر کو دی تھی۔اور اس طرح انگریزوں نے سکھوں اور ڈوگروں کی امداد سے بغاوت کو کچل دیا۔غدر کے زمانے میں مہاراجہ رنبیر سنگھ ایک کثیر ڈوگرہ فوج کے ہمراہ دلی گیا اور پٹیالہ کے راجہ کی سکھ فوج کے ہمراہ انگریزوں کی امداد کی۔دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ظلم وقہر کا عالم برپا کیا۔جب غدر فرد ہوا تو 60,000 مسلمانوں کو درختوں سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔بہادر شاہ ظفر کے فرزندوں کو اُس کی نگاہوں کے سامنے گولی ماردی گئی تھی اور بہادر شاہ کو رنگون ایک قیدی بنا کر بھیج دیا گیا۔جہاں اُس نے وفات پائی اور مدفن ہے۔

غدر ختم ہونے کے بعد کمپنی راج ختم ہو گیا اور ہندوستان پر صحیح معنوں میں انگریزی راج قائم ہوا تھا۔ پروفیسر مجیب ''انڈین مسلم' میں کہتے ہیں کہ ''غدر کے خاتمے کے بعد انگریزوں نے اپنے ارادوں کا برملا اعلان کیا کہ وہ مسلمانوں کے تمام اُن عناصر کو جو ان کے مخالف ہوں گے کچل کر رکھ دیں گے'' اسی پالیسی کے تحت ہندوستان کے مسلمانوں پر اعتماد نہ کیا گیا اور انتظامیہ چلانے کے لئے اونچی ذات کے ہندوؤں کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ہندو طبقے کو اسے قریب لانے کے لئے تعلیم جدید سے آراستہ کرنے کے لئے تعلیمی ادارے قائم کئے گئے۔رنبیر سنگھ کو اس کی خدمت کے لئے خود ملکہ وکٹوریہ نے ایک توصیفی سند عطا کی تھی اور اسے اعزازی طور پر میجر جنرل کا خطاب عطا کیا گیا اور کھلی اجازت دے دی کہ وہ کشمیری مسلمانوں کو دبانے کے لئے وہ تمام حربے استعمال کرے جنہیں وہ جائز تصور کرتا ہے۔ یہ

سن 1862 کا واقع ہے۔ گلاب سنگھ جو سخت علیل تھا 1859 میں وفات پا گیا اب رنبیر سنگھ تخت پر متمکن ہوا انگریزوں نے ایسے Most Exalted Star of India کے القاب سے نوازا اور اس کو 21 توپوں کی سلامی کا حقدار تصور کیا اور پھر مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ڈوگروں کو کشمیر میں ظلم اور جبر کرنے کی کُھلی چھوٹ دے دی تھی۔ کھیت اور کھلیان ویران ہو چکے تھے۔ لوگوں سے جبراً مالیہ وصول کیا جاتا تھا۔ ہزاروں خاندان فاقہ کشی کا شکار ہو گئے تھے۔ لوگوں کو وحشیانہ سزائیں دی جانے لگیں۔ لوگوں سے بیگار لیا۔ ظلم حکومت کی نئی پالیسی کا جز تھا۔ تجارت تقریباً اب ختم ہو چکی تھی۔ ہمیں ان واقعات کا پتہ لیفٹیننٹ کرنل تھارپ کی تحریروں سے ملتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہزاروں لوگ کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب میں مقیم ہو گئے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ رنبیر سنگھ نے حُکم جاری کیا کہ جو کشمیری پنجاب جائے گا وہ واپس کشمیر میں آ کر سکونت اختیار نہیں کر سکتا۔ تفصیلات محمد یوسف صراف کی کتاب ہسٹری آف کشمیر میں دی گئی ہیں۔ 1858 سے 1878 تک انگریزوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کیا تھا اور کشمیر میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے انتہائی ظالمانہ! لیکن 1878 کے بعد ایشیا میں کچھ ایسے حالات نے کروٹ لی کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت بچانے کے لئے مسلمانوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اب وہ کشمیر میں بھی کچھ اصلاحات کی طرف متوجہ ہونا چاہتے تھے۔ اب وہ کشمیر کے حالات کی طرف چشم پوشی کا رویۂ اختیار نہیں کر سکتے تھے۔ اس بات کی تصدیق اس مکتوب سے ملتی ہے جو لارڈ رپن نے 1884 میں سیکریٹری آف سٹیٹ کو لکھا تھا۔ لارڈ رپن نے اپنے مکتوب میں تحریر کیا:

"ہم انگریزوں نے قبل ازیں کوئی کاروائی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم یہ

سمجھتے رہے کہ ہمیں مناسب موقعہ ملے گا جب نیا حکمران حکومت کا وارث بنے گا اور ہمیں محسوس ہوا کہ اس معاملہ کو زیادہ دیر تک ٹالا نہیں جا سکتا ہے اور جب تبدیلی حکومت کا وقت آئے گا ہم اسے اپنا فرض منصبی سمجھیں گے کہ ہم نئی کشمیر گورنمنٹ پر یہ واضح کر دیں کے اس کے کچھ فرائض اس کی اپنی رعایا کے لئے بھی ہیں اور اس لئے اسے چاہیے کہ ضروری اصلاحات کی طرف متوجہ ہو جائے"

اس طرح مہاراجہ رنبیر سنگھ کا زمانہ۔ ہجوم یاس اور مایوسی، بربادی اور تباہی۔ افلاس اور فاقہ کشی۔ وُفور درد اور تلخیٔ حیات کی طویل رات کا زمانہ ہے جب کشمیری گھرانے جن سے ممکن ہوسکا پنجاب چلے گئے اور پنجابی کلچر میں مدغم ہو گئے تھے۔ یہ زمانہ انقلاب کا زمانہ تھا 1885 A.D میں پرتاب سنگھ گدی نشین ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی راج کا سورج نصف انہار پر روشن تھا۔ انگریزی مملکت پھیل گئی تھی۔ برما اور انڈونیشا انگریزوں کے حلقۂ اثر میں آچکے تھے۔ یورپ میں فرانس تباہی کے بعد ایک نئے انقلاب سے گزر رہا تھا۔ انگلستان میں صنعتی انقلاب وقوع پذیر ہوا تھا۔ ترکی اب یورپ کا مریض کہلاتا تھا۔ ہندوستان میں سید احمد شہید کی بغاوت کے بعد جمال الدین افغانی نے اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا تھا۔ اس لئے انگریز سمجھ گئے تھے کہ مسلمانوں میں اسلامی تصور کی نفی صرف قومیت کے تصور سے ممکن ہے اور قومی نظریہ اگر مسلمانوں میں بیدار ہو جائے تو خلافت ٹکرے ٹکرے ہو کر فضاؤں میں بکھر جائے گی۔ قومیت، جمہوری قبا اوڑھ کر مسلمانوں کی نگاہوں کو خیرہ کر سکتی ہے اور پھر جمال الدین افغانی کا خواب کبھی مکمل نہ ہو سکے گا کسی نے کیا خوب کہا ہے:

"بے خواب کر گیا مجھے تعبیر کے لئے
اک خواب جو ہوا نہ مکمل کسی طرح"

اس لئے اسی زمانے میں سر سید احمد خان کی پذیرائی کی گئی اور اورنیٹل کالج کا قیام عمل میں آچکا تھا تا کہ مسلمان امراء کے بچے انگریزی تعلیم حاصل کر سکیں اور جدیدیت Modernism سے آشنائی حاصل کر سکیں۔ انگریز اسلام کے احیا سے اس قدر خوفزدہ تھے کہ اب وہ مسلمانوں کی ہندوستان میں خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سر سید احمد خان کے فرزندار جمند کو الہٰ آباد ہائیکورٹ کا جج مقرر کیا گیا تھا۔ سید محمود ایک انتہائی قابل شخص تھے مگر اُن کی سرفرازی کا مدعا مسلمانوں کو جتلانا تھا کہ اب انگریز اُن کے خیر خواہ ہیں اور مسلمان مغرب زدہ دانشور کہہ رہے تھے۔

آئے جو ہے کمین میں کہیں رہزن بہار
گلشن میں رخشِ گل کی عناں ہم نے چھوڑ دی

اس لئے ہندوستانی مسلمان اب نئی تعلیم سے آراستہ ہو رہے تھے:

گمان بھی کر نہ سکے تھے سحر کے متوالے
سحر قریب ہے ضیا کھا گئی تو کیا ہو گا؟

لیکن انگریزوں کی حکمت عملی کا ایک پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں میں قومیت کا نظریہ جمانا تب ہی ممکن ہو گا جب ہندو فرقے میں قومیت کا تصور اُجاگر کیا جائے تا کہ ہندو قومیت اور مسلمان قومیت ایسے بچھڑیں کہ بس خوابوں میں ہی ملیں۔ اس لئے اسی زمانے میں ایک انگریز نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے نام سے ایک جماعت قائم کی جس میں سب ہی سوائے ایک مسلمان کے اونچی ذات کے ہندو تھے۔ اور جو چاہتے تھے کہ ہندو قومیت، مسلم کلچر، زبان اور رسم الخط کی قتل گاہوں پر ہی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ اسی زمانے میں رسم الخط کے سوال پر سر سید احمد خان نے بہت سے مضامین لکھے اور مسلمانوں کو ایک الگ قوم قبول کرنے پر استدلال کیا تھا۔ اس لئے اب انگریز کشمیر کی

مسلم ریاست میں بھی مسلمانوں کے حق میں کچھ اصلاحات کے متقاضی تھے۔
رابررٹ تھارپ نے کشمیری مسلمانوں کی حالتِ زار کی نسبت مضامین لکھنے کا سلسلہ
جاری کیا تھا۔ اِن حالات میں پرتاب سنگھ گدی نشین ہوا تھا وہ جانتے تھے کہ اُس کا اپنا
چھوٹا برادر امر سنگھ اس کا جانی دشمن بن چکا ہے اور ہندوستان کے اخبارات میں پرتاپ
سنگھ حکومت کی ناقص کارکردگی اب ایک باقاعدہ موضوعِ بحث بن گئی۔ مہاراجہ پرتاب
سنگھ کشمیری پنڈتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا تھا۔ اس لئے 1885 میں ہی انگریزوں
نے کشمیر میں باقاعدہ رزیڈنٹ مقرر کیا تھا۔ جو حکومت کشمیر پر نگاہ رکھنے کے علاوہ
حکومتِ ہندوستان کو کشمیر کے حالات سے آگاہ کرنے کے لئے مقرر کردیا گیا تھا۔
اسلئے پرتاب سنگھ ایک بے بس اور مجبور راجہ تھا۔ 1889 کا سال پرتاب سنگھ کے لئے
قہر بن کر نازل ہوا۔ پرتاب سنگھ پر الزام لگایا گیا کہ اس نے زار روس کے ساتھ سازش
کرنے کی سعی کی ہے۔ تیس درجن خطوط جو پرتاب سنگھ نے زارِ روس کو تحریر کئے تھے،
ٹربیون اخبار کے مدیر نے پیش کئے۔ راجہ امر سنگھے نے گواہی دی کہ دستخط کی شناخت
وہ کرسکتا ہے۔ اور اس کی شناخت کے مطابق یہ خطوط پرتاب سنگھ کے قلمی تھے۔ اس
لئے پرتاب سنگھ کو معزول کر کے ایک کونسل راجہ امر سنگھ کی سربراہی میں قائم کی گئی تھی۔
جو حکومتِ کشمیر کا نظم و نسق چلا رہی تھی۔ لیکن رزیڈنٹ کے احکاموں کے تحت کشمیر میں
تمام محکمہٗ جات کے سربراہ یا تو انگریز یا ہندوستان سے لائے ہوئے ہندو افسر ہوا
کرتے تھے۔ اس طرح انتظامیہ پر سے ڈوگرہ تسلط آہستہ آہستہ کم کرنے کی پالیسی پر
عمل شروع ہوا۔ اور مہاراجہ کوئی بھی قدم انتظامیہ کی نسبت ریذیڈنٹ کی مرضی کو نظر
انداز کر کے لینا جائز ہی نہیں سمجھتا تھا۔ 1905 میں مہاراجہ پرتاب سنگھ کو اپنی بے گناہی
ثابت کرنے کے بعد گدی پر بحال کیا گیا۔ اس دوران کشمیر میں زرعی اصلاحات لانے

کے لئے ایک انگریز آفیسر سر والٹر لارنس کو مقرر کیا گیا۔ جس نے زمین کی جدید پیمائش عکسِ لٹھا کے طور پر درج کی اور زمین کی آمدن کا ازسرِ نو تخمینہ لگایا ہے۔ سر والٹر لارنس اپنی کتاب کشمیر کی تاریخ کے لئے بہت مشہور ہیں اور اس نے جدید طرز پر زرعی اصلاحات نافذ کئے تھے۔ اتنا ہی نہیں اب باقاعدہ اصلاحات کا دُور شروع ہوا چونکہ اب پنجاب اور ہندوستان کی مسلم تنظیمیں کشمیر کے حالات کی طرف متوجہ ہونا شروع ہوئیں تھیں۔ 1910 میں مہاراجہ کو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے ایک یاداش کشمیری مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح کی نسبت پیش کی تھی۔ اس لئے مسٹر شارپ جو ایک انگریزی آفیسر تھا کشمیری مسلمانوں کے تعلیمی اصلاحات کا جائزہ لینے کے لئے مقرر کیا گیا تھا جس نے A.D 1916 میں ایک تحریری رپورٹ پیش کی تھی۔ لیکن مہاراجہ اس معاملے میں لیت ولعل سے کام لے رہا تھا لیکن اب مہاراجہ کی بدقسمتی تھی کہ پنجاب کی مسلم تنظیمیں اور اخبار، کشمیر کے مسلمانوں کی حالتِ زار کا نقشہ من وعن کھینچ رہے تھے۔ اور مہاراجہ محسوس کر رہا تھا:

"موسم بدل گیا، تیرے لازلہ زار کا"

زرعی اور تعلیمی اصلاحات کے ساتھ ساتھ اب کشمیری قومیت ایک نیا روپ لے رہی تھی۔ پنجاب کے مسلمان جن میں بہت سے کشمیری نژاد تھے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے لئے دردِ جگر ہی نہیں بلکہ دردِ سر بن چکے تھے۔ حالات کا یہ رُخ دیکھ کر کشمیری پنڈت خوفزدہ تھے اور پرتاب سنگھ کو غلط مشورہ دیتے رہتے تھے۔ 1906 میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ کانگریس اور لیگ دو مختلف نظریات کی علم بردار تھیں۔ انگریز اب کشمیر میں جو بھی اصلاحات کر رہے تھے۔ اُن کی محرک ہندوستان میں مسلم اور ہندو قومیت کے وجود سے متاثر ہو رہا تھا اور ہندوستانی یاست میں بے یقینی

کا ایک ماحول قائم ہو چکا تھا جس کی نسبت احمد ندیم قاسمی کا یہ شعر صادق آتا ہے:

''سورج اُبھرا ہے کہ گہنایا ہے
یا فقط لہو سے ہوئی دھرتی گلنار!

پنجابی مسلمانوں کی کشمیر میں دلچسپی اب جموں کے مسلمانوں کو متحرک کر رہی تھیں جو کلچر کے لحاظ سے اپنے آپ کو اُن کے قریب تر تصور کرتے تھے۔ اور کہہ رہے تھے:

''ہے شامِ فراق سخت تاریک
اس شام کو اب سحر کریں گے''

جموں کے مسلمان سمجھتے تھے کہ اُن کا فراق پنجاب کے مسلمانوں سے ممکن ہی نہیں تھا۔ اس لئے کشمیری قومیت اور جموں کے مسلمانوں کے عزائم الگ الگ راہوں پر گامزن ہو چکے تھے۔ صرف اور آئندہ ایک مقصد کے لئے ایک نظریہ رکھ سکتے تھے کہ وہ دونوں صرف اس حد تک متحد ہوں تا کہ کشمیر میں شخصی راج کا خاتمہ ہو سکے۔ دونوں قوموں میں یکسانیت صرف رسمی تھی ورنہ بقولِ غالب:

''وہ آج بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہہ و اختر کھُلا!''

انگریزوں کی پالیسی کے خدو خال سمجھنے کے لئے ہم دیکھتے ہیں کہ 1905 میں تقسیم بنگال کو اپنایا گیا تو ہندو قومیت میں ایک ہنگامہ کا مرحلہ آ گیا۔ بنگال کے اخبارات نے کشمیر میں ہندو راج کے دفاع کے لئے کئی مضامین تحریر کئے۔ 1906 میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام وجود میں آیا۔ 1910 میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس وجود میں آ چکی تھی اور سیاسی بیداری کے نئے دور کا آغاز ہوا

تھا A.D1914 میں جنگ عظیم اول کا آغاز ہو چکا تھا۔ ترکی کے خلاف جنگ جاری تھی۔ جرمنی نئی طاقت بن کر اُبھرا تھا۔ اسرائیل کی ریاست کو وجود میں لانے کا منصوبہ بھی تشکیل دیا جا چکا تھا۔ اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا ضروری بن گیا تھا۔ ہندوستان کے پچانوے فی صد آبادی غیر مسلم تھی۔ مسلمان صرف %5 تھے۔ 1857 کے بعد انگریزوں کی حکمت عملی یہ تھی کہ مسلم اکثریتی علاقوں یعنی صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان اور آجکل کا بنگلہ دیش جو اُس وقت مسلم بنگال کہلاتا تھا کو تعلیم زرعی اصلاحات اور انڈسٹری سے بالکل محروم رکھا جائے وہاں ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دی جائیں بلکہ ترقی معکوس کا آغاز کیا جائے۔ البتہ پنجاب، یوپی اور بہار کے مسلمانوں کی طرف توجہ دی جائے چونکہ ان مخصوص مسلمان علاقہ جات میں ہندو مسلمان آبادی ایک مخلوط حالت میں موجود تھی۔ چونکہ کئی لاکھ کشمیری خاندانوں نے پنجاب میں سکونت اختیار کی تھی۔ وہ پنجابی کلچر میں مدغم ہو چکے تھے۔ انگریزوں نے کشمیر کی جانب خاص توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ چیف کورٹ کا قیام اس بات کا اعلان تھا کہ کشمیر میں پنجاب کے طرز پر انتظامیہ قائم کی جائے گی اور پنجاب کے قوانین کے طرز پر کشمیر میں قوانین نافذ کئے جائیں گے ابھی حکومت برطانیہ براہِ راست کشمیر کو برٹش انڈیا میں مدغم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا ثبوت 1896 میں منی ہاؤ آف مانزمین مسٹر ڈگبی اور براڈلا کی تقاریر سے ملتا ہے جو اس نظریہ کی نفی کر رہے تھے۔ ولیئم ڈگبی کی کتاب " Condemned Unheard ایک اہم تاریخی دستاویز ہے۔ 1913 میں لیگ کانگریس مفاہمت کا آغاز ہوا تھا اور 1915 میں برٹش انڈیا میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1915 میں نافذ کر دیا گیا تھا۔ A.D1918 میں جنگ عظیم دوم کا خاتمہ ہوا تھا اور 1919 میں

جلیہ والا باغ کا قتل عام کانگریس کے احیائے نو کا محرک ثابت ہوا تھا۔ اس لئے 1905 میں مہاراجہ پرتاب سنگھ کو جب بحال کیا گیا تو اس پر دو شرطیں عائد کی گئیں:

(۱) یعنی کشمیر کا وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کا رزیڈنٹ کے مشورے سے قائم کی جائیں گی۔

(۲) مہاراجہ کی حکومت کا بجٹ رزیڈنٹ کے مشورے سے مرتب ہوگا۔ کشمیر کے نظم و نسق کے سلسلے میں کشمیری نہیں بلکہ پنجاب سے آفیسر مشعار لئے گئے اور مسٹر شارپ کی رپورٹ کے بعد کشمیری مسلمانوں پر تعلیم حاصل کرنے کے مواقع فراہم ہوئے اور مسٹر شارب نے 1100 مڈل سکول قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ سکول قائم کئے گئے، مگر اُن میں چھیانوے فی صد طلبہ کشمیری پنڈت فرقے سے تعلق رکھتے تھے حتیٰ کہ کشمیری پنڈتوں کی کل آبادی کشمیر کی وادی میں دو لاکھ سے زیادہ نہ تھی اور نوے فیصد پنڈت سرکاری ملازمت اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ 1921 میں ڈاکٹر سر محمد اقبال نے کشمیر کا دورہ کیا اور یہاں کے حالات کا جائزہ لیا تھا اور اپنی شہرہ آفاق نظم ''ساقی نامہ'' انہوں نے نشاط باغ میں موزون کی تھی۔ سر محمد اقبال نے واپس لاہور جا کر پیش گوئی کی تھی کہ کشمیر میں ایک بہت بڑا سیاسی انقلاب ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ ''ملفوظات اقبال'' میں تمام احوال درج ہیں۔ مجھے اس سے دوہرانے کی ضرورت نہیں کہ A.D 1922 میں اقبال کو نائیٹ یعنی سرکاری خطاب عطا کیا گیا تھا۔ A.D 1922 کے بعد اقبال کی شاعری پر اسلامیات کا عنصر غالب دکھائی دیتا ہے اور 1913 میں ٹیگور کو نوبل انعام دیا گیا۔ مگر اقبال کا نام آیا تو انہیں اسلام کی احیائے نو کا شاعر کہہ کر اُن کا نام حذف کر دیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں لیگ ایک اہم مسلم جماعت کے طور

پر اُبھری تھی۔ اور 1921 میں ہندوستان کے مسلمان خلافت کے سوال پر متحد ہوئے تھے۔ کانگریس نے گاندھی جی کی قیادت میں خلافت کے سوال پر مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا اور ہندوستان کے مسلمان احیائے اسلام کے نام پر متحد ہو رہے تھے۔ میں نے ان واقعات کا تفصیل سے تذکرہ اپنی کتاب "Kashmir Eniqura Entauqled Stand" میں کیا ہے۔ چونکہ ان حالات کو دیکھ کر انگریز کشمیر میں "لیبرل اسلام" کا احیا چاہتے تھے۔ یعنی وہ ترقی پسند اسلام جو اسلام کے بنیادی اصلوں پر زیادہ توجہ نہ دے تا کہ اسلام ازم کی نفی ہو سکے اور کشمیر کی جانب سے یہ خطرہ ٹل سکے۔ اس پالیسی کے تحت A.D 1922 میں بانہال کاٹ روڈ تعمیر کیا گیا اور جہلم ویلی روڈ کو بہت بہتر بنایا گیا۔ پنجاب میں ایک جماعت کشمیر مسلم کانفرنس وجود میں آچکی تھی اور اگر ہم خفیہ فائیل کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ 14 جون 1918ء کو سیکریٹری کشمیر مسلم کانفرنس سنٹرل اسٹیڈنگ کمیٹی نے مہاراجہ دربار کے نام خط تحریر کیا تھا کہ پتھر مسجد کو کشمیری مسلمانوں کے حوالے کیا جائے۔ اس سے قبل 1910 میں ہی کچھ کشمیر میں مقیم پنجابی کتھریوں کے ٹولہ نے مہاراجہ کو خط تحریر کیا تھا کہ کشمیری مسلمان متحد ہو رہے ہیں۔ جو اُن کے لئے خطرہ کا باعث ہو سکتے ہیں اور پھر پنجاب میں شدھی تحریک زور پکڑتی جا رہی تھی۔ اس لئے 1923 میں جمعۃ الوداع کے دن 20,000 ہزار کے مجمع میں میر واعظ نے کشمیری مسلمانوں کو اس خطرہ سے آگاہ کیا تھا۔ یہ تمام واقعات میں نے اجمالی طور پر اس لئے بیان کئے ہیں کہ اب ہندوستان کے حالات مسلمانوں کی تنظیم نو کے لئے بہار رُوئے خندان ثابت ہو رہے تھے۔ تو کشمیر میں کشمیری مسلمانوں کا متحد ہونا اس تاریخی تسلسل کا منطقی نتیجہ ہونا تھا۔ انگریز صرف اس بات میں دلچسپی لے رہے تھے کہ کشمیر میں اسلام کا اب "سیکولر اسلام"

ہونہ کہ خالص وہابی طرز کا بنیادی اسلام۔ چونکہ انگریزی چاہتے تھے کہ 1924 میں خلافت کا خاتمہ کرنے کے بعد اور وسط ایشیاء کے مسلم ممالک ترکی کی خلافت سے چھین لینے کے بعد قومیت کی بنیاد پر مسلم ریاستیں قائم کرنے کے بعد وہ صرف نوآبادی نظام کو قائم کر سکتے ہیں۔ جو ان کی سلطنت کے خلاف مزاحمتوں کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ 1918ء میں روس کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا تھا اور روس، چین میں بالشیویک انقلاب کا آغاز ہو گیا تھا اور انگریزوں کا یہ حال تھا:

"تمام دفتر حکمت اُلٹ گیا ہوں میں
مگر کھلا نہ ابھی تک کہاں ہوں، کیاں ہوں میں!"

اس لئے کشمیر میں ایک خاص منصوبہ کے تحت کشمیری پنڈتوں نے یہ راگ الاپنا شروع کر دیا کہ زبان کی بناء پر، کلچر کے تقاضوں کے تحت کشمیری پنڈت اور مسلمان ایک ہیں۔ ان کا مفاد اس میں ہے کہ وہ پنجابی مسلمانوں کو جو کشمیری نژاد ہیں مگر پنجاب میں مدغم ہو گئے ہیں، جو آسودہ حال ہیں۔ تعلیم سے آراستہ ہیں۔ معاشی طور خوشحال ہیں، مگر اب پنجابی زبان بولتے ہیں ان کو واپس کشمیر آنے سے اور از سر نو کشمیر میں آباد ہونے سے روکا جانا ضروری ہے۔ ورنہ کشمیری بولنے والے مسلمانوں کی ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں گی اور تمام عہدوں پر پنجابی مسلمان فائز ہو جائیں گے اور تمام تجارت پر یہ طبقہ غلبت حاصل کرے گا اور اس طرح اس زمانے میں کشمیری پنڈتوں نے کشمیری پنجابی سوال کو اظہار تمنا کا ذریعہ بنایا۔ یہ حکمت عملی رزیڈنٹ بہادر کی وضعداری اور التفات بلکہ نظرِ کرم کی بدولت ارتقا پا رہی تھی۔ اس لئے افغانوں اور ڈوگروں کے مظالم پنجابی مسلمانوں کے سر تھونپ دیئے گئے۔ ڈوگرے جو کشمیری مسلمانوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے متعصب ہونے سے بچ گئے اور کشمیری نفرت

کی آگ اب پنجاب کے مسلمانوں کی طرف پھیلنا شروع ہوگئی تھی۔ یہ پنجابی مسلمان ملتان یا پنجاب کے وہ علاقے جو سرائیکی زبان بولتے ہیں کی طرف نہ تھی۔ بلکہ یہ نفرت اُن کے لئے تھی جو خالص کشمیری نژاد تھے۔ جو کشمیری رسم و رواج اپناتے تھے۔ جو راولپنڈی اور لاہور میں مقیم تھے اور اس طرح کشمیر کی سیاست میں ایک ایسا مقام آیا:

"راز کہے یہ کسی اہلِ وفا کے سامنے
آشنا گم ہوگیا، اک آشنا کے سامنے!"

اور جموں کے مسلمانوں کو پنجابی مسلمان سمجھا جانے لگا اور اس طرح نفرت کی آگ کے ہنگامے جموں اور کشمیر کے صوبوں کے درمیان ایک خلیج بن گئے تھے۔ کشمیری پنڈتوں نے کشمیری مسلمانوں میں احساس کمتری کا ذمہ وار پنجاب کے مسلمانوں کو قرار دیا تھا اور کشمیری پنڈتوں کی سیاست اس بات پر مرکوز تھی:

دل اپنی ہزیمت کو تو اب بھول چلا ہے
ہاں دوست تری فتح وظفر یاد رہے گی!

اور دوست جس سے وہ اس پالیسی کی بناء پر اب تجدید کر رہے تھے کشمیری بولنے والے وہ مسلمان تھے جو اپنے آپ کو ناز پرورده محرومی اور حرمان تصور کرتے تھے اور اپنی زیان کا باعث ڈوگروں سے زیادہ پنجابی مسلمانوں کو سمجھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان ہی کی وجہ سے زندگی دشوار سے دشوار تر ہوتی جارہی ہے۔ اس طرح کشمیری قومیت کو زبان کی بنیاد پر آرزومندی کا ایک جز بنا دیا گیا تھا۔ بقولِ غلام ربانی تابان:

دلیلوں میں اُلجھ کر رہ گئی تھی عقل بے چاری
غضب ہوتا اگر دل بھی ہلاکِ آگہی ہوتا!

مگر کشمیری طبقے کا دل آگہی سے نہیں بلکہ جذبات کی شدت سے مجروح

ہو چکا تھا۔ اور جذبات کا "شور ہائے ہو" اس قدر بلند تھا کہ دل اور عقل ایک دوسرے کی زبان ہی نہ سن سکتے تھے اور مورد الزام وہ لوگ تھے جو کشمیر سے کسمپرسی کی حالت میں سکھا شاہی کے دور میں پنجاب ہجرت کر گئے تھے اور واپس وطن آنا چاہتے تھے اور کشمیری مسلمانوں کی مخالفت کو دیکھ کر صرف یہ کہہ سکتے تھے:

ہم اور دوست کی نامہربانیوں کا گلہ

جنون کا اک غلط انداز گفتگو کہیے

کشمیر کا سارا غصہ پنجاب کی طرف منتقل کر دیا گیا تھا۔

اس طرح رزیڈنٹ بہادر کی خوشنودی حاصل کرنے کے بعد 1927 میں سٹیٹ سبجکٹ کا قانون نافذ کر دیا گیا۔ 1925 میں مہاراجہ پرتاب سنگھ بلا اولاد فوت ہوا اور مہاراجہ ہری سنگھ تخت نشین ہوا تھا۔ 1926 میں مہاراجہ ہری سنگھ کی رسم تاج پوشی کا جشن منایا گیا اور اس قوت عالم یہ تھا:

بجلیوں سے سازش بھی کر رہا ہے باغبان

ہم چمن والوں کو حکم آشیاں بندی بھی ہے

پہلا کام جو ہری سنگھ نے انجام دیا وہ جنوری 1927 میں سٹیٹ سبجکٹ کی تعریف مقرر کرنے دی تھی ۔ اس رُو سے تمام مسلمان خاندان جو کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب میں رہائش پذیر ہوئے تھے اب واپس کشمیر میں نہ تو آباد ہو سکتے تھے اور نہ ہی جائیداد غیر منقولہ کے مالک ہو سکتے تھے۔ یہ غیر منقولہ جائیداد خرید سکتے تھے۔ نہ کشمیر میں ملازمت کرنے کے اہل تھے۔ سٹیٹ سبجکٹ کی تعریف سر برجور دلال نے اپنی رپورٹ جس پر دو اور ہائیکورٹ جج صاحب کے دستخط ثبت ہیں 24 ستمبر 1931 کو دوہرائی۔ دلال کمیٹی نے اس تشریح کو تسلیم کیا تھا۔ اس سے

جموں کے مسلمان انتہائی برہم ہوئے تھے اور چوہدری غلام عباس نے دلال کمیٹی کی سفارشات کو تابوت پر رکھ کر نظر آتش کر دیا تھا۔

سٹیٹ سجبکٹ کا قانون 1927 میں رائج ہوا تھا اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب جموں کی مسلمان آبادی یہ سمجھنے لگی کہ سلاسل میں ہیں۔ (زندان بھی ہیں۔ دیوانوں کی راہوں میں) اور مسلمانوں کی بے اطمینانی اب نیا رنگ لانے لگی تھی۔ اس کو اس پس منظر میں سمجھنا ضروری ہے یہ سب کچھ رزیڈنٹ کی رضا حاصل کر کے انجام پذیر ہو رہا تھا۔ اور اس کا تعلق ہندوستان کے سیاسی حالات سے تھا۔ اس لئے جموں و اور کشمیر میں نفرت کی خلیج حائل کر دی گئی تھی۔ 1919 میں ہندوستان میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ کر دیا گیا اور صرف دس سال کے عصہ میں لارڈ ارون نے Dominium کا تصور پیش کیا تھا۔ اور اس طرح 1919 کے ایکٹ کے بعد ہندوستان میں جمہوریت کا آغاز کر دیا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مہاتما گاندھی کی حمایت کرنے کے لئے امریکہ میں اعلانیہ یہودی دانشوروں کا ایک طبقہ سرگرم عمل تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ کے دانشور اُس وقت مہاتما گاندھی کے سرگرم حمایتی کیوں بن گئے تھے؟ امریکہ کے انتہائی خوشگوار تعلقات حکومت برطانیہ سے تھے لیکن وہ لوگ گاندھی جی کی کُھلم کُھلا اعانت کر رہے تھے اور 1919 میں ہی پہلی بار گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک کا نظریہ پیش کیا تھا۔ ہندوستانی اخبارات کو کنٹرول کرنے کے لئے جب رولٹ ایکٹ نافذ کیا گیا تھا، عملایا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب افغانستان میں بدامنی کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ خلافت کو ختم کیا جانا مقصود تھا۔ 10 اپریل 1919 کو امرتسر میں فسادات کا آغاز ہوا اور کچھ یورپ کے باشندوں کو انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ ایک کرسچن (NUN) کو عریاں کیا گیا۔ دفتر

اور سرکاری املاک کو آگ لگادی گئی تھی۔ پنجاب فوج کے حوالے کر دیا گیا 13 اپریل کو جلیاوالا باغ میں ایک سیاسی جلسہ منعقد ہوا تھا اور جنرل ڈائر پچاس بندوق برداروں کے اہم راہ اور چالیس لاٹھی بردار پولیس کے ہمراہ جائے واردات پر آیا اور عوام کو منتشر ہونے کے لئے کہا۔ لیکن عوام منتشر نہ ہوئے اور جنرل ڈائر نے گولی چلانے کا حکم دے دیا دس منٹ کی گولہ باری میں 379 افراد ہلاک اور 1208 زخمی ہوئے تھے۔ اس واقعہ نے سارے ہندوستان میں آگ لگادی تھی۔ چونکہ جلیاں والا باغ کے فوراً آٹھ روز بعد بدنام زمانہ Crawling آڈر نافذ کیا تھا۔ جنرل ڈائر پر مقدم چلایا گیا اور ہاؤس آف لارڈس میں جسٹس میک آرڈی نے نائیر بنام ڈائر کا فیصلہ جنرل ڈائر کے حق میں سُنا دیا تھا۔ اور یہ فیصلہ دیا تھا کہ لوگ انگریزوں کے قتل عام پر آمادہ تھے اس لئے حالات کی پیچیدگیوں کے مدنظر جنرل ڈائر کے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ کسی بھی ہندوستانی قانون دان نے یا کانگریس کے لیڈر نے ہاؤس آف لارڈ کے اس تاریخی فیصلے کا تذکرہ تک کرنا مناسب ہی نہیں سمجھا ہے۔ اس کے بعد ڈیوک آ کین ناٹ نے سنٹرل لیجسلیٹی عمارت کا افتتاح 9 فروری 1921 کو دلی میں کیا اور پھر 1923 میں انتخابات میں سوراجیہ پارٹی کی جانب سے پنڈت موتی لال نہرو نے الیکشن لڑا تھا اور 1924 میں ہی ہندوستانیوں کو فوج میں اہم عہدوں پر تعینات کرنے کا فیصلہ لارڈ ریڈنگ نے کیا تھا۔ 1924 میں خلافت کا خاتمہ کر دیا گیا تھا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو انگریزوں سے بدظن کر دیا تھا اور مسلمانوں کی بد ظنی کو دیکھ کر انگریزوں نے 1925 میں ہندوستان مہا سبھا کے قائم کرنے میں اعانت کی تھی۔ ہندو مہا سبھا بنانا انگریزوں کی سازش تھی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نومبر 1927 میں سائمن کمیشن کا اعلان کیا گیا اور اس کے سب ممبر انگریز تھے۔ اس

زمانے میں سرتیج بہادر سپرو Moderate پارٹی کی قیادت سینٹرل اسمبلی میں کر رہے تھے اور اُنہوں نے احتجاج کیا تھا کہ سائمن کمیشن میں کیوں کسی ہندوستانی ممبر کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ یہی سرتیج بہادر سپرو، مہاراجہ ہری سنگھ کے مشیر خاص تھے اور کشمیر میں اُن کے کشمیری پنڈت برادری سے رابطے تھے اور سنٹرل اسمبلی میں مسلم لیگ کی قیادت محمد علی جناح کر رہے تھے۔ 1928 میں موتی لال نہرو کی رپورٹ کو علی محمد جناح نے مسترد کر دیا تھا۔ اس لئے 1927 سے جو کچھ کشمیر میں ہو رہا تھا وہ کانگریس جماعت کی رضا سے ہو رہا تھا۔ اس لئے مہاراجہ ہری سنگھ ہر معاملہ میں سرتیج بہادر سپرو کا مشورہ حاصل کر لیا کرتا تھا اور ہری سنگھ کے دل و دماغ میں اب صرف وحشت کی کارفرمانظر آتی ہے۔ ہری سنگھ کی سوچ تک اپنی نہیں تھی۔ یہ اس کی جوانی کا دور تھا۔ اس کا اپنا ذہن پختہ نہ تھا۔ اور سعی عملی منصوبہ بند نہ تھی۔ اور اس کی بے ربط تمناؤں کے خاکے اس کے اپنے نہ تھے۔ اُن میں رنگ کوئی اور بھر رہا تھا یہ کوئی کانگریس کا سرتیج بہادر سپرو تھا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ پنجاب کی سیاست کا کشمیر کی سیاست سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ لاہور میں 1896 میں کشمیر مسلم کانفرنس قائم کی گئی۔ سرمحمد اقبال اس کے پارٹی رُکن تھے اور 1911 میں اسے آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کا نام دیا گیا اور 1924 میں جب اس جماعت نے کشمیر میں اجلاس بلانے کی مہاراجہ سے رضا حاصل کرنا چاہی تو مہاراجہ پرتاب سنگھ نے صاف انکار کر دیا تھا 1925 میں پرتاب سنگھ فوت ہوا اور راجہ امر سنگھ کا فرزند ہری سنگھ کشمیر کا حکمران تسلیم کیا گیا تھا۔ 1926 کی رسمِ تاجپوشی کے بعد ہری سنگھ نے کشمیر میں جاگیرداری نظام قائم کیا۔ راجپوت، پنڈتوں اور لاکھ وفادار مسلمان جموں کے اور وادی کے چند مسلمانوں کو بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں تھیں اور تمام سرکاری

ملازمتوں پر کشمیر پنڈتوں کی تعیناتی عمل میں لائی گئی تھی ۔اس لئے وادی میں پٹواری، شکدر، تحصیلدار، محررّ زیادہ تر کشمیری پنڈت تھے۔ جو انتہائی کنبہ پرور اور رشوت خور تھے ۔مسلمان صرف چپراسی یا چوکیدار کے عہدے پر تعینات ہوسکتا تھا۔اور غیر زرعی زمین نوتوڑ کے طور پر ہندوافسروں کو عنایت کی گئی تا کہ وہ اسے قابلِ کاشت بنا سکیں اور سود خواری کی شرط پر قرضہ دینے کی اجازت پنڈت سودخوروں کو دی گئی تھی اور کشمیر کی 50 فیصد آبادی قرضوں کی قید میں گرفتار تھی ۔ یہ تھے کشمیر کے معاشی حالات اس لئے 1930 میں ہی پنڈت پریم ناتھ بزار نے مہاتما گاندھی کو خط تحریر کر کے پنڈتوں کے لئے ہدایات حاصل کرنا چاہی تھیں ۔ یہ تفصیل میں نے اس لئے دی ہے کہ قاری یہ اندازہ لگا سکے کہ 1927 سے ہی کانگریس کشمیر میں سرگرمِ عمل تھی ۔سر تیج بہادر سپرو کانگریس کی Moderate پارٹی کے سربراہ تھے اور مہاراجہ ہری سنگھ کے خاص مشیر تھے، مہاراجہ ہری سنگھ کو کچھ کر رہا تھا وہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے مفاد میں کر رہا تھا۔اب کانگریس کشمیر کے مسلمانوں میں جگہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔لیکن افغانستان میں بدامنی کے بعد روس کے بالشویک انقلاب کے بعد انگریز اب خوفزدہ نظر آرہے تھے۔امریکہ کے یہودی کُھلم کُھلا 1927 سے گاندھی جی کے اعلانیہ حمایتی بن گئے تھےاور کانگریس کی حمائت کر رہے تھے۔چونکہ انقلابِ روس کے بعد 1927 سے ہی چین میں کمیونسٹ تحریک رواں دواں ہوئی تھی ۔انگریز اب مہاراجہ ہری سنگھ کو مجبور کرنا چاہتے تھے کہ وہ گلگت اور بلتستان کا علاقہ انہیں حوالے کر دیں۔ 1930 کی رونڈ ٹیبل کانفریس میں مہاراجہ ہری سنگھ کو مدعو کیا گیا تھا اور اس نے جو تقریر کی تھی وہ کانگریس کے خیالات کی ترجمانی کا درجہ حاصل کر چکی تھی اور کانگریس کی ایماء پر کی گئی تھی۔اب انگریز اپنی تمکنت کو چھوڑ کر کشمیر میں محتسب اعلیٰ سیاستوں کا ایک نیا باب شروع کرنے

والے تھے۔ وہ کشمیر کی سیاست کو شعلۂ جوالہ بنانا چاہتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کشمیر میں شمس وقمر بے نور ہو چکے تھے۔ مایوس وہم ایک زندہ حقیقت بن چکی تھی اور نورِ سحر بھی تاریکیوں کے سہارے کی متلاشی تھی اور گلنائے رنگا رنگ یہ سبز و چمن اب بادِ سحر کے خوف سے لرزاں تھے۔ اور قفس میں بال و پر کی شورشیں، سکون کے دام کے فریب سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بے چین اور اضطراب کے عالم میں تھیں۔ کشمیر میں 1930 میں سیاسی اضطراب اور بے چینی کی کیفیت دل و دماغ پر چھا رہی تھی۔

رزیڈنٹ اس ماحول سے آگاہ تھا اور انگریزی سامراج اس ماحول کا بھرپور فائدہ اُٹھا کر کشمیر کی مسلم تحریک کو سیکولر اسلام Moderat Islam کو شامان فخر بنانا چاہتے تھے اور اُن کی نگاہ انتخاب ایک ایسے شخص کی تلاش میں تھی جو اس وقت کی مسلم سیاست سے بالاتر ہو کر، کشمیری لسانی طبقہ کا ترجمان بن کر کشمیریت کے نظریہ سے واقعات کو سمجھنے کی سعی کرے تاکہ اسلام کے نظارۂ آتش فشاں کی شدید حدت سے کشمیر محفوظ رہ سکے چونکہ اسلام نہ تو لسانی حدود اور نہ قومی حدود کو تسلیم کرتا ہے۔ اسلام صرف ایک نظریہ حیات کو تسلیم کرتا ہے اور اسلام کے افکار و خیالات ایک ضابطہ حیات ہیں۔ اسلامی اقدار آفیت کی بنیادوں پر قائم کی گئی ہیں۔ اسلام ایک نظریات تصور کا نام ہے جو ملکوں، قبیلوں، فرقوں، لسانی رسم و رواج قومیت کی بندشوں سے بالکل آزاد ہے ۔اور سیکولر اسلام صرف قومیت کی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی پالیسی کے دو پہلو تھے۔ ہندوستان میں ہندوستانیوں پر مشتمل فوج مرتب کی جائے صرف افسر انگریز تھے جن کے ذریعہ سے امن قائم کیا جا سکے اور سائمن کمیشن کا قیام اسی پالیسی کا دوسرا رُخ تھا یعنی ہندوستان میں ہندوستانیوں کے ذریعہ سے حکومت کی جائے صرف گورنر جنرل اور اس کی کونسل اور ریاستوں کے گورنر انگریز ہوں تاکہ

ہندوستانی لوگوں کو خود حکمرانی کا فریب دے کر برٹش راج کی جڑوں کی آبیاری کی جا سکے۔ اور اس خود حکمرانی کا سب سے زیادہ حمایت کرنے والا شخص گورجنرل الرڈ اروِن تھا۔ اس غرض کے لئے 3 فروری 1928 کو سائمن کمیشن ہندوستان آیا تھا۔ ہندوستان میں کانگریس نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔ اس کے خلاف ہڑتالیں ہوئیں، بنگال اور پنجاب میں جلوس نکالے گئے اور واپس آنے کے بعد 31 مئی 1929 ہو ہندوستان کو اندرونی خود مختاری یعنی ۔۔ دینے کا اعلان کیا جس کا مقصد برٹش راج کے حدود میں خود مختار حکومت جو حکومت سازی کے علاوہ قوانین بنانے کی مجاز ہوا واس لئے لوگ اس قانون سازی کو مرتب کرنے کے لئے ایک اسمبلی کا انتخاب کر سکتے تھے ۔ مگر ہندوستان کے قوانین برٹش پارلیمنٹ کے کسی بھی قانون کے متضاد نہیں ہو سکتے تھے ۔ لیکن اس اندرونی خود مختاری کے لئے برٹش پارلیمنٹ کو قانون وضع کرنا تھا۔ سائمن کمیشن کی رپورٹ مئی 1931 میں شائع کی گئی جس میں دو عملی Dyarchy کے خاتمے اور انتخابات پر زور دیا گیا اور صوبوں کا اختیار دینا تھا۔ کہ وہ صوبوں سے متعلق معاملات پر قانون سازی کر سکتے ہیں۔ لیکن سینٹرل حکومت گورنر جنرل کی ذمہ داری قرار دی گئی تھی چونکہ ہندوستان میں ہندو سیاست اور مسلمان سیاست الگ الگ راہوں پر گامزن تھی ۔ اور پھر ہندوستان کے راجگان کا سوال تھا۔ جو برٹش حکومت کے دائرہ میں اندرونی خود مختاری رکھتے تھے ۔ انگریز دراصل ایک فیڈرل حکومت بنانا چاہتے تھے ۔ جہاں مرکز اور صوبوں کے اختیارات تعین کئے جائیں ۔ اس لئے لندن میں 1930 سے لے کر 1932 تک کئی راونڈ ٹیبل کانفرنسیں بلائیں گئیں تھیں۔ اور ان حالات میں 1930 میں ہری سنگھ اور دیگر راجگان کو مدعو کیا گیا تھا جو انگریزوں سے فیڈرل حکومت کے لئے جس میں راجگان کی

اندرونی خودمختاری قائم رہنے کا مطالعہ کر رہے تھے۔ 1930 میں ہی جرمنی میں فازی حکومت لوگوں کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تھی اور ہٹلر جنگِ عظیم اول کی پابندیاں جو جرمنی پر عائد کردی گئیں تھیں توڑ دینا چاہتے تھا اور امریکہ میں 1930 میں معاشی بدحالی کا دور شروع ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فلسطین میں یہودی آباد ہونا شروع ہوئے تھے اور فلسطینیوں میں بے چینی پھیل رہی تھی۔ چین میں کمیونسٹ ماؤ زے تنگ کی قیامت میں منظم ہو رہے تھے۔ روس ایک بالشیومک حکومت کی رہبری میں عظیم انڈسٹریل انقلاب سے دوچار ہو رہا تھا اور مسلم لیگ نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی صدارت میں پاکستان کا نظریہ پیش کیا تھا۔ یہ دیکھ کر پنڈت نہرو نے اعلان کیا کہ مسلم لیگ کا کوئی وجود ہی نہیں چونکہ مسلمانوں کی کُل آبادی 5/7 فی صد سے زیادہ نہیں اس لئے کانگریس ہی تمام ہندوستان کے لوگوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ جو مکمل سوراج چاہتی ہے۔ جاپان بھی ایک صنعتی طاقت ایشاء میں بن رہا تھا جو اس زمانے میں چین کا سب سے بڑا مخالف اور حریف بن چکا تھا اور انگریز چاہتے تھے کہ افغانستان اب مکمل طور خودمختاری کی پالیسی پر گامزن ہے۔ روس وسط ایشاء پر چھا گیا ہے اور گلگت کے راسے سے روس ہندوستان میں داخل ہو سکتا ہے۔ گلگت کا علاقہ ہندوستانی دفاع کے لئے ناگزیر بن چکا ہے، اور ہندوستان میں برٹش حکومت کے مفاد میں یہ ہے کہ وہ راجگان کی حکومت کو قائم رکھے، مگر اُن کے عوام کی خوشنودی، جمہوریت کے تقاضوں کے نام پر حاصل کرے۔ لوگوں کی خوشنودی ہی انگریزوں کی افسردگی کا مدوا ہو سکتی تھی اور وہ ایک نیا وفادار اور عقیدت کا رنگ قائم کرنا چاہتے تھے اور انگریز جانتے تھے کہ راجگان کے عوام، افلاس زدہ عوام اپنا کھویا ہوا وقار صرف انگریزوں سے رشتہ اُمید جوڑ کر حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے صرف انگریزوں

کے وفادار ہوں گے۔ ہندوستانی راجگان کی رہنمائی فکر صرف اُن کے ذاتی مفادات کر رہے تھے۔ وہ نیم پڑھے لکھے لوگ تھے جنہیں لارڈ میکالے نے سُنہری کٹھ پتلیاں Glittering Puppets کہا تھا۔ جو اُس وقت کی بین الاقوامی سیاست سے نابلید تھے۔ کشمیر ایک دُور افتادہ پہاڑی علاقہ تھا۔ میر واعظ نے صرف چند مذہبی کتابیں پڑھی تھیں اور کبھی ذاتی طور دہلی، مدارس، بنگال، اوڑیسہ، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان، کشمیر، لداخ، کرگل یا گلگت کا سفر ہی نہ کیا تھا۔ صرف چند درجن اخبار پنجاب سے کشمیر وقتاً فوقتاً آتے تھے اور صرف مہاراجہ کے منسٹر صاحبان یا بڑے آفیسر کبھی کبھی انہیں پڑھا کرتے تھے۔ ان حالات میں کشمیر میں پریس کا تصور تک قائم نہ ہوا تھا۔ یہاں کے حالات محمد دین فوق جن کے کشمیر میں گہرے تعلقات تھے، پنجاب کی کشمیر کانفرنس تک پہنچایا کرتے تھے اور پنجاب کے علاوہ یوپی کے مسلمان یا کشمیری نژاد لکھنوی یا الہٰ آبادی چاہتے تھے کہ پُرسش حالات کر سکیں۔

لیکن گہرے طور کشمیر کے سیاسی، سماجی، معاشی حالات سے اُنہیں کوئی سروکار ہی نہ تھا باقی ہندوستان کشمیر کے نام سے واقف ہی نہ تھا۔ اور پنجابی مسلمانوں کے سوا کشمیر سے متعلق تمام ہندوستان کے مسلمانوں نے رازدارنہ خاموشی کا رویہ اختیار اپنایا تھا۔ لیکن 1930 میں کشمیر میں تاریخ ایک نیا موڑ لے رہی تھی اور کشمیر کی وادی پکار رہی تھی:

"چمن میں آگ نہ لگتی تو اور کیا ہوتا؟
کہ پھول، پھول کے دامن میں اک شرارہ تھا"

حقیقت میں انگریز اب یورپ میں نئے اضطرابی کیفیت کا جنم دیکھ رہے تھے ۔جرمنی کا اُبھرنا، انگریزوں سے مُتصادم ہونا تھا۔ ایک ایسی صورتحال کو تشکیل دے رہا

تھا جہاں جرمنی اور انگلستان ایک نئی جنگ کے بعد ایشیاء میں اپنا نو آبادیاتی نظام جو انگریزوں کا قائم کردہ تھا اس کا زوال دیکھ رہے تھے۔اس لئے اگر ایک مسلم ریاست کبھی وجود میں آئی تو کشمیر جغرافیائی تسلسل کے تقاضوں کے تحت اس نئی ریاست سے کنارہ کشی نہیں کرسکتا تھا۔اس لئے وہ کشمیر میں لبرل اسلام کو فروغ دینا چاہتے تھے جو ہندوستان کی ہندو ریاست کو ایک مسلم ریاست پر ترجیح دے اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ مہاراجہ کو سٹیٹ سبجکٹ قانون بنانے کی ترغیب دے جائے تاکہ کشمیری مسلمانوں اور کشمیری نژاد پنجابیوں کے درمیان ایک ناقابل تسخیر فصیل قائم کی جائے۔ انگریزوں کے ارادے کامیاب ہوئے۔1928 میں ہی پنجابی ، کشمیری نفرتوں نے اپنی معراج حاصل کرلی تھی اور انگریز اب کشمیری مسلمانوں سے ہمدردی کا اظہار کرنا ضروری سمجھتے تھے۔15 مارچ 1929 کو سر البیان بنرجی نے وزیر اعظم کشمیر کے عہدے سے استعفیٰ دیا اور اپنے سبکدوشی کے خط میں کشمیری مسلمانوں کی کسمپرسی کا بھر پور نقشہ کھینچا تھا۔ یہ شخص رزیڈنٹ کے ایماء پر کشمیر کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا تھا اور سر بٹائٹ کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔اس کے استعفیٰ کا مقصد وہی حالات پیدا کرنا تھے جو مہاراجہ پرتاب سنگھ کی معزولی کے لئے بطورِ استدلال عملائے گئے تھے۔ ہری سنگھ پر اب ایک دباؤ قائم کردیا گیا تھا۔ بنرجی کے استعفےٰ میں یہ الفاظ کہ ’’ کشمیر کی حدود تین بڑی مملکتوں سے مطابقت رکھتی ہے‘‘ اور شیخ عبداللہ نے جب علی گڑھ میں یہ بیان پڑھا تو اس نے علی گڑھ جہاں وہ طالب علم تھا ’’ آوٹ لُک اخبار کے نام خط لکھا جس کی خوب تشہیر ہوئی۔ شیخ عبداللہ نے وہ خط کس کی ایماء پر لکھا تھا؟ یہ ایک تحقیق طلب سوال ہے۔مگر انگریزوں کی خفیہ ایجنسیوں نے یہ خط پڑھا اور ان کی نگاہیں شیخ عبداللہ پر مرکوز ہوگئیں تھیں ۔اور اپریل 1930 میں عبداللہ ایم ایس سی امتحان پاس کر کے

واپس وطن لوٹے تھے ۔ 1930 میں بہت سے مسلمان طلبا بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کر کے کشمیر میں موجود تھے ۔ ان سب کی تعلیم کے اخراجات کشمیر مسلم کانفرنس لاہور نے برداشت کئے تھے اور ان لوگوں نے مولانا اسد جو بنگالی تھے کے ایماء پر ریڈنگ روم پارٹی بنائی تھی ۔ مولانا اسد کس کے ایماء پر کشمیر کے نوجوانوں کے خیر خواہ بنے تھے؟ ان کے رزیڈنٹ سے کیا مراسم تھے؟ اور اس ریڈنگ روم پارٹی کے ممبران نے پنجاب کے اخبارات یعنی ''مسلم، اوٹ لُک، سیاست، انقلاب لاہور'' میں کشمیر سے متعلق مضامین شائع کروائے تھے ۔ اس لئے انگریزی خفیہ ایجنسیوں کو ان کی کارکردگی کا مکمل علم تھا ۔ ان اخبارات پر مہاراجہ نے پابندی لگائی مگر کسی بھی ریڈنگ روم کے ممبر کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی گئی ۔ آخر کیوں؟ اور پھر جب لاہور میں اشتعال انگیز پوشٹر شائع ہوئے جن میں کشمیری مسلمانوں کو ڈوگرہ شاہی کے خلاف صف آرا ہونے کے لئے کہا گیا ۔ تو کیا وجہ تھی کہ مہاراجہ کی حکومت نے کسی بھی کشمیری ریڈنگ روم ممبر کے خلاف کوئی کاروائی نہ طے کی تھی ۔ آخر کیوں؟ اور پھر اس ریڈنگ روم پارٹی نے مہاراجہ کی وزارء کی کابینہ کو تحریری یاداشت روانہ کی ۔ مگر حکومت نے کوئی نوٹ نہ لیا ۔ آخر کیوں؟ کیا رزیڈنٹ اُن کی پشت پناہی کر رہا تھا اور ہری سنگھ، پرتاب سنگھ کی طرح انتظامی بدنظمی کے نام پر معزول ہونے سے خائف تھا؟ بلکہ مہاراجہ کی کابینہ نے نرمی کا رویہ اپنایا اور ریڈنگ روم پارٹی کو اپنے نمائندوں سے بات چیت کے لئے روانہ کرنے کی ہدایت دی ۔ کابینہ کس کے ایماء پر کام کر رہی تھی وہ بھی رزیڈنٹ کی خوشنودی چاہتے تھے؟ جب ہری سنگھ لندن میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شمولیت کے لئے گیا ہوا تھا اور اس کے بعد شیخ عبداللہ کو باغِ دلاور خان کے ہائی سکول میں عارضی طور ٹیچر مقرر کیا گیا تھا یہ حکم بروئے حکم

نامہ 5090 محررہ 4 فروری 1931 گورنمنٹ کشمیر نے صادر کیا تھا۔ اس وقت ریڈنگ روم پارٹی ''ینگ ایسوسیشن'' بن چکی تھی اور سرکاری ملازم ہونے کے باوجود شیخ عبداللہ اس ''ینگ مین ایسوشیشن'' کا روح رواں تھا۔ مہاراجہ کی حکومت نے اس عارضی ماسٹر کو برطرف نہیں کیا۔ آخر کیوں؟ شیخ عبداللہ کو مظفر آباد تبدیل کر دیا گیا لیکن اس کے باجود مئی اور جون 1931 میں شیخ عبداللہ نے حکومت کے خلاف تقاریر کا سلسلہ شروع کیا۔ مگر مہاراجہ کی حکومت نے اس کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کی سعی ہی نہ کی آخر کیوں؟ اور پھر شیخ عبداللہ نے سرکاری ملازم ہونے کے باوجود جامع مسجد سرینگر اور خانقاہ معلیٰ میں حکومت کے ظالمانہ اقدام کے خلاف آواز اُٹھائی تھی۔ مگر حکومت نے شیخ عبداللہ کے خلاف کوئی کاروائی کرنا مناسب ہی نہ سمجھا آخر کیوں؟ اور پھر شیخ عبداللہ کا مضمون ہم کیا چاہتے ہیں'' میں شیخ نے مہاراجہ بہادر کی حکومت کو قائم رکھنے کی اپیل کی تھی۔ یہ کس کی ایماء پر مہاراجہ کی حکومت کے حق میں بیان جاری کیا گیا تھا؟ سوالات کئی ہیں مگر جواب خود ایک سوال بن چُکا ہے۔ اور شیخ عبداللہ کی عمر اس وقت صرف 25 سال تھی یہ آغاز جوانی تھا۔ اس کی حُب الوطنی کے پس پردہ کس کا ہاتھ تھا؟ بقولِ بسمل سعدی جو اردو کا ایک اوسط درجے کا شاعر ہے:

ہاں مگر کل عشق کو دیکھ کہ وہ شوریدہ بخت

بڑھ چکا تھا زندگی میں موت سے دیوانہ تھا

جا رہا تھا بے ارادہ بے خیال سمت وراہ

اور زبان پر نالہ ٔموزون یہ مظلومانہ تھا

چشم ہے محروم صورتِ گوش مایوس صدا

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مہاراجہ کو تاثر دیا گیا تھا کہ شیخ عبداللہ کو رزیڈنٹ کی حمایت حاصل ہے۔

کشمیر کی تاریخ پر نئے انداز سے تحقیق شبِ تاریخ میں نئی سحر پیدا کرنا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے اُس وقت کے انگریز رزیڈنٹ، انسپکٹر جنرل آف پولیس ہندوستان میں راجواڑوں سے متعلق محکمہ کے سبھی انگریز افسر خود اُس وقت کے وائسرائے اب بقیدِ حیات ہی نہیں اور کشمیر کی تاریخ کے یہ اہم گوشے اب روشن نہ ہو سکیں گے۔ کسی کشمیری دانشور کے من میں ایسی تحقیق کرنے کا خیال ہی نہ آیا ہے۔ کشمیری دانشوروں کی زندگی شوق صرف دال روٹی کے چکر میں گھومتی رہی یہ وہ ماحول تھا جہاں:

"آنکھ سے دل میں سماجاتے تھے، دل سے روح میں

زندگی شوق کا ہر حال بتایا نہ تھا!

کشمیر میں مجھے آج بھی زندگی شوق کی بے باکی نظر نہیں آتی"۔ آج بھی دانشور طبقہ صرف مادی فوائد کا طلبگار ہے اور ان کی زیست صرف ایک کشمکش حال میں صرف ہو جاتی ہے اور اب تو یہ حال ہے:

اک قصر ہے خود حکمتِ معمار ازل کا

دیوانۂ بام و درِ ایوان ہے ابھی تک

میں ان دانشوروں سے، ان دیوانہ بام و درِ ایوان سے صرف اتنا کہوں گا کہ وہ اُن شہیدوں سے سبق لیں:

مرحمت جو کر گئے ہم کو حیات جاودان

جانب ملک عدم ہوتے ہوتے بھی راہِ بُود

ورنہ آنے والی نسلیں ہم کو خون کا تاجر کہہ کر نظر انداز کر دیں گے اور ہم شاید

اسی کے مستحق ہیں کہ ہم لوگوں نے اپنے حقائق کو بھی افسانہ بنا ڈالا ہے۔ اسلئے ہم کسی پندار کے حق دار نہیں ہیں ۔ اس پسِ منظر میں اب میں 13 جولائی 1931 کے حالات کے کچھ پہلو اپنا موضوع بناؤں گا چونک کچھ واقعات ہمیں یاد دلاتے ہیں:

شب کی سیاہوں میں نہ مایوس ہو کہ ہے

ہر شب طلوعِ صُبح کا وعدہ لئے ہوئے

1931ء میں غلام احمد عشائی مرحوم نے کشمیر مسلم ایسوشیشن کا قیام عمل میں لایا تھا اور شیخ عبداللہ اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے تھے اور اس تنظیم کا مقصد صرف مہاراجہ سے مسلمانوں کو ملازمتوں میں جگہ دینے کا مطالبہ کرنا تھا اور مولوی یوسف شاہ میر واعظ نے شیخ عبداللہ کو کشمیر کا نیا لیڈر کہہ کر لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ ان کی ہدایات پر عمل کریں اور اس وقت مسلمانوں میں دو طبقے تھے غلام نبی گلکار جو عملی جدوجہد کے لئے کوشاں تھا اور شیخ عبداللہ جو صرف اصلاحات کا متمنی تھا اور پھر اپریل 1931 میں کھیم چند سب انسپکٹر نے جموں میں امام کو خطبہ پڑھنے سے روک دیا۔ جموں میں مسلمانوں میں بے اطمینانی پھیل گئی اس واقعہ کے فوراً بعد ایک ہندو پولیس افسر نے 4 جولائی 1931 کو ایک جموں کے مسلمان پولیس والے کے ہاتھوں سے جب کہ وہ تلاوت قرآن کر رہا تھا قرآن چھین کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا، توہین قرآن کے واقع نے جموں کشمیر ریاست میں آگ لگادی تھی۔ سب سے پہلے سرینگر کی جامع مسجد میں غلام نبی گلکار نے ایک احتجاجی اجتماع منعقد کیا تھا۔ شیخ عبداللہ نے بھی اس جلسے سے خطاب کیا تھا۔ گورنر کشمیر نے فوراً ایک حکم نامہ جاری کیا کہ مساجد میں گورنر کی اجازت کے بغیر کوئی سیاسی تقریر کرنا ممنوع ہے۔ لیکن لوگوں نے اس حکم نامے کے باوجود توہین قرآن کے واقعہ کے خلاف ایک دوسرے اجتماع کا اعلان کردیا

۔اس وقت شیخ عبداللہ گورنمنٹ ٹیچر تھا اور اسی روز اس سے مظفر آباد تبدیل کر دیا گیا تھا اور پھر عوام کے حمایت پر شیخ عبااللہ نے اپنا استعفیٰ پیش کیا تھا۔مگر حکومت نے وہ استعفیٰ منظور نہیں کیا تھا۔اس سے قبل ہمیں ان واقعات کا جائزہ لینا ہوگا جو جون 1931 میں کشمیر میں ہوئے تھے۔چونکہ سب واقعات کے پسِ پردہ برٹش رزیڈنٹ کا ہاتھ صاف دکھائی دیتا ہے۔غالباً اول جون کو برٹس انٹلی جنس کا ایک میجر کشمیر آیا اور نسیم باغ میں ایک ہاؤس بوٹ میں ٹھہرا تھا۔اس کے باورچی کا نام عبدالقدیر تھا۔جو رام پور کا رہنے والا تھا اور برٹش انٹلی جنس میں ملازم تھا۔جولائی کے واقعات سے قبل اسی میجر صاحب کے کشمیر آنے کے بعد 21 جون 1931 کو خانقاہ معلیٰ میں ایک اجتماع طلب کیا گیا تاکہ لوگوں کی موجودگی میں ینگ مسلم ایسوایشن کے عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔اس اجتماع کے لئے تمام علماء اور میر واعظ صاحب کو مدعو کیا گیا تھا۔اس کے بعد ینگ مسلم ایسوایشن کے عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں لایا گیا اب میٹنگ اختتام کو پہنچی ہی تھی کہ عبدالقدیر خان ڈائس پر آئے اور ایک نہایت اشتعال انگیز تقریر ان الفاظ سے اختتام کی ''کشمیر کے مسلمانوں کا۔۔امرا کے درو دیوار و جو ظلم کی علامت ہیں ہٹادو، مہاراجہ کے محل کو زمین بوس کردو اور جہاد کا اعلان کردو۔اگر تم ہتھیار نہیں رکھتے، سنگ بازی اور لاٹھیوں سے جہاد کا آغاز کردو، یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ عبدالقدیر خان کشمیر کے ہونے والے لیڈروں سے اس واقع سے قبل پیر عبدالاحد شاہ کی دوکان پر خفیہ ملاقات کر چکا تھا۔

25 جون 1931 کو عبدالقدیر خان کو برٹش رزیڈنٹ کو اطلاع دے کر گرفتار کیا گیا تھا اور اس کے خلاف مقدمہ سپیشل جج کی عدالت میں 4 جولائی 1931 کو پیش کیا گیا تھا اسی روز جموں میں توہین قرآن کا واقعہ پیش آیا تھا اور

7,6 اور 9 جولائی کو مقدمہ کی سماعت عدالت میں سیشن میں ہوئی تو ہزاروں لوگ احاطہ عدالت میں جمع ہو گئے تھے۔ 9 جولائی 1931 کو مہاراجہ ہری سنگھ نے ایک فرمان جاری کیا تھا اور کہا تھا کہ کچھ واقعات رونما ہوئے ہیں جن میں باہر کا ہاتھ ہے وہ فرقہ وارانہ کشیدگی کے خلاف ہے اور اسلام مخالف نہیں اور اس لئے سیاسی اجتماع کی ضرورت نہیں ہے اور وہ آگاہ ہے کہ حکومت میں نوکریاں حاصل کرنے کے لئے پالیسی منظّم کی جائے۔ جس میں معیار، قابلیت کی بناء پر قائم کیا جائے گا اور اس لئے میں بیرون از ریاست طاقتوں سے صاف کہتا ہوں کہ وہ ریاست کے معاملات میں دخل اندازی نہ کریں"۔ یہ اشارہ رزیڈنٹ بہادر کی طرف تھا۔

اس فرمان کے خلاف 10 جولائی 1931 کو پبلک میٹنگ بلائی گئی اور شیخ عبداللہ نے اسے مسترد کر دیا تھا اور عبدالقدیر خان کی حمائت کا اعلان کر دیا تھا۔ دو باتیں اہم ہیں۔ شیخ عبداللہ ابھی گورنمنٹ ملازم تھا۔ 4 جولائی 1931 کو اسے مظفر آباد تبدیل کر دیا گیا۔ اس نے استعفیٰ پیش کیا تھا۔ لیکن اپریل 1931 سے ہی شیخ عبداللہ کو سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی کھلی چھوٹ دی گئی۔ عبدالقدیر خان کی گرفتاری کے بعد بھی شیخ عبداللہ کے خلاف کوئی محکمانہ کاروائی نہیں کی گئی اور 4 جولائی 1931 کو عبدالقدیر خان کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔ 10 جولائی 1931 کو شیخ عبداللہ نے عوامی جلسے میں مہاراجہ کے فرمان کو مسترد کر دیا تھا اور عبدالقدیر خان سے حمائت کا اعلان کیا تھا۔ عبدالقدئر خان کے خلاف بغاوت کا مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔ اس نے مہاراجہ کی حکومت کے خلاف جہاد کرنے کی ترغیب دی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے اور جو انتہائی اہم ہے کہ ان سب واقعات کے پیش منظر میں کیا وجوہات تھے کہ مہاراجہ کی حکومت نے شیخ عبداللہ کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی تھی جب کہ شیخ عبداللہ

ابھی عارضی طور پر ملازم مقرر کیا گیا تھا؟ شیخ عبداللہ نے 4 جولائی 1931 کو اپنا استعفیٰ پیش کیا تھا مگر کیا وجہ تھی کہ 10 جولائی 1931 کے عوامی جلسے میں مہاراجہ کے خلاف تقریر کرنے کے باوجود بھی اس سرکاری ملازم کا استعفیٰ حکومت نے منظور نہیں کیا تھا؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی باہر کی قوت شیخ عبداللہ کی حامی تھی۔

کچھ اور واقعات بہت اہم ہیں جن سے باہر کے قانون کی مداخلت کا کشمیر کے واقعات پر اثر انداز ہونا صاف ثابت ہے۔ فراق گھورکھپوریؔ نے کیا خوب کہا ہے:

کسی گونگے سے سنا تو سبھا بہروں کی

عشق وہ قصہ ہے جسے کون کہے کون سُنے!

کشمیر کے اس زمانے کے خفی واقعات بھی تاریخ کے سینے پر بوجھ ہیں اور فراق کی زبان میں ماجرا ماجرا، داستان داستان بن گئے ہیں۔ اب اس ڈرامہ کا دوسرا سین غور فرمایئے کیا نیا رُخ اختیار کرتا ہے۔ برٹش انٹلی جنس کی کرشمہ سازیوں نے ایک فسوں قائم کیا تھا یعنی " شاعری فن! آنکھ کے جادو جگانے کی کہو "۔ 11 جولائی 1931 کو ضلع مجسٹریٹ نے مقدمہ کی سماعت سنٹرل جیل سرینگر میں منتقل کرنے کی استدعا کی جو منظور کر لی گئی۔ 12 جولائی خیر و عافیت سے گزر گیا۔ 13 جولائی 1931 کو سنٹرل جیل میں سماعت جاری تھی۔ 44 پولیس والے سنٹرل جیل سرینگر میں تعینات کر دیئے گئے تھے۔ جیل میں کل ملازموں کی تعداد 19 تھی اور شیشن جج کشمیر کی آمد سے قبل ہی عوام جیل کے احاطے میں موجود تھے اور فلک شگاف نعرے بلند کر رہے تھے اور القدیر خان کا دیدار کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جج صاحب تشریف لائے لیکن عوام کی نعرہ بازی کی وجہ سے مقدمہ کی سماعت شروع نہ ہو سکی۔ دو بجے نماز کو وقت ہوا۔ کسی نے جیل کی دیوار پر چڑھ کر اذان دی۔ پولیس نے

مزاحمت کرنا چاہی ۔5افراد گرفتار کر لئے گئے ،لیکن کسی نے ڈوگرہ سپاہیوں کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ گولہ باری شروع ہوئی ۔عبدالخالق شورہ پہلا شخص تھا جو شہید ہوا اور محمد یعقوب رفیقی پہلا شخص تھا جو گرفتار ہوا تھا اور اس طرح 21 افراد شہید کر دیئے گئے تھے۔3 بجے یعنی فوراً بعد سٹرویک فلیڈ جو مہاراجہ کے خارجی امور کے وزیر تھے جائے واردات پر آئے تھے۔صرف گیاراں افراد موقعہ پر شہید ہوئے تھے۔ باقی اسپتال میں شہید ہوئے تھے۔اس واقعہ کے فوراً بعد شہر سرینگر کو فوج کے حوالے کر دیا گیا تھا اور دوسرے روز شیخ عبداللہ، چودھری غلام عباس، مولوی عبدالرحیم ، سردار گوہر رحمان، غلام نبی گلکار گرفتار کر لئے گئے تھے اور ہری پربت قلعہ میں محبوس کر دئے گئے تھے۔ یہ اس لئے کہ 31 جولائی کو جب شہیدوں کی لاشیں جامع مسجد لائی گئیں تھیں ان لوگوں نے مہاراجہ کے خلاف تقریر کی تھی ۔تین ہفتے تک شہر سرینگر میں کرفیو رہا تھا اور 21 دن کے بعد مہاراجہ نے شیخ عبداللہ اور اُن کے ہمرائیوں کی رہائی کا حکم دے دیا تھا۔ میں نے ان واقعات کی تفصیل اس لئے بیان کی ہے کہ قاری تفکر کریں کہ اتنے بڑے واقعہ کے رونما ہونے کے باوجود بھی شیخ عبداللہ کا استعفیٰ منظور نہیں کیا گیا نہ ہری پربت قلعہ میں اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی گئی نہ اسے کوئی گزند پہنچائی گئی ۔نہ اسے ملک بدر کیا گیا۔ اب قاری اپنی یاداشت کو تازہ کریں اور توجہ دیں کہ جب 1924 میں کچھ جاگیرداروں نے رزیڈنٹ کے ایماء پر مسلمانوں کی حالت زار کی یاداشت وایسرائے کو پیش کی تھی اور جس میں بیگار ختم کرنے کا مطالبہ تھا۔ مہاراجہ اس قدر برہم ہوا تھا کہ خواجہ سعدالدین شال اور خواجہ نور شاہ نقشبندی کو ملک بدر کرنے کا حکم صادر کیا تھا۔ خواجہ حسن شاہ اور سید حسن شاہ جلالی کی جاگیریں ضبط کر دی گئیں اور میر واعظ کشمیر اور میر واعظ ہمدانی کو سخت وارنگ دی گئی کہ وہ خطبات میں مہاراجہ کی حکومت کے خلاف

کوئی شبہ تک ظاہر نہ کریں لیکن شیخ عبداللہ جو ابھی عارضی ملازم تھا جو استعفیٰ دے چکا تھا ۔اس کا استعفیٰ تک منظور نہیں کیا گیا۔اس کے خلاف کوئی مقدمہ تک نہ چلایا گیا۔ بلکہ 21 یوم کی گرفتاری کے بعد سے ہری پربت قلعہ کی جیل سے رہا کر دیا گیا تھا۔آخر کیوں؟اس تحریک کو رزیڈنٹ کشمیر کی حمایت حاصل تھی۔ شیخ عبداللہ کو تو ایک سال بعد جولائی 1932 میں نوکری سے برخاست کیا گیا تھا۔تب تک وہ بدستور سرکاری ملازم رہا تھا۔آخر کیوں؟ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ بدقسمتی سے مہاراجہ ہری سنگھ نے کوئی سوانح عمری نوشت نہیں کی ہے۔ میسٹر دیک فیلڈ نے بھی کوئی روشنی حالات پر نہیں ڈالی ہے۔آئی جی پی آئین بل نے بھی خاموشی اختیار کی ہے اور مہاراجہ کی فوج کے انگریز سربراہ نے بھی اِن واقعات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے اور کسی بھی کشمیری دانشور نے کوئی تحقیق کرنا مناسب ہی نہ سمجھا ہے۔ ہم تک جو واقعات پہنچے ہیں وہ فسادات سے متعلق رزیڈنٹ کے ایماء پر جو انکوائری کمیٹی قائم کی گئی تھی۔ اُنہوں نے گواہان کے بیانات قلمبند کئے تھے۔ یہ تمام واقعات انہی گواہان کے بیانات سے اخذ کئے گئے ہیں ورنہ اس دور کی کوئی تاریخ موجود ہی نہ ہوتی۔۔اس کمیٹی نے جن لوگوں کے بیانات قلمبند کئے تھے ان میں لالہ کرم چند جیلر، شیخ عبدالعزیز ڈی آئی جی، کے ایل کچلو، شیشن جج، بھگت کرم چند تاجر، عبداللہ جو تاجر، ڈاکٹر ٹھاکر داس، ڈاکٹر نورالدین خان، مولوی محمد عبداللہ، وکیل جو عبدالقدیر کے وکیل صفائی تھے اور خود مسٹر ویک فیلڈ اور رائے زادہ ترلوک چند گورنر کشمیر قابلِ ذکر ہیں اور پھر اُن کے بیانوں کا خلاصہ انکوائیری کمیٹی رپوٹ میں درج ہے۔ لیکن مہاراجہ نے کن بیرونی قوتوں کا تذکرہ کیا تھا؟ رزیڈنٹ اور مہاراجہ کے درمیان کیا گفت وشنید ہو ئی؟ رزیدنٹ اور وائسرائے نے آپس میں کیا تبادلہ خیال کیا؟ اور برٹش انٹلی جنس کا وہ میجر جو نسیم باغ ہاؤس میں ٹھہرا تھا

اس نے کیا رپورٹ دی؟ ایسے امور ہیں جو صیغۂ راز میں ہیں یا اُن کی عقدہ کشائی ممکن ہی نہیں ہے۔ کوئی تو تھا جس نے بقولِ فراقؔ:

"دبے پاؤں کسی نے آ کے خوابِ زندگی بدلا"

اور پھر کشمیر میں

زمین بدلی، فلک بدلا، مذاقِ زندگی بدلا

قاری کے تفکر کے لئے یہ بات یاد دلانا ضروری ہے کہ اگر مہاراجہ ہری سنگھ عام کشمیریوں کے لئے Crwling order یعنی رینگ کر چلنے کا حکم اور مہاراجہ بہادر کی جے بولنا ضروری قرار دے سکتا تھا اور 19 اپریل کے تحت کوڑوں کی سزا کو جائز سمجھ رہا تھا تو وہ عبداللہ کے خلاف محکمانہ کاروائی کرنے سے کیوں گریز کر رہا تھا؟ عبداللہ کا استعفیٰ تو جولائی 1931 میں منظور نہیں کیا گیا؟ بلکہ اس کو نوکری سے ایک سال بعد برخاست کیا گیا؟ اور کس کے ایماء پر اس واقعہ سے قبل مرزا بشیر الدین محمود نے جو مرزا غلام احمد قادیانی کے صاحبزادے تھے نے احمدیہ مشن کی طرف سے کشمیریوں سے یکجہتی کا اعلان کیا تھا؟ یہ بیان احمدیہ اخبار "الفضل" قادیان کے 16 جون 1931 کے شمارہ میں شائع ہوا ہے۔ اور کچھ مورخین کی رائے میں 1931 کے حالات ذمہ داری کشمیر کی اقتصادیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ کاشتکاروں کی حالت جاگیرداری کی وجہ سے انتہائی ابتر ہو چکی تھیں۔ شال بانی کا کاروبار زوال پذیر تھا اور اُن پر ٹیکس عائد کیا گیا تھا۔ چاول اور شالی کے دام روز افزوں مہنگائی کی طرف جا رہے تھے۔ اور پڑھے لکھے مسلمانوں پر نوکری کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ مگر یہ حالات ہندوستان کے زیادہ تر راجواڑوں میں بھی رائج تھے۔ لیکن کشمیر میں ہی کیوں یہ آگ بھڑکی تھی؟ ایک وجہ تو پنجاب کے

مسلمانوں کی کشمیریوں سے یکجہتی اور پنجابی مسلم پریس کا مہاراجہ کے خلاف آواز اُٹھانا جتلایا جاتا ہے۔ ورنہ 1931 میں سرینگر میں نعرہ بلند ہو رہے تھے کہ مہاراجہ کی نسل برباد ہو اور دوسری طرف مہاراجہ کی بے بستی تھی کہ وہ عبداللہ کے خلاف محکمانہ کاروائی کرنے سے بھی قاصر تھا۔ آخر کیوں؟ یہ سب کچھ رزیڈنٹ کے ایما پر ہو رہا تھا اور پھر 18 جولائی 1931 کے الفضل قادیان کے شمارہ میں تار درج ہے جو مرزا بشیر محمود نے قادیان سے وائسرائے کو روانہ کیا اور جس میں انگریزوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ کشمیری مسلمانوں کا دفاع کریں۔ قاری غور کریئے کہ پرتاب سنگھ کو بدعنوانی اور حکومت کی ناقص کارکردگی کی وجہ سے تخت سے معزول کیا گیا۔ لیکن ہری سنگھ کے خلاف وائسرائے نے ایسی کاروائی کرنے سے احتراز کیا تھا۔ آخر کیوں؟ ہندو اخبار پرتاب نے اپنے 18 جولائی 1931 کے شمارہ میں انکشاف کیا تھا کہ حکومت کشمیر نے صرف کیوں پنجاب کے 200 مسلمانوں کو گرفتار کیا تھا۔ جب کہ پنجاب سے کشمیر میں 7000 کا مجمع داخل ہوا تھا؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 200 لوگ کون تھے۔ ان کا نام اور احوال کیا تھے۔ ان کے لیڈر کون تھے؟ کیا اِن لوگوں پر مقدمہ چلایا گیا؟ رزیڈنٹ نے برٹش گورنر پنجاب کے نوٹس میں یہ معاملہ لایا تھا؟ پنجاب کے برٹش حکومت کا مہاراجہ کی نسبت کیا رویہ تھا؟ اور احمدیہ مسلمانوں نے جو منصوبہ بند طریقہ پر کشمیر میں خصوصی ریلیف کیمپ قائم کیئے تھے۔ ریلیف کمیٹیاں بنائی تھیں اور امداد بہم کی تھی۔ اس کے متعلق حکومت پنجاب کی کیا رائے تھی؟ کیا مہاراجہ بہادر اس وقت بھی سر تیج بہادر سپرو سے مشورہ لے رہا تھا؟ اگر شیخ عبداللہ پچیس برس کا نوجوان تھا اور سیاست کے رمز و کنایہ سے نابلد تھا تو مہاراجہ ہری سنگھ بھی اسی عمر کا تھا اور سیاست سے نابلد۔ اس کا وزیر خارجی امور ویک فلیڈ انگریز تھا۔ رزیڈنٹ بھی انگریز تھا۔ پنجاب کا

برٹش گورنر انگریز تھا۔ خود عبدالقدیر خان برٹش انٹلی جنس کے میجر کا جو کشمیر سیاحت کے لئے آیا تھا جو انگریز تھا اس کا باورچی تھا۔ اور پھر سر تیج بہادر سپرو نے کانگریس کو اس معاملے میں کیا رائے دی تھی؟ اور اگر مہاراجہ اس وقت تیج بہادر سپرو سے مشورہ حاصل نہ کرتا تھا تو مہاراجہ کا مشیر کون تھا؟ کشمیری پنڈتوں کے سر تیج بہادر سپرو سے کس نوعیت کے تعلقات تھے؟ کیوں 1930 میں ہی پنڈت پریم ناتھ بزاز نے مہاتما گاندھی کو خط لکھ کر ہدایات حاصل کرنا چاہیں تھیں؟۔ گاندھی نے 1930 سے لے کر 1931 تک پریم ناتھ بزاز جو شیخ عبداللہ کا ہم عمر تھا کیا خطوط تحریر کیئے تھے؟ کس کے کہنے پر جولائی 1931 میں ہی ہری کشن کول ایک کشمیری پنڈت کو کشمیر کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا تھا؟ اور اس وقت کانگریس نے کسی ہندو لیڈر کو نہیں بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد کو مہاراجہ ہری سنگھ سے کشمیر میں مفاہمت کا رویہ اپنانے کے لئے کہا تھا اور عبدالقدیر خان کے سوا تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے تھے تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کا رول کیا تھا؟ اور شیخ کی مسلم کانفرنس نے مولانا آزاد کے کہنے پر یا کسی اور کے کہنے پر یہ مفاہمت کی تھی کہ مہاراجہ کے خلاف ایجی ٹیشن ختم کی جائے اور جامع مسجد میں اعلان کیا جائے گا کہ کشمیری مسلمان مہاراجہ کے وفادار رہیں گے اور بیرون ریاست کسی بھی سیاسی قوت سے تعلق آئندہ قائم نہ رکھیں گے۔ یہ بیرون ریاست کون سیاسی قوت تھی؟ مولانا آزاد کانگریس کے ایک اہم لیڈر تھے۔ اُنہوں نے بھی اپنی آپ بیتی میں کشمیر کا تذکر کرنا ہی مناسب نہ سمجھا ہے۔ اس معاملہ پر اُنہوں نے خاموشی اختیار کی ہے۔ یہ انتہائی افسوس ناک امر ہے کہ کسی بھی کشمیری مورخ نے مولانا ابوالکلام آزاد سے اُن کی حیات میں اُن کے کشمیر میں مفاہمت کرانے کے رول کے بارے میں کوئی استفسار تک نہ کیا ہے اور مولانا آزاد کی مفاہمت کے سلسلے میں مہاراجہ نے 9 اگست

1931 کو ہی کشمیری نمائندگان سے گفت وشنید کے لئے میٹنگ بلانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔لیکن ہری کشن کول نے ان نمائندگان کو بلا کر دھمکیاں دے کر واپس کر دیا تھا۔ اور مہاراجہ سے نمائندگان کی ملاقات منسوخ کردی گئی۔سری کشن کول کس کے ایماء پر کاروائی کررہا تھا؟ ہری کشن کول کے کانگریسی لیڈروں سے کیا تعلقات تھے؟اس دوران جب مولانا ابوالکلام آزاد شیخ عبداللہ سے ملے تھے تو اِن دو کے درمیان کن امور پر اتفاق سے ہی رائے قائم ہوئی تھی؟ کانگریس کے اندرون کشمیر سے متعلق کتنے دھڑے تھے اور کس کے ایماء پر شیخ صاحب نے جامع مسجد کے عوامی جلسے میں 28 اگست 1931 کو اعلان کیا تھا کہ اگر مہاراجہ کی حکومت نے دو ماہ کے اندر اندر اپنے وعدے پر عمل کر کے اصلاحات نہ کئے تو پنجاب اور ہندوستان سے لوگ کشمیر آکر کشمیریوں کے ساتھ مل کر قربانی پیش کریں گے؟ پنجاب تو سمجھ میں آسکتا ہے مگر ہندوسان سے شیخ صاحب کی مراد کیا تھی؟ ہندوستان سے انہیں کن لوگوں نے وعدہ دیا تھا؟ شیخ صاحب اپنی سوانح عمری میں ان امور پر خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا ہے اور فدا محمد حسنین نے اپنی کتاب ''کشمیر کی تاریخ آزادی میں'' 28 اگست 1931 کے عوامی جلسے کا حوالہ دیا ہے؟ لیکن خود اس معاملہ میں فدا محمد حسنین ن نے کوئی تحقیق ہی نہیں کی ہے ۔ بلکہ فدا محمد حسنین نے اپنی تحقیق کے بعد کہا ہے کہ 24 جولائی 1931 کو شملہ میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی میٹنگ ہوئی تھی جس میں مولانا شوکت علی ، مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر انصاری نے بھی شرکت کی تھی اور اس کمیٹی نے مرزا بشیر محمود قادیانی کو اس کمیٹی کا صدر چُنا تھا تا کہ یہ کمیٹی کشمیری مسلمانوں کی امداد کرے اور اس سلسلہ میں ''الفضل'' قادیان کے شمارہ 24 ستمبر 1931 کا حوالہ دیا ہے۔ مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر

انصاری نہ تو کشمیری تھے اور نہ کشمیری نژاد یہ کانگرنس کے اہم رکن تھے۔اس کمیٹی کے بعد بقولِ فدا محمد حسنین مولانا ابوالکلام آزاد نے مفاہمت کا رول ادا کیا تھا۔کانگریس اور مرزا بشیر الدین محمود قادیانی کے آپس میں کیا روابط تھے؟ یہ موجِ حوادث ایک طغیانی کیسے بنی؟ ڈاکٹر اقبال 1930 میں ہی مسلم لیگ کے جلسے کی صدارت کر چکے تھے اور پاکستان کا تصور انہوں نے نئی اختراع کیا تھا وہ کشمیر کمیٹی کے اجلاس سے کس غرض سے شامل ہوئے؟ اُنہوں نے کیا نظریہ پیش کیا تھا؟ یہ سب سوالات موجود ہیں مگر جوابات شرح ہنگامہ ہستی میں کہیں کھو گئے ہیں چونکہ ہماری زوال تحقیق اور ہمارا زوال شوق کُھلے رازوں سے بھی تغافل بخش رہا ہے اور ہماری آرزو شوق حقیقت کی طلب گار ہی نہ رہی کسی کشمیری تاریخ نویس نے تحقیق کرنا ہی گوارہ نہ کیا تھا۔ اور بقولِ داغ دہلوی، ہماری حب الوطنی کا یہ عالم ہے:

حیا نے روک لیا، جذب دل نے کھینچ لیا
چلے وہ تیر کی صورت کھینچے کمان کی طرح

اور ہمیں اپنی چالاکیوں پر اتنا ناز ہے کہ:

ادائے مطلب دل ہم سے سیکھ جائے کوئی
انہیں سُنا ہی دیا حالِ داستان کی طرح

اور اس طرح ہم نے اپنی تاریخ کو داستان بنا دیا ہے۔اس لئے یہ کہنا کہ 1932 میں شیخ صاحب کو اپنی پہلی ملاقات میں ہی پریم ناتھ بزاز نے سیکولر نظریہ کا قائل کر دیا تھا، مکمل سچ نہیں۔شیخ صاحب مولانا اسد سے بھی مل چکے تھے اور مولانا آزاد بھی ان کے خیر خواہ تھے۔شیخ صاحب کی توقعات کانگریس سے تھیں اور بقولِ شاعر:

نہ تعلقات کی حد کوئی

نہ توقعات کی حد کوئی

جو کچھ سمجھ میں نہ آسکے

وہ میں ایک فردِ حساب ہوں

اور پھر اُن کی سیاست کا لب لُباب یہی تھا:

شعلوں سے بھی جو کھلیں

دامن کو بھی بچائیں

کانگریس ان کا نشان راہ بن چکی تھی۔ اوران حالات میں وہ کشمیری عوام کی اشکوں کی آرزوئیں اور آنکھوں کی التجائیں'' لئے اُن کے واحد غمخوار بن گئے اور کشمیری قوم بقولِ جگر مرادآبادی

بے تابیوں نے کام دیا، دستِ ناز کا

آخر لپیٹ کے سُو گئے دردِ نہاں سے ہم!

آج بھی کشمیری قوم دردنہان سے لپیٹ کر سوئی ہوئی ہے۔

1930-31 میں آل انڈیا مسلم لیگ کا رول کیا تھا؟ ان کے حساسِ دل کشمیر کی شیون کا گریۂ پنہان کیوں نہ سمجھ سکتے تھے۔ کشمیر کے مرغزار اور گلستان تک وحشت زدہ تھے۔ کانگریس کشمیر میں قدم جما چکی تھی۔ زخم خوردہ مسلم لیگ کیوں خاموش تھی؟ حالات صاعقہ پیما بدل رہے تھے اور کشیر ایک حشر تیز دور سے گزر رہا تھا۔ ڈاکٹر اقبال کی صدارت میں اُمت شکستہ دل کو مسلم قومیت کے جذبہ ہائے بیکراں کی علمیت ہورہی تھی؟ لیکن کشمیری کانگریس کے دام میں آچکے تھے۔ یہ مشیت ایزیدی تھی کہ جناح صاحب ہندوستان کو خیر آباد کہہ کر لندن میں مقیم ہو چکے تھے۔ اسمایلی فرقہ

کے روحانی پیشوا آغا خان چاہتے تھے کہ محمد علی جناح، انگلستان کی پارلیمنٹ کا الیکشن لڑیں اور لیبر پارٹی کے ٹکٹ پر یہ انتخاب میں حصہ لیں تا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی آواز برٹش پارلیمنٹ کے ایوانوں میں گونجے۔ لیبر پارٹی اور توڑی پارٹی دونوں نے جناح صاحب کو ٹکٹ دینا اپنے مفادات کے منافی سمجھا تھا۔ یہ واقعہ جتلاتا ہے کہ انگریز جناح صاحب کے حامی نہ تھے چونکہ وہ اور مسلم اُمت کو مسلم قومیت کے راستے پر لے جانا چاہتے تھے۔ کانگریس کا یہ پروپگنڈہ کہ جناح صاحب کے انگریز خیر خواہ تھے، صرف انہیں بدنام کرنے کی سعی تھی اور جناح کو کانگریس نے انگریزوں کا طرف دار جتلا کر خوب بدنام کیا تھا۔۔ چونکہ گاندھی جی کی مسلم پرستی ہندوستان کے مسلم غلامان روسیاہ کی وفاداریوں سے اک سوز پنہاں لئے ان کے تار سخن کو نغمگی عطا کر رہی تھی، لیکن محمد علی جناح گاندھی کی سیاست کو ہندوستانی مسلمانوں کے مہیب و تیرہ شام غم سمجھتے تھے۔ گاندھی جی، جناح میں آبگینہ کے اندر مزاج سنگ دیکھ کر پریشان تھے اور جناح کا عزم طوفان بدوش تھا کہ:

خود موت سے حیات کے چشمے اُبل پڑیں

یہی جناح صاحب کی عظمت کی دلیل ہے۔

1931 میں وہ صرف اگست کے ماہ میں کچھ یوم کے لئے ایک بار اودھ کے ایک نواب یا تعلقدار کا اودھ ہائیکورٹ میں لندن سے مقدمہ لڑنے آئے تھے اور اُنہوں نے اس دوران لکھنو یونیورسٹی کے طلبا کی یونین سے خطاب کیا تھا۔ ڈاکٹر اقبال واحد لیگ کے رکن تھے۔ جو کشمیر کا معاملہ سنبھال رہے تھے اور رام زے میکڈانلڈ نے ایک بار پھر جناح صاحب کو بمبئی کے گورنر کے عہدہ کی پیش کش کی تھی۔ جو اُنہوں نے ٹھکرا دی تھی اور کہا تھا کہ مسلمان بکاؤ مال نہیں ہوتے اور اپریل 1931 کو جب

لارڈ ویلنگ ڈن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا تھا وہ جناح صاحب سے لندن میں ملاقی ہوا تھا اور ہندوسان کے مسلمانون کا نکتہ نگاہ معلوم کیا تھا۔ اس کے فوراً بعد جب وہ ہندوستان آیا کشمیر میں حالات بدل گئے تھے۔ کچھ تو ہے جن کی پردہ داری ہے۔ مسلم لیگ اُس وقت منتشر ہو چکی تھی ۔ اب انگریز صرف کانگریس کو واحد ہندوستان کا نمائندہ تصور کر رہے تھے۔ جناح کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ وینا ان کے ساتھ لندن میں تھی۔ جناح کے انگلستان جانے کے بعد 1931 سے 1934 تک مسلم لیگ انتشار کا شکار رہی۔ لیکن لیگ کے ذہن سے کشمیر محو نہیں ہوا تھا اور لیگ سے وابستہ ایک مسلم طالب علم نے (چوہدری رحمت علی) نے ایک پمفلٹ لندن میں شائع کیا تھا۔ جس کا عنوان تھا Now or Never اور پاکستان کا نام تجویز کیا تھا اس دستاویز پر کیمرج کے اسلم خان، شیخ محمد صادق اور عنائت اللہ خان نے اپنے دستخط ثبت کئے تھے۔ اور لیگ جناح کو واپس ہندوستان آنے کی درخواست کر رہی تھی۔ چونکہ اب مسلم لیگ میں مکمل انتشار تھا۔ اس لئے اب کانگریس کے لئے کشمیر میں راستہ صاف تھا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ لیگ میں اس قدر انتشار پھیل گیا تھا کہ اجمیری گیٹ کے روشن تھیٹر میں لیگ کا جو جلسہ بلایا گیا تھا وہ ہنگامہ آرائی پر ختم ہوا تھا۔ جس کے بعد جناں نے لندن منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ڈاکٹر انصاری نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ ایک نئی جماعت مسلم نیشلسٹ پارٹی بنانا چاہتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز حکومت ہندوستان کو ڈمینن (Dominion) کا درجہ دینا چاہتی تھی۔ ایک بات کی طرف میں توجہ دلاؤں گا کہ 1927 سے لے کر 1934 تک چین میں کمیونسٹ پارٹی طاقت بن چکی تھی۔ 1927 میں ماوزے تنگ نے اپنی شہرہ آفاق رپورٹ ہونان صوبہ کے دہقانوں سے متعلق پیش کی تھی۔ نان چنگ میں چواین رای

نے اگست 1927 میں بدنظمی پھیلانے کی منصوبہ بند تحریک چلائی تھی اور 1929 میں سرخ فوج تین صوبوں میں یعنی وُہان Wuhan، چنگ شاہ Changska اور نین چنگ Nan chang کو اپنا نشانہ بنا رہی تھی اور مئی 1931 میں سرج فوج نے سرکاری فوجوں کو فوجی طور پر پہلی بار پسپا کیا تھا اور سرخ فوج کی قیادت اب ماوزے تینگ کے ہاتھوں میں تھی۔ اس لئے اب انگریز ہندوستان میں خوفزدہ ہو گئے تھے۔ سرخ فوج کا لال جھنڈا اور سُرخ فوج کی پیش قدمی کے سائے اب انگریزی ذہن پر دراز ہونے لگے تھے۔ کانگریس دوکانداروں، تاجروں اور کارخانہ داروں کی جماعت تھی۔ گاندھی جی نے نیچی ذات کے ہندوؤں کو رام کیا تھا اور اُن کے جذبۂ غیرت کو بے کار بنا دیا تھا۔ سکھوں کی اکالی دل کو مغلوں کے جبر کی یاد دلائی تھی اور انہیں مسلمانوں سے بیزار کر دیا تھا۔ اس لئے انگریزی مفاد میں تھا کہ کشمیر میں جو ایک مسلم اکثریتی ریاست ہے وہاں سیکولر مسلم جماعت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ جو سیکولر ہندوستان یعنی کانگریس کی نکتہ نگاہ کی ترجمانی کر سکے۔ اس لئے کشمیریوں کی جرأت عوام کا نمائندہ شیخ عبداللہ کو قرار دیا گیا۔ اس لئے کہ مہاراج ادھیراج ہری سنگھ اس کے خلاف کوئی کاروائی ہی نہیں کر سکتا تھا۔ یعنی:

رہے آب و گل کی یہ کیاء ہے کہ چمن کی معجزۂ نمو

نہ خزاں ہے کچھ نہ بہار کچھ وہی خاروکس وہی رنگ وبُو

اور شیخ عبداللہ جانتا تھا کہ رزیڈنٹ کی خوشنودی کے بعد مہاراجہ اس کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کر سکتا تھا۔

اور مولانا آزاد کی مفاہمت کرانا اس بات کا اعادہ تھا:

میرے دارالاماں اے حریم نگار

لیکن شیخ عبداللہ بے ایمان نہیں تھا وہ رزیڈنٹ کی امان میں تھا۔

ہم پھریں کیا یونہی بے امان بے امان!

میں جب اس بات کا تذکرہ کرتا ہوں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مہاراجہ اور شیخ عبداللہ کے درمیان جولائی 1931 میں مفاہمت کرائی تھی۔ اس واقعہ کی تائید میں، میں صرف فدا حسنین کی کتاب ''ہسٹری آف کشمیر (جو شیخ صاحب نے بہت پسند فرمائی ہے) کا حوالہ دے سکتا ہوں۔ اس پہلو پر بھی اور مزید تحقیق ہونی چاہیے چونکہ اکیس دن کی گرفتاری کے بعد ہی قلعہ ہری پربت سے شیخ صاحب کو رہا کیا گیا تھا اور پھر 12 نومبر 1931 کو گلینی کمشن کا اعلان کیا گیا تھا اور گلینی کمیشن حکومت ہندوستان کا ایک اہم عہدہ دار تھا اور وہ مسلمانوں کی شکایات کا ازلہ کرنے کے لئے تحقیق کے بعد ایک رپورٹ پیش کرنے والا تھا۔ اور شیخ صاحب اس وقت صرف ملازمتوں میں کشمیری مسلمانوں کا حصہ چاہتے تھے وہ مہاراجہ کی حکومت قائم رکھنا چاہتے تھے اور ان ہی توقعات کو مدِ نظر رکھ کر مولانا آزاد مفاہمت کرا سکے تھے چونکہ ابو الکلام آزاد کے نظریات بہت واضح تھے۔ میں صرف ایک اقتباس اُن کی کتاب مسئلہ خلافت سے اخذ کروں گا۔ فرماتے ہیں:

''اسی بناء پر شارع نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام ''جماعت'' رکھا ہے اور جماعت سے علیحدگی کو جاہلتہ اور حیات جاہلی سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ آگے با تفصیل آئے گا'' میں جماعتہ، فمات، فمتہ جاھیلہ، غیر زالک'' اور اسی بناء پر کثرت حدیث و آثار موجود ہیں۔ جن میں نہایت شدت کے ساتھ ہر مسلمان کو ہر حال میں التزام جماعت اور اطاعتِ امر کا حکم دیا گیا۔ اگر چہ امیر غیر مستحق ہو، یا نااہل ہو، فحاش ہو، ظالم ہو، کوئی ہو بشرطیکہ مسلمان ہو اور نماز قائم رکھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک بہت جید عالم تھے۔ اسلام کے مفسر تھے۔ مگر اُن کی کمزوری یہ تھی کہ وہ قرآن و احادیث کی تشریح اور وضاحت بیان کرتے وقت اپنے سیاسی نکتہ نگاہ کو اہم زاویہ بنا دیتے تھے یعنی کانگریس کے نکتہ نظر کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے۔ شیخ صاحب نہ تو شاعر تھے اور نہ ہی عالم دین وہ صرف تلاوت کر سکتے تھے۔ مگر لہجہ خالص کشمیری جس سے عربی الفاظ کے معنی ہی تغیر حاصل کر سکتے تھے۔ مہاراجہ ہری سنگھ تو مسلمان بھی نہیں تھا۔ مگر اسے کانگریس کی خوشنودی حاصل تھی۔ مگر مفاہمت کے علاوہ وہ کوئی صورت ہی نہ تھی۔ کشمیر میں کانگریس کی آمد کے سب دروازے وا ہو گئے تھے۔ امیر جماعت اسلام سید انور علی مُودودی نے کبھی کشمیر آنا گوارہ ہی نہ کیا ہے۔ وہ جموں کی سرحد پر پٹھان کوٹ میں ہی ٹھہر گئے اور پھر تو یہ عالم تھا:

ہے مدتوں سے خانۂ زنجیر بے صدا

معلوم ہی نہیں کہ دیوانے کدھر گئے!

کشمیر میں کانگریس کا اثر و رسوخ ہونا قدرتی بات تھی۔ اس لئے اس وادی گلرنگ میں شرح ہنگام سیاست کون انجام دیتا؟ گلینی کمیشن کی سفارشات کے مطابق کئی اصلاحات عمل میں لائی گئیں اور انگریزی سیاست اس کا سارا فائدہ شیخ صاحب کی قیادت کو مضبوط بنانے میں صرف کر رہی تھی۔ مذہبی مقامات مسلمانوں کو واپس کرنے تھے۔ ملازمتوں میں بھرتی کے امکانات روشن ہو رہے تھے۔ اور اب زمین کے مالکانہ اور کاشتکارانہ حقوق بھی تسلیم کئے جانے لگے۔ اس طرح اب کشمیر میں شیخ صاحب کی لیڈرشپ مستحکم کر دی گئی تھی اور مسلم کانفرنس کے 19 اکتوبر 1932 کے اجلاس میں شیخ صاحب نے مسلم کانفرنس کو وسیع بنیادوں پر تشکیل دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ اب انگریز چاہتے تھے کہ کشمیر میں قانون ساز اسمبلی قائم ہوتا کہ شیخ صاحب کی

مسلم کانفرنس لوگوں کی نمائندہ جماعت بن کر اُبھرے۔ 1934 میں اسمبلی کے انتخابات کرائے گئے۔ اس اسمبلی کے کل ممبران کی تعداد 75 تھی۔ تفصیل حسبِ ذیل ہے:

انتخاب شدہ مسلمان ممبر 21 ہوں گے

انتخاب شدہ ہندو ممبر صرف 10 ہوں گے

انتخاب شدہ سکھ برادری کے صرف 2 ممبر ہوں گے

اور حکومت کے منتخب کردہ ممبر 30 ہوں گے

وزراء کو جو اسمبلی کے ممبر عہدہ کی بناء تھے پر 12 ہوں گے

اور کونسلرز کی تعداد 10 ہوگی۔

20 جنوری 1934 اس اسمبلی کی تشکیل کے لئے انتخابات کا اعلان ہوا۔ مسلم کانفرنس نے مسلمانوں کی 21 سیٹیں کامیابی سے جیت لیں تھیں۔ شیخ صاحب اب کشمیر کے مسلمہ لیڈر آئینی طور پر مقرر ہوئے تھے۔ پرجا سبھا کا پہلا اجلاس 17 اکتوبر 1934 کو طلب کیا کر لیا گیا تھا۔ اب شیخ صاحب نے محسوس کیا کہ اسمبلی میں اکثریت حاصل کرنے کے لئے انہیں غیر مسلم نمائندوں کی حمایت حاصل کرنا ہوگی۔ مسلم کانفرنس کو اس حربے کے ذریعہ اب نیشنل کانفرنس میں تبدیل ہو جانے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ انگریزوں کی حکمت عملی اور کانگریس کی ریشہ دوانیوں نے کشمیر میں لوگوں کا احساس دلایا کہ جمہوریت کے تقاضے بہت ہی ثمر آور ہو سکتے ہیں۔ جب مسلم کانفرنس سیکولر لبادہ اوڑھ کر عوام سے یہ کہہ سکے کہ ''خواب مرگ ہے تعبیر اس فسانے کی''۔ اس کے بعد 1936 میں شیخ صاحب کی پنڈت نہرو سے گوشہ گیر ہونے کا وقت آیا نہرو صاحب نے 1938 میں آل سٹیٹ پارٹیز کانفرنس بنائی اور شیخ

صاحب کو اس کا نائب صدر منتخب کیا اور شیخ صاحب کا اس اُمنڈتے ہوئے طوفان کو دیکھ کر یہ حال تھا۔ بقولِ غالبؔ:

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے

خانۂ عاشق مگر ساز صدائے آب تھا

انہیں اس سیلاب بے پناہ کی تباہیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا وہ تو مسرور تھے کہ یہ سیلاب بلا ان کے گھر کو صدائے آب کے زیر و بم کے ساتھ لے ڈوبے گا۔ تو کیا ہوا؟ اب رمزی اور ایمائی اغراض کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اب کُھلم کُھلا نیشنل کانفرنس کے وجود میں آنے کا وقت آ گیا تھا اور شیخ صاحب کانگریس کے ذہنی غلام بن چکے تھے

شیخ صاحب کی سیاست کے خدوخال تعین کرنے کے لئے ایک شخصیت کا نفسیاتی تجزیہ ضروری ہے۔ شیخ صاحب 1936 میں صرف اکتیس سال کے جذباتی قسم کے نوجوان تھے۔ ان کی جوانی اپنے عروج پر تھی لیکن اُن ذاتی خواہشات اور ترقی ابھی عظمت کی بلندیوں کی طرف پرواز کا رُخ کرنے کے باوجود فضاؤں میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ لڑکپن میں جو خواب اُنہوں نے دیکھا تھا کہ کوہِ نور اُن کے قدموں کے نیچے چمک رہا ہے ابھی تشنہ تعبیر تھا، اور اب آہستہ آہستہ خود پسند نواز شین ان کی خود پسندی میں اضافہ کر رہی تھی۔ سیاست کے دلفریب تجلیوں میں انہیں اپنی ذاتی بلندیوں کی راہ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی عمر کا تقاضا ہی یہی تھا چونک وہ ایک بہت پڑھے لکھے آدمی نہ تھے۔ اخبارات پڑھنے کا شوق عنقا تھا۔ ریڈیو عام نہ ہوا تھا۔ کشمیر میں کوئی اینٹی ایکچول ماحول ہی نہ تھا۔ لاہور میں بطورِ طالب علم وہ پنجابی قسم کے لوگوں سے سے بیزاری کا اظہار کر چکے تھے اور اب یہ بیزاری نفرت کی حدود سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس لئے جموں کے مسلمان انہیں ایک پنجابی ٹولہ میں دکھائی پڑتا تھا۔ کشمیری زبان نہ

بولنے والے مظفر آباد، میرپور کے لوگ انہیں انتہائی پس ماندہ طبقہ دکھائی دے رہا تھا جو صرف ان کی افتادگی راہ ثابت ہو سکتے تھے۔ وہ ان لوگوں کو کم تر انسان تصور کرتے تھے۔ اب شیخ صاحب اور اُن کی جنت بریں کے درمیان صرف کانگریس پلِ صراط ثابت ہو سکتی تھی۔ اپنی اوج کی جنت کو پانے کے لئے اُن کی راتوں کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ ان کا تو یہ حال تھا۔

جب کبھی چاند سے پگھلتی ہوئی چاندی برسے
اونگھتی رات کے شانے کو جھنجھوڑا ہم نے
بھول کر بھی کبھی پلکیں نہ جھکنے پائیں
اس قدر نیند کو آنکھوں سے نچوڑا ہم نے

اور اُنہیں کانگریس میں پلِ صراط دکھائی دیتی تھی۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جناح صاحب 25 جنوری 1910 جب وہ صرف 34 برس کے تھے ہندوستان کی لیجسلیٹو کونسل جو 60 ممبران پر مشتمل تھی کے ممبر تھے اور جن کے باقی ممبران اس وقت گوپال گھوکھلے، موتی لال نہرو، سریندرناتھ بنرجی تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندہ کے طور پر لارڈ منٹو وائسرائے سے کُھلم کُھلا اُلجھ گئے تھے۔ ذاتی مفادات کی پرواہ نہ کی اور کانگریس انہیں کبھی خرید ہی نہ سکی یہ معاملہ جس پر جناح اُلجھے تھے۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانی قبیلوں کے جانے سے متعلق تھا اس وقت گاندھی جی جنوبی افریقہ میں ہندوستانی قلی طبقہ کے ٹرانسوال میں ستہ گرہ میں شریک تھے اور 17 مارچ 1911 میں جناح صاحب نے اسمبلی میں وقت ٹیکس سے چھوٹ کا بل پیش کیا تھا۔ جو کسی بھی ہندوستانی ممبر نے اپنا بل یعنی پرائیوٹ بل پیش کرنے کی جرات ہی نہیں کی تھی۔ اس لئے یہ بل پیش کرنا ایک نئی جدت قرار دیا گیا

۔گھوگھلے چاہتے تھے کہ جناح ، ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کا رول ادا کریں اور پھر جنوری 1915 میں گجرات سوسائٹی نے مہاتما گاندھی کو استقبالیہ دیا تو گاندھی نے اپنی تقریر میں جناح کو محمڈن کہہ کر اُن کی شخصیت کو پست کرنا چاہا تھا۔انگریزوں نے پہلی بار جناح کو بمبئی کے گورنر کا عہدہ دینا چاہا۔مگر جناح صاحب نے صاف ٹال دیا تھا۔ یہ تھا جناح صاحب کا رویہ اور جناح کی قابلیت کا اندازہ اس بات سے عیاں ہے کہ 1910 میں وہ ہندوستان کی سنٹرل لیجسلز کے ممبر بمبئی سے انتخاب لڑ کر آئے تھے۔ اس وقت وہ 34 برس کے نوجوان تھے اور ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خود مولانا محمد علی جو خلافت تحریک کے روح رواں تھے۔کامریڈ اخبار کے ایڈیٹر تھے۔جن کی وجہ سے خلافت تحریک میں گاندھی جی کو مسلمانوں کی حمائت حاصل ہوئی تھی اور گاندھی جی ایک آل انڈیا لیڈر بن گئے تھے۔ذاتی طور پر جناح صاحب سے اپیل کی تھی کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہوں اور یہی اپیل اُس وقت مسلم لیگ کے سیکریٹری سید وزیر حسن نے بارہا کی تھی اور ان دو حضرات کی اپیل پر جناح صاحب نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کیا تھا۔جناح صاحب عالمِ شباب میں ذاتی مفادات کو پس پُشت ڈال چکے تھے ۔کانگریس کا یہ پروپیگنڈا کہ جناح صاحب کو جوانی میں کامیابی نہ ملی تھی اور وہ اپنی انا کی تسکین کے لئے دوقومی نظریہ اپنانا چاہتے تھے۔حقیقت سے بعید ہے۔جناح بمبئی مسلم سٹوڈنٹ یونین کے صدر رہ چکے تھے اور نوجوانوں کے بے تاج بادشاہ تھے۔اس بات کا تذکرہ بڑے دلچسپ انداز میں محمد علی کریم چھاگلا سابق چیف جسٹس بمبئی ہائیکورٹ نے اپنی کتاب Roses in December میں صفحہ 25 پر کیا ہے ۔اور اسی دوران وہ ہندوستان کے نوابوں ، جاگیرداروں ، اور چھوٹی ریاستوں کے سربراہوں کے قانونی مشیر بن چکے تھے۔اور راجہ محمود آباد اُن کے مداحوں میں تھے۔

میاں سر محمد شفیع اور سر فیصل حُسین اور بنگال کے اے، کے، فضل حق جناں صاحب کی سیاست کے قصیدہ گو تھے اور فضل حق نے اعلانیہ کہا تھا کہ وہ ہندوستان کی مسلمانوں کی جانب سے جناح کا تشکر ادا کرتے ہیں۔ یہ عام واقعات مسلم لیگ کی دستاویزات میں موجود ہیں اور سید شریف الدین پیرزادہ نے اپنی کتاب فاؤنڈیشن آف پاکستان مسلم لیگ کے دستاویزات کا حوالہ دیتے ہوئے (جلد نمبر ایک) جس میں (1906 سے 1924) تک کے دستاویزات شامل ہیں۔ اس کا تذکرہ کیا ہے اور یہ تشکر مسلم لیگ کی جانب سے 1916 میں ادا کیا گیا جب جناح صرف 35 برست کے تھے۔ لیکن جناح میں انانیت بالکل نہ تھی وہ ایک (Missionary) تھے۔

میں نے شیخ صاحب اور جناح صاحب کا موازنہ اس لئے کیا ہے کہ کشمیر ایک مسلم اکثریتی ریاست تھی اور شیخ صاحب مسلمانوں کے سربراہ تھے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تھی مگر مسلمان ہندوستان میں اقلیت تھے اور جناح نے اپنی ذاتی خواہشات کو جو تیس، پچیس برس کے سن میں انسانی جذبات اور خواہشات میں تلاطم پیدا کرتی ہیں اور طغیانی کی صورت میں دل ودماغ پر چھا جاتی ہیں اور نسان چاہتا ہے کہ زمانہ صرف اس کی واردات کو سنے اور صرف اس کی ذات کو برقِ صفات سمجھے، اور یہ خواہش ایسی ہوتی کہ :

جیتی ہوئی بازی محبت!

کھیلا ہوں اور مات ہوگئی!

اور خود پسند لوگوں کو آخر اپنی ہی وجہ سے مات ہو جاتی ہے اور لوگوں کا حسن تعین خود بخود بدگمانی میں بدل جاتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی عمل ہے۔ اپنے مضموں میں آگے بڑھنے سے قبل میں ایک بات کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں کہ 28 اگست

1931 کو شیخ صاحب نے جامع مسجد سرینگر میں قرآن پاک کو ہاتھ میں اُٹھا کر
لاکھوں لوگوں کے سامنے حلف لیا تھا کہ وہ اپنی زندگی قوم کی خدمت کے لئے وقف
کردیں گے اگر قوم انہیں اپنا نمائندہ تصور کرے گی اور پھر شیخ صاحب جیسے آتش زبان
نے مساجد میں جا کر اپنی تقریر قرآن پاک کی لحن داوری میں تلاوت سے شروع کی
کبھی درود پڑھے، کبھی منقبت پڑھے اور مساجد کو تشہیر کا سامان بنا دیا اور اس طرح شیخ
صاحب مسٹر بھی بنے اور مولانا بھی بنے"

اس کے برعکس جناح صاحب نے کبھی ذاتی شہرت کے لئے مذہب کا سہارا
ہی نہ لیا۔ نہ داڑھی رکھی، نہ رومی ٹوپی پہنی نہ مغربی لباس چھوڑا نہ اپنی تقاریر میں قرآن
پاک کی لحن داودی میں تلاوت کی نہ درود پڑھے نہ منقبت گائے نہ لوگوں کی جھوٹی آس
بندھائی نہ قوم سے استدعا کی کہ وہ انہیں نمائندگی کا حق عطا کرے نہ قوم سے مساجد
میں وعدہ کیا کہ وہ زندگی اسلام کے لئے وقف کرتے ہیں۔ چونکہ قومی خدمت مسلمان
کا فرض ہے جس کا کوئی تعلق وعدہ وفا سے ہے ہی نہیں۔ نہ کبھی جناح صاحب نے
شاعر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ نہ کبھی مسجد کے منبر سے خطاب کیا۔ نہ علمائے دین جن کا
ہندوستان پر غلبہ تھا ان کی آشنائی اور خیر خواہی کے طالب ہوئے۔ نہ دیو بند گئے نہ
جمعیت علمائے اسلام سے آشرواد چاہا۔ نہ کبھی اپنے اسمائیلی ہونے میں جو اُن کے لئے
آگ کا مُول ثابت ہو رہا تھا کوئی قباحت محسوس کی۔ لباس، طرزِ معاشرت، گفتگو میں
جدیدیت اختیار کی، لوگوں کو یاد ہوگا جب مسلم لیگی حسرت موہانی نے کہا تھا کہ مسلمان
لیڈر کا لباس اور وضع قطع خالص اسلامی ہونا چاہئے اور یہ اعتراض بھی عوامی جلسے میں
کیا تھا۔ تو جناح صاحب نے حسرت موہانی کو جو ایک غزل گو شاعر تھے، نظر انداز
کر دیا تھا چونکہ وہ اور ڈاکٹر سر محمد اقبال سمجھتے تھے کہ اسلام اور جدیدیت میں کوئی تضاد

ہی نہیں ہے۔ اس لئے ڈاکٹر اقبال نے بھی چہرہ پر داڑھی کی آرائش سے ہمیشہ احتراز کیا تھا اور اس پس منظر میں مولانا محمد علی جوہر اور سید وزیر حسن نے جناح صاحب سے اصرار کیا کہ مسلم قوم کی قیادت وہ قبول کریں اور مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں اور ان کی استدعا پر 1931 میں جناح صاحب لیگ میں شامل ہوئے اور مسلم اُمت کی امید گاہ کے امام ثابت ہوئے۔ اس زمانے میں اسلامی اقدار ہی مسلمانوں کے درد کا اندمال تھیں۔ لیکن جناح صاحب لباس، طرزِ معاشرت، گفتگو کی زبان کو اسلامی اقدار کی روح نہیں جانتے تھے۔ وہ اہلِ بیت محمد کی طرح فرض نبھانا تقدیر کا دامن پکڑنا تصور کرتے تھے۔ جب مسلم لیگ، انتشار کا شکار ہوئی تو جناح صاحب 1930 میں لندن چلے گئے اور پھر 1934 میں لیاقت علی خان کا بیگم رعنا لیاقت علی سے ازدواج ہوا، دونوں لندن چلے گئے اور رعنا لیاقت علی خان جو بلا کی حسین تھی اور عالم شباب اُن پر پھوٹ پڑا تھا۔ جن کی نگاہوں میں لیاقت علی کو ''ہر گل مجھے پیمانہ نظر آتا ہے اور تیری آنکھوں میں میخانہ نظر آتا ہے'' اب دونوں جناح صاحب سے لندن میں ملاقی ہوئے اور رعنا لیاقت علی خان نے ادائے حُسن کی معصومیت کا سہارا لے کر جناح صاحب سے التجا کی کہ وہ ہندوستان آکر مسلم لیگ کی قیادت سنبھالیں چونکہ اب مسلم لیگ پُلِ صراط سے گزر رہی ہے۔ رعنا لیاقت عللی نے انہیں رتی کی یاد دلا دی اور 1934 ہی میں وہ واپس ہندوستان تشریف لائے۔ ڈاکٹر اقبال سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ 1935 میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ کر دیا گیا اور 1937 میں انتخابات عمل میں لائے تھے۔ تمام علماء جناح صاحب کے حریف تھے۔ جماعت اسلامی ہند تو مخالفت میں پیش پیش تھی اور 1935 کے ایکٹ کا مقصد ایک فیڈریشن کے تصور کو قائم کرنا تھا۔ 1973 میں کانگریس نے تمام

صوبوں میں اکثریت حاصل کرلی تھی۔ جہاں کانگریس پارٹی کی حکومتیں قائم ہوگئی تھیں
، گیاراں صوبوں میں کُل 1585 اسٹیٹیں تھیں۔ کانگریس نے 716 پر کامیابی حاصل
کی تھی۔ لیکن کانگریس ٹکٹ پر صرف 26 مسلمان کامیاب قرار دیئے گئے تھے۔ یہ وہی
وقت تھا جب جناح صاحب نے کانگریس کو Leave the Muslims
Alone کے فلک شگاف نعرے سے خوفزدہ کردیا تھا۔ چونکہ گیارہ صوبوں میں
صرف 26 مسلمانوں کا کامیاب ہونا، مسلمانوں کے لئے آمد بہار نہیں بلکہ آتش
بگولوں کے اُٹھنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ لیکن شیخ صاحب کانگریس کی کامیابی
سے رمِ خوردہ تھے۔ وہ جواہر لال نہرو سے ملے اور کانگریس کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ چونکہ
پنجاب میں مسلم لیگ صرف ایک سیٹ جیت سکتی تھی اور فضل حسین کی یونی نسٹ پارٹی
95 سیٹیں اور کانگریس 18 سیٹیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تھی اور بنگال میں
صرف 39 سیٹیں مسلم لیگ حاصل کرسکی اور کانگریس کو 54 سیٹیں ملی تھیں۔ صوبۂ
سرحد اور سندھ میں مسلم لیگ کا وجود ہی نہ تھا۔ حتیٰ کہ سندھ میں مسلمانوں کی
آبادی 72 فیصد تھی۔ صوبۂ سرحد میں خان عبدالغفار خان کا دور دورہ تھا اور ڈاکٹر خان
صاحب نے حکومت قائم کرلی تھی جو غفار خان کے برادر تھے اور خان عبدالغفار خان
گاندھی جی کے زبردست حمایتی تھے۔ یوپی میں کانگریس نے 140 میں
سے 134 سیٹیں حاصل کرلی تھیں۔ مسلم لیگ کل 29 اور ایک سپیشل سیٹ حاصل کرسکی
تھی اور اس طرح اب کانگریس چھ بڑی ریاستوں میں حکومت قائم کررہی تھی۔ اور
1937 کے انتخابات مسلم لیگ کی ناکامی کا اعلان ثابت ہوئے تھے۔ کانگریس کی
1937 کے انتخابات میں کامیابی دیکھ کر شیخ صاحب کی نگاہیں خیرہ ہوگئیں۔ کانگریس
کی کامیابی کی چکاچوند اتنی زبردست تھی کہ شیخ صاحب سمجھنے لگے:

اب کہاں زمانے میں دوسرا جواب اُن کا
فصل حُسن ہے اُن کی موسم شباب اُن کا

شیخ صاحب عالمِ شباب میں تھے۔ کانگریس پر شباب آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی شیخ صاحب کی اُمیدوں، خواہشوں، آرزوؤں، تمناؤں پر بھی شباب آیا تھا۔ اُن کی بلندیوں پر جانے کا راستہ صرف آل انڈیا نیشنل کانگریس کے دامن سے گزرتا نظر آتا تھا اور کانگریس کی کامیابی ایسی تھی جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے:

"شیخِ حرام بھی شہر خرابات میں آ گئے
کرتے ہیں توبہ، توبہ خود اپنے ہی نام پر

شیخ صاحب کو یقینِ کامل تھا۔ یہ اُن کا اعتقاد تھا۔ یہ اُن کی خواہشات کا اقتصا تھا۔ یہ اُن کا استدلال تھا کہ پاکستان اگر وجود میں آیا بھی تو وہ ڈاکستان ثابت ہوگا۔ ڈاکستان ایک کشمیری لفظ ہے جو "ویرانہ اور وحشت" کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جب مالی بدحال انتہا کا رنگ اختیار کرے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریزوں نے مسلم اکثریتی صوبہ جات یعنی صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان، مسلم بنگال کی پسماندگی قائم رکھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ ان علاقوں میں نہ تو تعلیمی ادارے تھے اور نہ ہی ترقی کی اور کوئی راہیں تھیں۔ نہ کارخانے تھے نہ فیکٹریاں تھیں۔ نہ کاروبار کے ادارے تھے نہ بنکوں کی سہولیات عام تھیں نہ شہر اور دیہات کے درمیان آمد ورفت کے ذرائع فروغ پا سکتے تھے۔ یہ علاقے حد درجہ پس ماندہ تھے۔ صرف کراچی بندرگاہ ہونے کی وجہ سے خوشحال تھا۔ زرعی اصلاحات کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دی گئی تھی اور ساہوکاروں اور سود خوروں نے دہقانوں کا لہو تک چاٹ لیا تھا۔ وڈیرے جاگیردار اور بڑے بڑے زمینداروں نے عوام کا بھرپور استحصال کیا تھا۔ جو رسم ورواج کی زنجیروں

میں جکڑے ہوئے تھے۔ سماج میں بے بسی اور کسمپرسی دم بدم پھیل رہی تھی۔ صرف پنجاب کا پنجابی بولنے والا طبقہ خوشحال تھا اور شیخ صاحب اس خیال سے زہر آب ہو رہے تھے کہ پاکستان میں کشمیر کبھی معاشی خوشحالی کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے اور پنجابی مسلمان کشمیری مسلمانوں کی شناخت تک مٹا دیں گے۔ حتیٰ کہ ابھی لیگ نے پاکستان کے تصور سے اپنی جلالت میں اضافہ کرنے کا خیال تک ذہن میں نہ لایا تھا۔ عصرِ حاضر کے مشہور مورخ عائشہ جلال نے رائے ظاہر کی ہے کہ جناح صاحب پاکستان کا نام لے کر انگریزوں اور کانگریس سے مسلمانوں کے حق میں کچھ منافع بخش سوادطے کرنا چاہتے تھے۔ ان حالات میں لیگ کی الیکشن میں ناکامی نے مہمیز کا کام دیا" اور اب شیخ صاحب کی سیاست کا یہ حال تھا:

روشن ہے رخش عمر کہاں دیکھیے

نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

وہ کانگریس کی کامیابی سے مسحور ہو گئے تھے۔ اور اسی زمانے میں شیخ صاحب لاہور تشریف لے گئے۔ میاں افتخار الدین کے ہاں قیام کیا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب پنڈت نہرو لاہور تشریف لائے تھے اور شیخ صاحب کے ہمراہ صوبہ سرحد کے دورہ پر گئے جہاں خان عبدالغفار خان کا طوطی بول رہا تھا۔ اور پنڈت جی نے شیخ صاحب کو ترغیب دی کہ مسلم کانفرنس کا نام بدل کر نیشنل کانفرنس رکھا جائے اور سیکولرازم کو گوہر مقصود جان لیا جائے۔ اس نصیحت پر شیخ صاحب نے بھرپور عمل کیا اور واپسی پر 11 جون 1939 کے اجلاس میں جموں کشمیر مسلم کانفرنس کا نام جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس تجویز ہوا۔ اور مجاہد منزل اس نئی جماعت کا ہیڈ کوارٹر مقرر کیا گیا۔ مئی 1940 میں میرواعظ یوسف شاہ نے ازسرِ نو جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کا احیا کیا تھا

اور کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ ''کشمیر کی راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں''؟ کشمیریوں کی سوچ پر دھند چھا گئی تھی۔

یہاں ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ یورپ میں جرمنی جنگ عظیم اول کی شکست کے بعد ہٹلر کی قیادت میں ایک زبردست فوجی اور کاروباری طاقت بن کر اُبھرا تھا۔ جرمنی کے کارخانے انگریزوں کے لئے وبال جان ثابت ہو رہے تھے اور پہلا کام جو ہٹلر نے کیا وہ افغانستان میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا تھا اور افغان فوج کی تربیت نو کا کام جرمنی نے سنبھالا تھا اور افغانستان اب جرمنی پر انحصار کر رہا تھا اور افغانستان جرمنی کو خام مال یعنی سونا، نکل، پیٹرول، گیس دینے پر رضامند ہوا تھا۔ دسمبر 1935 میں افغان، جرمن مذکرات کا آغاز ہوا تھا اس کے بعد افغان سربراہ جرمنی گئے 1936 کا زمانہ تھا اُن کا شاندار استقبال کیا گیا۔ فیض محمد خان وزیر خارجہ نے ہٹلر سے بذاتِ خود ملاقات کی اور جرمنی کو اپنا بڑا بھائی کہا تھا۔ اس کے بعد وزیر خارجہ فیض محمد خان ماسکو گئے اور روس سے جنگ نہ کرنے کے معاہدے پر دس سال کے لئے توسیع کر دی گئی۔ 1938 میں جرمنی نے چیکوسلواکیہ پر قبضہ کر لیا تھا اور پھر جرمنی نے افغانستان کو ایک کروڑ پچاس لاکھ مارکس کا جنگی سامان بطور قرضہ دینے پر رضامندی ظاہر کی تھی اور 1939 میں جرمنی نے ایک معاہدہ کے تحت افغانستان میں تعمیرات کاموں کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ یہ سب کچھ اس کے لئے ہو رہا تھا کہ اب جرمنی اور انگلستان جنگ کے دہانے پر کھڑے تھے اور جرمنی کو صرف افغانستان سے خام اشیاء دستیاب ہو سکتی تھیں۔ اب انگریز کافی متفکر نظر آئے تھے۔ اگر جرمنی نے افغانستان میں ہوائی اڈے قائم کر لئے تو ہندوستان جرمن حملوں کے زد میں آ سکتا تھا یا پھر قبائلی علاقوں نے انگریزوں نے افغان حکومت کے خلاف سردار اپنی سے بغاوت

کروادی تھی۔ اب سیاست کی پیچیدگیاں، تارہائے عنکوت، کاکل کے خم و پیچ، خیالات کی زلف پریشان ایسے اُلجھ گئے کہ عقل وفہم سے عقدہ واہی نہیں ہوسکتا تھا۔ عقل ابھی تو پھر سلجھی ہی نہیں اور مناظر دشت ودمن اتنے مہیب دکھائی دیتے ہیں کہ تلاشِ حق کے راہرو کے قدم اُٹھتے ہی نہیں اور اب صرف دانشور طبقہ معجزہ ہائے سخن کی نمائش کرسکتا ہے۔ مگر حقیقت تک پہنچ ہی نہیں سکتا ہے یہ عالم ہندوستان کے سیاست دانوں کا ہے۔

میرا اشارہ اس تھیوری کی طرف جس کی رُو سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ کانگریس اور برٹش خفیہ ایجنسیوں کے درمیان تال میل تھا اور کانگریس کے کہنے پر اور برٹش کی خفیہ ایجنسیوں کی اعانت سے جرمنی کو گمراہ کرنے کے لئے اور ہندوستان کو جرمنی سے محفوظ رکھنے کے لئے سبھاش چندر بوس جیل سے فرار ہوکر کابل پہنچے تھے یہ واقعات یعنی بوس کی فراری کے واقعات ایک کتابی صورت میں ایک شخص غلام سرور نے شائع کئے ہیں۔ غلام سرور وہی شخص ہے جس کے مکان میں سبھاش چندر بوس کچھ عرصہ کے لئے کابل میں ضیاالدین کے نام سے ٹھہرے تھے اور بوس کو پشاور سے کابل تک جس شخص نے پہنچایا تھا اس کا نام آباد خان تھا۔ آباد خان ایک ڈبل ایجنٹ تھا کچھ عرصہ بعد برطانوی خفیہ ایجنسی شک وشبہات کا شکار ہوگئے اور آباد خان کو پشاور میں گرفتار کیا گیا تھا اس کو انٹروگیشن بے رحمانہ ہوئی تھی اور اس کا پولیس نے استنفار قلم بند کیا جو بہت ہی زیادہ طویل تھا اور 26 صفات پر مشتمل تھا۔ اس سے قبل بوس نے کانگرنس پارٹی سے تحریری وزبانی طور پر ہندوستان سے فرار ہونے کی استدعا کی تھی۔ اسے زبانی طور فرار ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ پہلے تقریباً ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک بوس نے داڑھی اُگائی تھی اور ضیاالدین کے نام سے کلکتہ سے پشاور تشریف

لے گئے تھے اور اس طرح ایک مسلمان مولانا کے روپ میں ٹرین سے سفر کر کے وہ پشاور پہنچے۔ یہ باتیں آباد خان کے 161 ضابطہ فوجداری کے بیان میں درج ہیں۔ آباد خان کے بیان کے مطابق وہ 17 جنوری کو پشاور پہنچے اور پھر وہاں اُنہوں نے ٹھہرنے کے لئے تاج ہوٹل کا انتخاب کیا تھا اور تاج ہوٹل میں کئی دن گزارے۔ آباد خان نے جو بیان پولیس میں درج کروایا تھا اس میں درج ہے کہ بوددس یوم تک کمرہ نمبر 6 تاج محل ہوٹل میں ٹھہرے تھے اور غفار خان سے وابستہ پٹھانوں سے رابطہ قائم کیا تھا۔ یہاں سے دو پٹھانوں یعنی رحمت خان اور ایک آفریدی پٹھان کے ہمراہ وہ کابل پہنچے تھے اور پشاور سے ہی بوس کو ہدایت دی گئی وہ بہرے اور گونگے شخص کے طور پر سفر کریں اور رحمت علی خان نے انہیں برادر صغیر ظاہر کیا تھا جو بوس کو پیر سخی کی زیارت پر لے جانا چاہتا تھا۔ اور پھر لعل پور کے افغان سردار نے ایک خط اسی مضمون کا رحمت خان کے حوالے کیا تھا اور اس طرح یہ تینوں اشخاص دریائے کابل کے کنارے پہنچ گئے اور پھر ان کے لئے چمڑے کی مشک کا انتظام کیا گیا اور اس کے ذریعہ ان تین اشخاص نے دریائے کابل عبور کیا تھا۔ اس وقت کابل میں صرف پشتو ہی نہیں بلکہ فارسی اور دردی زبان بھی رائج تھی۔ پہلا کام رحمت خان نے سویٹ سفیر سے رابطہ قائم کیا جو فارسی زبان بولتا تھا۔ لیکن رحمت خان صرف پشتو جانتا تھا۔ نتیجہ کے طور پر آباد خان کے بیان کے مطابق بوس چالیس روز تک کابل میں مقیم رہے تھے اور یہاں اُنہوں نے جرمن اور اطالوی لوگوں سے رابطہ قائم کیا تھا اور اب بوس محوری طوقتوں کے ساتھ مل چُکا تھا۔ بوس جرمن اطالوی اور جاپانی سفارت خانوں سے کیسے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس بات کا ثبوت جرمنی کے سفیر مقیم کابل کی تار نمبر 32 اور دیگر تارہا جو 18 دسمبر 1939 سے 30 جون 1942 کے ذخیرہ میں

موجود ہیں اور ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کابل میں آخری رات بوس پٹرو قارونی جو اطالوی سفیر تھے کے مہمان رہے تھے اور 18 مارچ کی صبح کو جاپان نہیں بلکہ جرمنی جانے کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ ان دنوں اٹلی نے لیبیا پر قبضہ کیا تھا اور اطالوی ذرائع ابلاغ نے اٹلی کو اسلامی طاقت ہونے کا پیغام دیا اور مسولنی نے سیف السلام کا لقب اختیار کیا تھا اور افغانستان کا معزول بادشاہ امان اللہ خان اٹلی کی حکومت کا شاہی مہمان تھا۔ لیکن افغانستان کی حکومت نے غیر جانبدار رہنے کا اعلان کر دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سردار ایپی انگریزوں سے ناراض ہو کر اب اُن کا دشمن بن چکا تھا اور جرمنی اور اٹلی اس کی فوجی امداد پر آمادہ ہوئے تھے۔ جرمنی نے بھی بوس کو بھاری مالی امداد دی تھی کہ وہ سردار اپنی بغاوت میں اگر شریک نہیں ہو سکتا ہے تو ہندوستان میں سیاسی افراتفری پھیلانے میں امداد کے کرے۔ عین اس زمانے میں رابن ٹراپ نے کابل میں جرمن سفیر کو اطلاع دی تھی کہ جرمنی نے روس پر حملہ کر کے کافی کامیابی حاصل کر لی ہے اور اس لئے افغانستان کو جرمنی کا حلیف بننے کا اعلان کرنا چاہیے۔ یہ تار 11 جولائی 1941 کو دیا گیا تھا۔ لیکن افغان حکومت نے غیر جانبدار رہنے کی پالیسی پر سختی سے عمل کیا تھا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ سب باتیں انگریز حکومت کو کچھ جاسوسی ادارے پہنچا رہے تھے۔ یہ بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلح بغاوت پنجاب اور صوبہ سرحد میں سردار آپئی کی قیادت میں شروع نہ ہو اس لئے کانگریس نے ''ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک'' صرف انگریزوں کے مفاد میں شروع کی تھی بلکہ انگریزوں کے کہنے پر شروع کی تھی۔ بلکہ انگریزوں کے کہنے پر شروع کی تھی۔ چونکہ صوبہ سرحد اور پنجاب کے مسلمان جرمن ہتھیار ملنے پر کچھ بھی کر سکتے تھے۔ مگر آزاد ہند فوج بننے کے بعد ہندوستان میں فوجی بغاوت کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔ انگریز جانتے تھے کہ ہندوستان

میں اُن کا نو آبادیاتی نظام آخر ہچکیاں لے رہا ہے۔ اس لئے حکومت کانگریس کے حوالے کی جائے جو کارخانہ داروں، تاجروں، دوکانداروں اور متمول درمیانہ طبقے کے لوگوں کی جماعت تھی اور جو روس کی کمیونسٹ انقلاب کو ہندوستان میں آنے سے شوسل ازم کے فریب خوردہ نام سے روک سکتی تھی۔ یہ جماعت حکومت کی حقدار تھی۔ اس لئے کشمیر میں بھی کانگریس جماعت سے وابستہ سر گوپل سوامی اینگر کو مہاراجہ کی رضامندی سے کشمیر کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا تھا اور نیشنل کانفرنس کے قیام کے بعد پنڈت نہرو کے ایماء پر کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ بی، پی، ایل، بیدی اور اُن کی انگریز اہلیہ فریدہ کشمیر آئے تھے اور شیخ صاحب کے قریبی ساتھیوں میں شمار ہونے لگے تھے نئے کشمیر کا مینو فسٹو بی، پی، ایل، بیدی نے پنڈت جی کی ہدایات کو مد نظر رکھتے ہوئے تحریر کیا تھا۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ کشمیر میں بھی کانگریس نواز حکومت سوشل ازم کے نام پر کمیونسٹ سیلِ بے پناہ کے لئے بندھ کا کام دے گی۔ کمیونسٹ انقلاب صرف کشمیری مسلمانوں کی اعانت سے ہندوستان میں تہلکہ مچا سکتا تھا چونکہ کشمیری مسلمانوں ذہنی طور پر بہت Flexible ہیں بالشویک ازم ہی نہیں ان کو فائدہ پہنچا سکتا تھا۔ وہ اعلانیہ کہہ رہے تھے:

پاس اپنے کیا رہا، بس ایک غرور مفلسی
اس کی کیا قسمت لگائیں اس کیا سودا کریں؟

اورانہیں ان کی تاریخ نے سکھایا:

ایک دو پل ہی رہے گا سب کے چہروں کا طلسم
کوئی ایسا ہو کہ جس کو دیر تک دیکھا کریں

اس بات کی تصدیق اس والہانہ استقبال سے ہوتی ہے جو کشمیری عوام نے

روسی وزیراعظم خروشیف کو 1955 میں سرینگر میں دیا تھا۔ اتنی زیادہ عوامی حمایت تو خروشیف اور بلگانن کو کبھی ماسکو میں ملی ہی نہیں تھی۔ روسی وزیراعظم حیران تھا کہ کیا کشمیر میں انگریزوں کا کوئی اثر ہی نہ تھا؟ کیا کشمیر کا مغرب سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا؟ وسط ایشیاء میں جانے کے بجائے روس کشمیر کیوں نہیں آیا؟ انگریزوں نے اسی لئے کشمیر کو کانگریس سے قریب رکھنا چاہا تھا کہ صرف کشمیر سے ہی کمیوازم ہندوستان میں داخل ہوسکتا تھا اور کانگریس کا کام کمیوازم کو روکنا تھا۔

میں نے ان واقعات کو ایک پس منظر میں دیکھنے کی سعی کی ہے۔ چونکہ یہ نلگۂ نگاہ کہ "ہندوستان چھوڑ دو کا نعرہ" صرف انگریزی مفادات کی تقویت کے لئے اختراع کیا گیا تھا اور ہندوستان میں مسلح جدوجہد کے تقاضوں کو سبھاش چندر بوس کو ہندوستان سے فرار ہوکر ہندوستان سے باہر محوری قانون کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے کا ازن دے کر انگریزی سامراج کو محمد رفیع سودا کی زبان میں: تیرا دل میں ہوں اور ہو میرا دل تو" کا پیغام دیا تھا۔

1944 میں کانگریس کے ایماء پر یہی قیاس اغلب ہے جناح صاحب کو شیخ صاحب نے کشمیر آنے کی دعوت دی تھی۔ یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ یہ جانتے ہوئے کہ پنجاب کے مسلمانوں کی لسانی، معاشرتی، سیاسی، کلچرل تہذیب سندھ، بلوچستان، صوبۂ سرحد اور مسلم بنگال اور اُن کے آپس میں خود تہذیبی اختلافات انتہائی نمایاں ہیں اور فی الفور ختم ہو ہی نہیں سکتے ہیں چونکہ یہ اختلافات نمایاں تھے نہیں یہ علاقے جات سوائے مغربی پنجاب کے اتنے پسماندہ تھے کہ صاف ظاہر تھا کہ پاکستان میں ان علاقہ جات کے لئے سوال یہ ہوگا:

سامانِ خورد و نوش کہاں سے لاؤں

آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں؟

23 مارچ 1940 کو آج جہاں منارہ پاکستان نصب ہے ایک عوامی جلسہ میں جناح صاحب نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا اور بقولِ خواجہ میر درد

'بند احکام عقل میں رہنا
یہ بھی اک انوکھی حماقت ہے"

اس تصور نے برصغیر کے مسلمانوں کے دل و دماغ میں آگ لگا دی جو جنگل کی آگ کی طرح ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ نہ تو جماعت اسلامی کی کٹ ملایئت اور نہ ہی جمیعت العلماء ہند کی مذہبی واشگافیاں اور نہ ملاوں کی لہراتی ہوئی داڑھیاں اور نہ سبز عمامے، اونچے پاجامے، مسجدوں میں جمعہ کے خطبے۔ نہ ہی یہ لوگ جو قومیت اور لسانیت کا درس دے رہے تھے۔ اس آگ کو بُجھا سکتے تھے۔

جناح صاحب کے اس تصور کو پس پشت ڈال سکتے تھے۔ ہندو اکثریت والے علاقوں میں یعنی یو پی اور بہار میں مسلمان پاکستان کے حصول کے لئے منظم ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ وہ پاکستان میں صرف مہاجرین بن کر رہ سکتے تھے۔ کشمیر ایک مسلم اکثریتی علاقہ تھا۔ لیکن 1948 میں اب ڈاکٹر اقبال اس دنیا میں موجود نہ تھے اور کشمیر میں مسلم کانفرنس میر واعظ کی کم زور قیادت کا بدترین شکار ہو چکی تھی۔ اور جموں کی مسلم کانفرنس کا ایجنڈا اور تھا۔ اس لئے کشمیر میں مسلم کانفرنس انتشار کا شکار تھی۔

میر واعظ کے زیرِ اثر دو محلوں سے باہر مسلم کانفرنس کا حال یہ تھا:

یہ کمال ذوق نظر نہیں، یہ زوالِ جذبہ و شوق ہے
کہ جو نغمہ نغمہ تھی زندگی، وہی زندگی ہے فغاں فغاں

یہ سب جانتے ہوئے شیخ صاحب نے غالباً کانگریس کے ایماء پر

1944 میں جناح صاحب کا استقبال کیا۔ جناح صاحب صرف مسلمانوں کو ایک قوم
بناتا ہے'' کا پیغام لے کر کشمیر آئے تھے۔ شیخ صاحب کشمیری بولنے والوں کی قومیت
اور انفرادیت کے دعویٰ دار تھے۔ اس لئے مفاہمت کے بجائے اب لیگ اور نیشنل
کانفرنس میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوگئی۔ شیخ صاحب اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے
اب چونکہ کشمیری مسلمان اپنی انفرادیت کے نام پر نیشنل کانفرنس کے حامی بننا شروع
ہوگئے تھے۔ نہرو کو اطمینان ہوا تھا کہ اب مسلم لیگ کے کشمیر میں قدم نہیں جما سکتے گی۔
اس لئے چودھری غلام عباس کو جموں کا مسلمان ہونے کی بناء پر اور پنجابی کلچر سے
وابستہ ہونے کی بناء پر کشمیر کی وادی میں کبھی مقبولیت ہی نہ ملی تھی۔ اور اس لئے شیخ
صاحب نے جناح صاحب کی واپسی کے بعد دسمبر 1944 میں ''نیا کشمیر'' کا مینوفسٹو
جی بی پی ایل بیدی نے لکھا تھا نیشنل کانفرنس کی منظوری کے لئے عوامی جلسے میں پیش کیا
تھا جو بھاری اکثریت سے منظور کرلیا گیا تھا اور نیا کشمیر کے مینوفسٹو میں سب سے اہم
شق یہ تھی کہ کشمیر کی حدود کو تبدیل کرنے کا حق نیشنل اسمبلی کو ہوگا۔ جب یہ مینوفسٹو
منظوری کے لئے نیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ کے سامنے پیش ہوا تھا تعجب یہ ہے کہ ایک
بھی کشمیری ممبر نے اس شق کی وضاحت ہی نہ چاہی تھی۔ ''کشمیر کے حدود کی تبدیلی''
سے کیا مراد تھا؟ آج تک کسی نیشنل کانفرنس کے لیڈر نے نیا کشمیر مینوفسٹو کے اس شق کی
تشریح کرنا ہی مناسب نہ سمجھا ہے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس سے
قبل 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت خودمختار ریاستوں کو برٹش انڈیا
سے الحاق کا حق دیا گیا تھا۔ کشمیر پر درجنوں کتابیں لکھی گئیں ہیں لیکن ایک بھی مورخ
نے نیا کشمیر کے مینوفسٹو کی تشریح کرنا مناسب نہ سمجھا ہے۔ کیا نیا کشمیر کے مینی فسٹو میں
ہی کشمیر کو ہندوستان میں مدغم کرنے کا عندیہ دیا گیا تھا؟ جناح صاحب کبھی بھی مہاراجہ

پر کوئی دباؤ ڈالنے کے قائل ہی نہ تھے۔ اگر کشمیر خود مختار رہتا تو وہ معترض نہ ہوتے۔ اگر کشمیر وفاق سے تعلق رکھتا تو وہ کشمیر کی خصوصی پوزیشن کو قائم رکھنے پر رضامند تھے۔ پھر اس شق کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ اس کی تشریح کیا ہے؟ کیا اس شق کا مقصد رائے شماری کے تصور کو ختم کرنا تھا؟ اگر مہاراجہ کسی ایک ملک سے اتحاد کرتا تو اس مینوفسٹو کے مطابق رائے شماری کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ کشمیر کی نیشنل اسمبلی اس کی توثیق کر سکتی تھی۔ آج ہندوستان کا موقف یہی ہے کہ مہاراجہ کے الحاق کی توثیق کشمیر کے آئین ساز اسمبلی نے کی ہے۔ دسمبر 1944 میں نیا کشمیر کے مینی فسٹو میں اس خاص شق کا مفہوم کیا ہو سکتا ہے؟ حفیظ جالندھری کے یہ شعر ذہن میں آتے ہیں:

نظارے اس آب و گل کے
رہزن ہیں تیری منزل کے
نغمہ ہو یا رنگ گل کے
سب پروتے ہیں نگاہ و دل کے
تو ہے طالب نورِ
مسافر!

تیری منزل دور! اور اب بھی کشمیریوں کی منزل دور نظر آتی ہے۔

اور اب اس سیاسی منظر نامے کا ایک اور پہلو ملاحظہ فرمائیے۔ اگست 1942 میں کانگریس نے ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک کا آغاز کیا۔ کانگریس کے زعما گرفتار کر لئے گئے تھے۔ کشمیر میں شیخ صاحب نے ہڑتال کروائی اور عوامی جلسے ہوئے۔ شیخ صاحب نے انگریز مخالف تقاریر کیں تھیں۔ 9 اگست 1942 کو کانگریس کے لیڈر گرفتار ہوئے۔ 16 اگست 1942 نیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ نے خاص

ریزولیشن پاس کیا اور کانگریس کے موقف کی مکمل حمائت کی تھی ۔ 23 اگست 1942 کو شیخ صاحب نے کانگریس کی حمائت میں جلوس نکالا اور پھر 9 اپریل 1943 کے میر پور کے اجلاس میں ہندوستان کو اپنا وطن کہا۔ مگر کشمیر میں مہاراجہ کے خلاف کشمیر چھوڑ دو کی تحریک نہ چلائی ۔ آخر کیوں؟ کسی کشمیر مورخ نے کوئی جواب نہ دیا ہے۔

یہ وہ وقت تھا جب جموں ایک قحط زدہ علاقہ قرار دیا گیا تھا اور جموں میں 25 اگست 1943 کو مہاراجہ کے خلاف جلوس نکلے تھے۔ لوگوں پر گولی چلائی گئی تھی ۔ جموں شہر کو فوج کے حوالے کیا گیا تھا۔ لیکن ان حالات میں بھی شیخ صاحب نے "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک کا آغاز ہی کرنا مناسب نہ سمجھا آخر کیوں؟ وہ کس کا انتظار کر رہے تھے اور پھر مہاراجہ نے رایل کمشن کا اعلان کیا جس میں این، سی، نے شمولیت کی اور 1944 میں این، سی کے دو ممبروں نے استعفیٰ دے دیا۔ اور پھر نیا کشمیر کا مینی فسٹو منظور کیا گیا جس میں مہاراجہ کی حکومت ختم کرنے کا کوئی تذکرہ ہی نہ تھا۔

1945 میں بھی کشمیر چھوڑ دو کی تحریک کا آغاز کیا گیا۔ آخر کیوں؟

17 مارچ 1946 کو پنڈت نہرو نے Dyarchy کے خلاف بیان دیا۔

17 مارچ کو مرزا محمد افضل بیگ نے مہاراجہ کی کابینہ سے استعفیٰ دیا او 13 مئی 1946 کو شیخ صاحب نے مہاراجہ کے خلاف کشمیر چھوڑ دو کی تحریک کا آغاز کیا تھا اور 20 مئی 1946 کو مہاراجہ نے سرینگر پہنچ کر اس تحریک کو کچلنے کے احکامات جاری کئے تھے۔ مگر اہم بات یہ ہے کہ 17 مئی 1946 کو پنڈت جواہر لعل نہرو نے آل انڈیا سٹیٹس نیشنل کانفرنس سے ہندوستان کی سب ریاستوں میں احتجاج کرنے کی اپیل جاری کی تھی ۔ خان عبد الغفار خان نے شیخ صاحب کے ساتھ مکمل یکجہتی کا اعلان

کیا تھا اور پنڈت نہرو نے بیان دیا کہ وہ اس تحریک کے ساتھ ہیں۔ اتنا ہی نہیں پنڈت جی نے 16 جون 1946 کو مہاراجہ ہری سنگھ کے نام ایک مکتوب میں شیخ صاحب کی رہائی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس بات پر نہرو نے مہاراجہ سے کہا تھا کہ وہ کشمیر کے معاملات میں ذاتی دلچسپی رکھتے ہیں اور پھر پنڈت نہرو نے شیخ صاحب کے خلاف درج مقدمہ کے دفاع کا ذاتی طور پر فیصلہ کیا تھا۔ لیکن 19 جون کو پنڈت جی کی کشمیر آمد پر پابندی عائد کی گئی اور انہیں دومیل کے پاس مہاراجہ نے حراست میں لے لیا تھا۔ وائسرائے نے مہاراجہ کو خط لکھا کہ اس نے پنڈت نہرو کو گرفتار کر کے فاش غلطی کی ہے حتیٰ کہ دوسرے روز پنڈت جی کو چھوڑا گیا تھا اور وہ واپس دلی آ گئے تھے۔ پنڈت نہرو کے خلاف جو پابندی عائد کر دی گئی تھی وہ منسوخ کردی گئی اور 24 جولائی 1946 کو پنڈت نہرو شیخ عبداللہ کے مقدمہ کا دفاع کرنے سرینگر تشریف لائے تھے۔ یہ ڈرامہ کیوں رچایا گیا تھا؟ اصلی محرکات کیا تھے؟ کانگریس شیخ صاحب کو کیوں نواز رہی تھی؟ مہاراجہ کے مشیر کون لوگ تھے؟ پنڈت رام چند کاک کے برادر کا ہندو مہا سبھا سے کیا تعلق تھا؟ ہری سنگھ کا اندیشہ ہائے دور دراز کیا تھے؟ مہاراجہ کے تیج بہادر سپرو سے کیا راز و نیاز تھے؟ اور پھر 18 فروری 1946 کو جب ہندوستان کی بحریہ کے ملازمین نے بغاوت کردی تھی تو سردار پٹیل نے بمبئی کے بحریہ کے اڈے پر جا کر ذاتی طور مداخلت کر کے بحریہ کے افسران کو ہتھیار ڈالنے پر کیوں مجبور کیا تھا؟ اور پھر انتخاب ہوئے تھے اُن کے نتائج کے مطابق پنجاب میں لیگ کو 88 میں سے 75 نشستیں حاصل ہوئیں تھیں اور صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان میں بھی لیگ کے حق میں لوگوں کی رائے کا فیصد تناسب بہت زیادہ تھا۔ پاکستان اب ایک حقیقت نظر آ رہا تھا۔ جنگ عظیم دوم ختم ہو چکی تھی۔ انگریزی اقتصادی طور پر دیوالیہ

بن چکے تھے۔ اُن کا نو آبادیاتی نظام دم توڑ رہا تھا۔ ہندوستان چھوڑ دینے پر آمادہ ہو گئے تھے اور پھر کیبنٹ مشن 24 اپریل 1946 کو سرینگر چھٹیاں منانے کے لئے آیا تھا۔ اور پھر کشمیر سے واپس کیبنٹ مشن شملہ آیا تھا۔ اور 5 مئی 1946 کو کانگریس اور لیگ کے ساتھ مذاکرات پاکستان کے وجود سے متعلق کئے تھے۔ 8 مئی 1946 کو پیتھک لارس نے کانگریس اور لیگ کو کچھ وضاحتیں بھیجی تھیں اور گروپ آف پراونس کا تصور پیش کیا تھا اور 13 مئی 1946 کو لارڈ ویول نے لیگ اور کانگریس کو برابر جماعتیں تصور کرنے کا عندیہ دیا تھا اور کیبنٹ مشن نے 16 مئی 1946 کو اپنے پلان کو مشتہر کیا تھا۔

یہ واقعات اس لئے اہم ہیں کہ کانگریس کے ایماء پر شیخ صاحب نے 13 مئی 1946 کو کشمیر چھوڑ دو کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اسی لئے 17 مئی 1946 کو پنڈت نہرو نے شیخ صاحب کی حمایت میں آل انڈیا سٹیٹ پبلزر کانفرنس کو ہندوستان بھر میں احتجاج کرنے کے لئے آمادہ کیا تھا۔

قاری سے التماس ہے کہ اس مقام پر توقف کیا جائے اور کشمیر چھوڑ دو تحریک کے عوامل پر تفکر اور غور کیا جائے:

''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک کی پنڈت نہرو اس لئے بھر پور حمایت کر رہے تھے چونکہ اب اس عمل سے کشمیری مسلمانوں کی رسائی ایک آزاد جموں و کشمیر کی ریاست کی طرف ممکن ہی نہ رہی تھی مجھے پاکستانی شاعرہ پروین شاکر کی نظم ''نارسائی'' ذہن میں آرہی ہے۔ پروین شاکر کہتی ہیں:

''تتلیاں''

فصیل شب عبور کر کے

میری کور، کوکھ کے لئے

پرون میں رنگ، آنکھ میں کرن لئے

کلائیوں سے ہو کے اب ہتھیلیوں تک آ گئیں

مگر

میری تمام انگلیاں کٹی ہوئیں ہیں!

یہی حال کشمیریوں کا ہوا ہے اور اب شیخ صاحب کے لئے:

نیند ہی نیند میں کھلونے لئے

خواب ہی خواب میں بہلتا رہا!

یا امجد حسین امجدؔ کی زبان میں:

وقت کے ایک کنکر نے عکسوں میں تقسیم کیا

آب رواں میں امجد اب کیسے چہرے جوڑوں گا

اور آئندہ چالیس برسوں تک شیخ صاحب جموں اور کشمیر کی انفرادیت کے چہرے جوڑتے رہے۔ چونکہ کشمیر چھوڑ دو تحریک نے جموں کے دس لاکھ ڈوگروں، جموں اور کشمیر کے تین لاکھ سکھوں اور کشمیر کے دو لاکھ پنڈت لوگوں کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط بنا دیا اور وہ ایک بات پر یکجا ہو گئے کہ انہیں مہاراجہ کی حمایت کرنا ہے اگر مہاراجہ خود مختار رہ سکتا ہے وہ خود مختار رہیں گے ورنہ ہندوستان سے الحاق کر کے وہ ہندوستان میں ایک اکثریت بن جائیں گے۔ دوم وہ کشمیر چھوڑ دو تحریک کا مقصد کشمیری بولنے والے مسلمانوں کی غلبہ حاصل کرنے کی سعی سمجھنے لگے۔ سوم یہ بات اُن کے ذہن پر اُجاگر ہوئی کہ ایک آزاد جموں و کشمیر ریاست میں وہ ایک اقلیت بن کر رہیں گے اور جمہوریت میں اُن پر ہمیشہ کشمیری بولنے والوں کا غلبہ رہے گا۔ چہارم

جموں اور کشمیر کے صوبوں کے درمیان جو خلیج قائم ہوگئی ہے وہ قائم رکھنی چاہیے اور اگر حالات نے مہاراجہ کو خود مختار رہنے نہ دیا تو ہندوستان کے ساتھ الحاق جموں کے ہندوؤں کے مفاد میں ہے۔ پنجم اب جموں کے ہندوؤں کی امداد کے لئے پنجاب سے اکالی اور مہا سبھا کے ہندو منظم ہونا شروع ہوئے جو کشمیر چھوڑ دو تحریک کو کشمیری مسلمانوں کی بالادستی سے تعبیر کرتے تھے۔ ششم ہندوستان سے الحاق کے لئے گرداس پور اور جموں کے مسلمانوں کا قتل عام ایک اہم سیاسی عمل کی صورت اختیار کر گیا تھا اور مہاراجہ نے ہندوستان سے رسل و رسائل قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور کانگریس اب ہر قیمت پر گورداس پور حاصل کرنا ضروری تصور کرتی تھی ۔ انگریزوں کی انہیں حمایت حاصل تھی ۔ اگر جموں سے مسلمانوں کو خالی کرایا جاتا ہے تو جموں کا صوبہ ہمیشہ ہندوستان کی حمایت کرے گا اور اس طرح لداخ کے بودھ بھی مسلم حکومت سے بچنے کے لئے ہندوستان کی حمائت کا اعلان کریں گے اور کشمیری پنڈت محسوس کر رہے تھے کہ ہندوستان سے کشمیر کا الحاق مہاراجہ ہری سنگھ کے لئے اب ضروری بن جائے گا اور ہندوستان میں کشمیری پنڈت کہہ سکیں گے:

"میں سورج کی طرح ہوں دھوپ اوڑھے
اور اپنے آپ کو پر خود سائبان ہوں!

اور جموں کے مسلمان اس کشمکش میں تھے:

"میرے چھوٹے سے گھر کو یہ کس کی نظر، اے خدا لگ گئی
کتنی کتنی دعاؤں کے ہوتے ہوئے بد دعا لگ گئی

اب یہ وقت تھا جب جموں اور ہندوستان کے درمیان راستہ قائم کرنے کے منصوبہ پر باقاعدہ عملی اقدامات لئے گئے ۔ اگر جموں کا صوبہ کشمیری مسلمانوں کی

اکثریت کی بنیاد پر اُن کا غلبہ قبول نہیں کرے گا تو جموں و کشمیر کی ریاست کبھی خود مختار ریاست بن ہی نہیں سکتی چونکہ لداخ کے بودھ بھی جموں کے صوبے کے ساجھے دار بن جائیں گے اور ایک خود مختار کشمیر سوختہ سامان اور بریدہ ذہن کا بے معنی پیکر نظر آنے لگے گا۔ یہ نہرو کی سیاست نے اپنی معراج حاصل کر لی تھی اور شیخ صاحب کی حمایت میں نہرو کی گلفشانی گفتار ایک داد ستم سے کم نہ تھی ۔ چونکہ اب کشمیریوں کے لئے ''پاؤں ہواؤں کے بیڑیاں نہیں کھلتیں'' والا معاملہ درپیش تھا۔ سردار پٹیل اور اگلی مہاراجہ کے لئے یہ بدرقہ کا رول ادا کر رہے تھے۔ شیخ صاحب کی سیاسی سادگی کا یہ عالم تھا کہ آل انڈیا کانگریس کے قریب آنے کے باوجود وہ کانگریس کی مجلس عاملہ میں نہرو اور پٹیل کی سیاسی شراکت کے رمز و کنایہ سمجھنے کی اہلیت ہی نہ رکھتے تھے ۔ وہ کانگریس کو نہرو سمجھتے تھے وہ یہ نہ جان سکے کہ اگر نہرو کانگریس کے دماغ تھے تو سردار پٹیل کانگریس کا دھڑکتا ہوا دل جس کی ہمدردیاں ہندو مہا سبھا سے تھیں ۔ جو اکالی سیاست کو شیشے میں اتار کر مسلم سیاست کی راہ کا سنگ گران بنانا چاہتے تھے اور نہرو اور پٹیل میں مفاہمت تھی ۔ شارکت تھی ، کوئی اختلاف نہ تھا۔ صرف انداز بیان اور روش میں رنگ جدا نظر آتا تھا۔ شیخ صاحب کانگریس کے ابتدا اور ارتقاء اور حکمت عملی اور دستور العمل سے نابلد تھے ۔ کانگریس کی مجلس عاملہ کے اندر کون سے دھڑے موجود ہیں ان کا ایک دوسرے سے تعلق کیا ہے؟ مہاراجہ ہری سنگھ اور سر تیج بہادر سپرو کس دلی آگ کو کرید رہے تھے؟ پٹیل اور گاندھی جی کے درمیان کون سا ربط تھا؟ رام چند کاک وزیر اعظم کشمیر کے برادر اور مہا سبھا کے درمیان کون سا ربط تھا؟ جب کشمیر میں کرپانی لائے ان کے اور مہاراجہ ہری سنگھ کے درمیان کیا بات طے پائی تھی؟ شیخ صاحب کو یہ باتیں سوچنے کی طرف دماغ ہی مائل نہ ہوا تھا۔ کانگریس سے ناطہ جوڑنے سے پہلے

اُنہوں نے اس جماعت سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی سعی ہی نہ کی تھی۔ ایسی سیاسی جانفشانی کا ان کی طبیعت کے ساتھ میل ہی نہ تھا۔ جو ایک گہرا دماغ جو ژرف نگاہی سے حالات کا جائزہ لے سکے یہ اُن کے اسلوب سیاست کا حصہ ہی نہ تھا اور نیشنل کانفرنس کی مجلس عاملہ ایسی سوچ سے بالکل مبرا تھی۔ وہ صرف شیخ صاحب کے ڈھنڈورچی تھے اور یہ سیاسی طرزِ عمل، نہرو کی خوش قسمتی تھی جو اس کے ارادوں میں تابش پیدا کر رہا تھا۔ کیونکہ کشمیر کی تحریک آزادی نیم پڑھے لکھے ہوگوں کے ہاتھ میں تھی جناح صاحب پاکستان بنانے کی آزمائش میں صاف اعلان کر رہے تھے:

" The Cabinet Mission has played into the hand of Congress" اور 1920 تک جناح 1920 سے 1913 بقولِ ان کا کانگریس سے اعتقاد اعنقا ہوا تھا۔ وہ ثابت کر رہے تھے کہ 1946 سے قبل ہی اُنہوں نے کانگریس کی سیاست کو سمجھ لیا تھا اور اب کہہ رہے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ آواز آل انڈیا مسلم لیگ حتیٰ کہ وائسرائے نے اعلان کیا کہ نہرو اور اُس کے تیراں ساتھی 24 اگست 1946 جو اگست جو عید کا دن تھا اس روز نئی ہندوستانی کابینہ بنائیں گے۔

پیغام میں ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو متحد ہونے کے لئے کہا تھا اور 1946 میں نہرو انٹرم گورنمنٹ کے وزیر اعظم بن چکے تھے، بمبئی اور کلکتہ اور 2 ستمبر 1946 کلکتہ میں ہندو مسلم فسادات کا آغاز ہو چکا تھا اور یہ وہ وقت تھا جب گاندھی جی کے متعلق لارڈ ڈویل نے کہا تھا: The more i seen that old man the more i regard him as an unscruplous old hypocrite " quote.

ان حالات میں جناح صاحب کشمیر کی طرف توجہ ہی نہ دے سکتے تھے۔ کشمیر کی مسلم کانفرنس میر واعظ کی سربراہی میں صرف شہرِ سرینگر کے ڈیڑھ محلے تک اپنا اثر

رسوخ رکھتی تھی اور جموں کی مسلم کانفرنس کشمکش کے حشر میں شور وغوغا کے ماحول میں سیاست کے گرد وغبار میں کچھ بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔ جموں کے مسلمانوں اور گرداس پور کے مسلمانوں کے قتلِ عام کی نفسیات اب رنگ لانے کے لئے بے قرار تھیں۔

ہندوستان کی سیاست مجموعہ اضداد بن چکی تھی۔ ان حالات میں انگریزوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اب لیگ اور کانگریس کی مفاہمت دیوانے کا خواب بن چکی ہے ہندوستان چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا اور 9 دسمبر 1946 کو ہندوستان کی اسمبلی کا پہلا اجلاس طلب کرلیا گیا تھا اور اس روز مسلم لیگ کے 79 ممبروں نے اس کا بائیکاٹ کیا تھا اور گیارہ دسمبر 1946 کو برٹش ہاؤس آف کامن میں چرچل نے انکشاف کیا کہ "ہندو فسادات میں زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوا ہے"۔ اور پھر کائنات دم بخود رہ گئی اور مملکت خداداد پاکستان وجود میں آ ہی گئی۔ ہندو سیاست پشیمان ہوگئی۔ وہ نوحہ خوان تھے کہ ہندوستان صرف ہندو قوم کا ملک نہیں رہ سکتا جو رام راجہ کی تکمیل جہاں بانی کا پہلا قدم ہوتا، ہندوستان میں رام راج کے وقت کا تصور دنیا کے نقشہ پر موجود ہی نہ رہا اور پاکستان کے وجود نے ایشیاء کی سیاست کا رُخ موڑ دیا۔ اسرائیل کا وجود میں آنا اب ایک حقیقت بن گیا تھا اور انگریز کی چشم فتنہ گر، سامری فن، گردش تقدیر کے سامنے سرنگون ہو رہی تھی۔ پاکستان کا وجود میں آنا، نو آبادیاتی نظام کے خاتمہ کا اعلان تھا۔ ہندوستان کے مسلمان ہی آزاد نہیں ہوئے تھے بلکہ تمام غلام ملک ایشیاء اور افریقہ کے اور انسانیت بذاتِ خود خود مختار اور آزاد ہو رہی تھی۔ یہ ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ چونکہ آسمان پچھلی چھ سات صدیوں سے مسلمانوں کا عدوے کمال رہا ہے۔ پاکستان کے وجود نے مُسلم کے عوام کو بے ربطی سے آزاد کر دیا تھا مزید سرخ فوج نئے عزم کے ساتھ اپنی منزلِ شوق کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اب ایشیاء بیدار ہو رہا تھا۔ ایک نئی نمود

سحر ہو رہی تھی۔ بقولِ حفیظ جالندھری:

یکا یک ایک نور کا غبار مشرق سے اُٹھا

جو رفتہ رفتہ بڑھ چلا

اور آسمان پر چھا گیا

حسینہ نمود نے نقاب اُٹھا دیا

فسوں گر شہود نے طلسم شب مٹا دیا

نگاہ جان میں آ گئی حیات میں سما گئی

یکا یک ایک نور کا غبار مشرق سے اُٹھا!

اور یہ غبار اب ایشیاء پر چھا رہا تھا۔ چونکہ میں نہ تو ہندوستان کی تاریخ لکھ رہا ہوں اور نہ ہی کشمیر کی تاریخ۔ بلکہ میں صرف اہم تاریخی واقعات پر اپنے تاثرات قلمبند کر رہا ہوں۔ اس لئے تفصیل میں جانے بغیر میں صرف اہم واقعات جو تاریخ کا موڑ ثابت ہوتے ہیں اُن کی نشاندہی کروں گا۔ پاکستان کے وجود میں آنے اب جموں کے ہندوؤں کو آمادہ کر لیا کہ بدلتے ہوئے حالات میں جموں کو ایک ہندو علاقہ بنانے کا مرحلہ قریب آ گیا ہے۔ 5/6 ستمبر 1947 کو جموں کے مسلمانوں کے قتل عام کا آغاز کر دیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق تین لاکھ لوگ قتل کر دیئے گئے۔ اور تین لاکھ فرار ہو کر پاکستان کے صوبۂ پنجاب میں پناہ گزین ہو گئے اب ایک آزاد اور خود مختار ریاست ہائے جموں و کشمیر کا تصور ناممکن بن گیا تھا۔ جموں کی اقلیت اب ہندوستان میں اپنی اکثریت تلاش کرنے کی سعی کرنے لگی۔ اور ہندوستان اُن کے لئے جان حیات بن گیا۔ اب شیخ صاحب دیکھ رہے تھے ہندوستان کانگریس نہیں اور کانگریس ہندوستان نہیں۔ ہندوستان ایک تصور کا نام ہے جو رام راجیہ کی زبان میں

گفتگو کرتا ہے اور یہ رام راجیہ کا مقصد آریہ تہذیب کا احیائے نو ہے۔ یہی بات سبھاش چندر بوس نے ہٹلر سے کہی تھی۔ اور یہی کانگریس کی سیاست کے عفریت کی قوت ثابت ہو رہی تھی۔ اس لئے کشمیر کا ہندوسان میں خصوصی امتیاز برقرار رکھنا ناممکن ہی نہ تھا۔ شیخ صاحب اپنی قوم میں اپنی شہرت کی رسوائی سے کانپ اُٹھے تھے اور ہندوستان کے عوام اب رام کے ہندوستان کا خواب شرمندۂ تعبیر کرنے پر آمادہ ہو رہے تھے۔ جس کا پہلا اعلان گاندھی جی کا قتل تھا اور دوسرا اعلان کانگریس کے دروازے مہا سبھا کے لئے وا کرنے سے ہوتا تھا۔ اور تیسرا اعلان اب کشمیر کو ہندوستان میں مدغم کرنے کے بعد ہونے والا تھا۔ اور ہندوستان کی فرقہ پرست سیاست پُکار رہی تھی:

شدت مزاج میرے خون کا
نفرت کی بھی دیئے تو انتہا دیئے

جموں کے مسلمانوں کے قتل عام نے آفریدی اور وزیرستان کے ابدالی پٹھانوں کو کشمیر کے سمن زاروں کی طرف رُخ کرنے پر آمادہ کیا۔ چونکہ وہ کشمیر کو ہمیشہ افغانستان عظمیٰ کا ایک ضروری حصہ تصور کرتے تھے۔ احمد شاہ ابدالی ہو یا وزیرستان کے قبائل کشمیر کی خاطر نظام آتش و آہن کا دل ہلاتے ہوئے وادی کشمیر کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ وہ صرف کشمیر کے مسلمانوں کے تحفظ کو ضروری سمجھتے تھے۔ ورنہ وہ سیال کوٹ سے صوبہ جموں میں داخل ہو کر اڑتالیس گھنٹوں کے اندر کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنا سکتے تھے۔ مگر ان کا مدعا کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانا ہی نہ تھا۔ وہ صرف کشمیر، افغانستان تعلقات کے طلب گار تھے۔ انہیں پاکستان نے منظم نہیں کیا تھا۔ وہ ہندوستان کی آزادی کے علم برداروں سے کہہ رہے تھے:

کھدر پہن پہن کر بداطوار آ گئے

در پردہ سفید پوش سرکار آ گئے

دشمن گئے تو دوست بنے دشمن وطن

خلوت کی تہہ کھلی تو برآمد ہوا کفن

کانگرس پارٹی تو انگریزوں کی پیدا کردہ تھی۔ اسے انگریزوں کی حمایت حاصل تھی۔ وہ برطانیہ کے خاص غلامان خانہ زاد تھے اور جموں کے قتل عام پر کانگریس کی خاموش کہہ رہی تھی:

انسان کے لہو کو پیو اذنِ عام ہے

انگور کی شراب کا پینا حرام ہے!

لیکن قبائل ہندوستان سے کہہ رہے تھے کہ کشمیر سے افغانوں کا تعلق ختم ہی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے جب بھی کشمیر میں ہل چل ہوئی یہ افغان نژاد پٹھان سرینگر کی مہمانی کو ہمیشہ قبول کریں گے اس لئے کشمیر ہندوستان کے لئے ایک آتش فشاں پہاڑ ثابت ہوگا۔ کشمیر ہندوستان میں رہے یا نہ رہے:

شعلوں کے پیکرون سے لپٹنے کی دیر ہے

آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے کی دیر ہے اور کشمیر کا آتش فشاں 1947 میں پھٹ چُکا تھا۔

اب شیخ صاحب سمجھنے لگے کہ ہندوستان کے کھدر پوش انہیں قبول نہیں کریں گے وہ اب کشمیر کو ہندوستان میں مدغم کرنے کے منصوبے تکمیل کررہے تھے۔ اس لئے کشمیر اور ہندوستان کا معاشی اور اقتصادی تعلق ان کی منصوبہ بندی کی جان بن گیا تھا۔ امریکی شاطر یہ سیاسی منظرنامہ بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے شیخ

صاحب کو امید دی کہ امریکہ خودمختار کشمیر کے گونگے خواب کو طاقت گویائی عطا کر سکتا ہے اور اس طرح وہ دوبارہ اپنا کھویا ہوا اعتماد بھی عوام میں حاصل کر سکتے ہیں۔ شیخ صاحب جو عوام میں غیر مقبول ہو چکے تھے اب پھر کشمیریوں کے سامنے ایک خودمختار کشمیر کی وکالت کرنے لگے۔ پاکستان اس صورت حال کا بھرپور فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ ورنہ 1947 سے 1953 تک شیخ صاحب کا دور حکومت پاکستان نواز کشمیری طبقے کے لئے زندہ جہنم بن چکا تھا۔ اس طبقہ پر ظلم، جبر، بربریت، بہمانہ دہشت، جسمانی عذاب، روحانی تذلیل، حقارت اور نفرت۔ ان کے ضبط غم کو ختم کرنے کے لئے روا رکھی گئی تھی۔ میں اس وقت ظلم اور جبر کی داستانوں کو بیان نہیں کروں گا چونکہ وہ زبان زد عام ہیں۔ ریڈیو پاکستان تک سُننا جرم تھا۔ پاکستان کے حق میں بات کرنے کی تعزیر جیل کی کال کوٹھری تھی اور در پردہ جفاؤں کی اب کھلے عام نمائش ہونے لگی اور بقولِ جماعت علی شاعر:

دُنیا سمجھ رہی تھی کہ سورج گہن میں تھا

دیکھا جو روشنی میں تو سایہ بدن میں تھا!

ان حالات میں شیخ صاحب نے خودمختاری کا بھرپور نعرہ بلند کیا اور کانگریس کو موقع فراہم کیا کہ وہ انہیں برخواست کردیں اور کشمیر میں بخشی حکومت قائم کر کے معاشی اور اقتصادی طور کشمیر کو ہندوستان میں مدغم کردیں تاکہ دفعہ 370 آئین ہند کی روح کا گھلا گھونٹ دیا جائے۔ ایک منصوبہ کے تحت ہندوستان نے مرزا محمد افضل بیگ کو ترغیب دی کہ وہ آئینی جدوجہد کے لئے محاذ رائے شماری کا دستور عمل بنائیں۔ ہندوستان کی سیاسی پارٹیاں خاص طور پر سوشلشٹ اور کمیونسٹ اور خود کانگریس چاہتی تھی کہ محاذ رائے شماری کی حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ کشمیر کو مسلح جدوجہد سے محفوظ رکھا

جائے۔ مسلح جدو جہد وزیرستان کے قبائل کو کشمیر میں تاریخ رقم کرنے کا موقع فراہم کرسکتی تھی ۔ جو کانگریس کے مفاد میں نہ تھا۔ 9 اگست 1953 میں شیخ صاحب کی گرفتاری کے فوراً بعد مرکزی حکومت نے ان سے بات چیت قائم رکھنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اور چند ہی یوم بعد اُن سے بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

ہمیں ذہن نشین کرنا چاہیے کہ چرچل کو جنگ عظیم دوم جیتنے پر اسقدر انبساط حاصل ہی نہ ہوا تھا۔ جتنا کہ جواہر لال نہرو کو 1955 میں محاز رائے شماری کے کشمیر میں وجود میں آنے سے ہوا تھا۔ شیخ صاحب ہندوستان اور پاکستان کی سیاست سے مکمل طور نابلد تھے ۔ نہ انہیں بنامِ امن ہندوستان اور پاکستان میں جنگ و جدل کے منصوبوں کا کوئی علم تھا۔ نہ انہیں مشرقی پاکستان کا کوئی علم تھا۔ ان کی سیاسی غفلت نے انہیں روس اور چین میں تفاوت کو سمجھنے نہ دیا اور نہ ہی اس بارہ میں مختلف انداز فکر کا کوئی علم تھا۔ نہ ہی ہندوستان کے بلند دعویٰ جمہوریت کے کھوکھلے نعروں کے پیچھے امریکہ کی رشتہ دوانیوں کا علم تھا۔ نہ انہیں چین اور ہندوستان کے تعلقات سمجھ میں آرہے تھے اور نہ انہیں روس کے ارادوں کا کوئی علم تھا۔ وہ صرف کشمیر کی وادی کو کُل کائنات تصور کرتے تھے ۔ اس لئے ان کا نکتہ نگاہ بہت محدود تھا۔ وہ عالمی سیاست سے بالکل انجان تھے۔ سیاست اور فلسفے کی کتابوں کا انہوں نے مطالعہ ہی نہ کیا تھا۔ بین الاقوامی اخبارات کون سی رائے عامہ قائم کر رہے تھے وہ اُن کی نگاہوں سے نہان تھا۔ مجلس اقوام متحدہ میں کون سے گروپ آگ پر سوار برسر پیکار تھے اور کون سی بدحواسیاں پھیل رہیں تھیں۔ کوریا کی جنگ کا ہندوستان اور پاکستان کی سیاست پر کیا اثر قائم ہو رہا تھا؟ یہ سب شیخ صاحب کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس لئے جب محاز رائے شماری نے کشمیر کی تحریک کو سنبھالا تو پنڈت نہرو بغلیں بجانے لگے چونکہ اس سے کشمیر میں مسلح جدو جہد

کے تمام امکانات ختم ہو گئے اور ہندوستان کا کشمیر پر قبضہ قائم رکھنا اب استحصال جائز بن رہا تھا اور اب ہندوستان استحقاق حفاظت کی نئی دلیل پیش کر رہا تھا کہ پاکستان اب سیٹو اور سنٹو کی طرف مائل ہے اور امریکہ سے فوجی امداد حاصل کر رہا ہے اس لئے کشمیر میں زمینی حالات بدل چکے ہیں اور رائے شماری کے تصور کا اسقاط ہو گیا ہے اور اس لئے سیکورٹی کونسل کی تمام شفارشات جو رائے شماری سے منسوب ہیں اب فسخ معاہدہ کے قابل بن چکی ہیں۔ اب نئی فکر کا تقاضا دانشوروں کی انتقال ذہنی کی طرف مبذول ہونا چاہیے۔

1955 میں خروشیف اور بلگانن کا سرینگر میں والہانہ استقبال اس سوچ کو تقویت پہچانے میں روس کی اعانت کا اقبال دعویٰ تھا۔ مگر محاز رائے شماری کو کشمیر میں قائم ہونے سے نہرو نے اپنی سیاست کا عروج حاصل کر لیا تھا۔ چونکہ کشمیر نے پاکستان کی توجہ مشرقی پاکستان سے مکمل طور ہٹا دی گئی تھی اور روس اور ہندوستان متحد ہو گئے کہ پاکستان کو پارہ پارہ کر کے بنگلہ دیش کو ایک تاریخی حقیقت بنا دیا جائے۔ پاکستان کی سیاست پر اگر آپ اس وقت نگاہ دوڑاتے تو آپ کو دکھائی دیتا کہ 1951 سے ہی شیخ مجیب الرحمان لسانی بنیادوں پر ہی بنگالی قومیت کو قائم کرنا چاہتا تھا۔ اور اب مشرقی پاکستان اور ہندوستانی بنگال اس قدر قریب آ چکے تھے کہ کسٹم کے تمام تعزیرات کو بالائے طاق رکھ کر مشرقی پاکستان کے بنگالیوں کی تجارت، ہندوستان کے بنگال کے ساتھ ہو رہی تھی ۔ حالات اس قدر مخدوش ہو گئے تھے کہ ''آپریشن جیوٹ'' کے نام پر مشرقی پاکستان میں سول انتظامیہ کے بدلے 1952 میں فوج کو طلب کر لیا گیا۔ چونکہ اب سمگلنگ کی وجہ سے مشرقی پاکستان کی مالی حالت ابتر ہو رہی تھی اور یہ سلسلہ ''آپریشن سروس'' کے نام سے 1956 میں اور آپریشن بند کمرہ ( Close

room) کے نام سے 1957 میں قائم کیا گیا تھا اور مشرقی پاکستان کے ہندو تاجروں نے 75 کروڑ یا اسی کروڑ کی رقم ہندوستان کے مغربی بنگال کے بنکوں میں ڈیپازٹ کردی تھی اور حکومت پاکستان بے بس تھی اور اس دوران 800,000 جیوٹ کے انبار Bales of Jute مغربی بنگال پہنچ رہے تھے۔اس کے علاوہ ایک اندازے کے مطابق 90,000 من چاول مشرقی پاکستان سے مغربی بنگال پہنچ رہا تھا۔ تقسیم پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان میں کل 47 کالج تھے جو سب کے سب ہندو سرمایہ دار چلا رہے تھے اور ان تدریسی اداروں میں کُھلم کُھلا پاکستان کے وجود کے خلاف پروپیگنڈہ جاری تھا اور شیخ مجیب اب ہندوستان کی اعانت کا مکمل یقین رکھتا تھا۔ نہرو نے کبھی قانونی مہاجرین جائیداد کو مشرقی پاکستان پر لاگو کرنا تسلیم ہی نہیں کیا تھا۔اس لئے مشرقی پاکستان کا تجارتی طبقہ مغربی بنگال کی بنکوں کا استفادہ کرتا رہا اور ہندوستانی بنکوں کے ذریعہ سے تجارت فروغ پاتی رہی اور قاری کو یہ بات بھی ذہن نشین کرنی چاہیے کہ 1953 اور 1955 کے اکنامکس سروے کے مطابق اس وقت مشرقی پاکستان کی 80 فیصد تجات خوشحال مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کے زیر اثر تھی ۔ جو بغیر رکاوٹ کے مغربی بنگال آتے جاتے تھے۔ اور مشرقی پاکستان کی حکومت بنگالیوں کے مغربی بنگال آنے جانے پر کوئی پابندی عائد ہی نہ کرسکی چونکہ وہ بنگالی رائے عامہ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتی تھی۔ زرا غور فرمائیے کہ ہندوستان میں جو مسلم اقلیت رہ گئی وہ ایک مفلوک الحال طبقہ تھا۔اس کے برعکس جو ہندو اقلیت مشرقی پاکستان میں رہ گئی وہ تاجر پیشہ خوشحال لوگ تھے۔ جنہوں نے صاحبزادہ لیاقت علی خان کو مشرقی پاکسان میں قانون مہاجرین جائیداد لاگو کرنے ہی نہ دیا تھا۔ قانون مہاجرین جائیداد صرف مغربی پاکستان میں نافذ العمل تھا اور ع یہ

متمول تاجر ہندو بنگالی طبقہ مشرقی پاکستان میں شیخ مجب کا حامی اور ناصر تھا۔ ہندوستان کی تمام ہمدردیاں شیخ مجیب کے ساتھ تھیں ۔ ہندوستان کے تمام ذرائع ابلاغ تمام رائے عام کو منظم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے محاذ رائے شماری کے وجود میں آنے سے پاکستان کی ساری توجہ مشرقی پاکستان سے اوجھل ہوگئی۔ پاکستان میں کشمیری علاحدگی کے جذبات کی اہمیت انہیں مشرقی پاکستان کے حالات سے غافل رکھنے میں کافی معاون ثابت ہوئی۔ فرق یہ ہے کہ سویت روس اور ہندوستان کے مفاد میں پاکستان کے دو حصے کرنا تھا۔ سویت روس کا منشاء افغانستان پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد پشاور کا جگر چیر کر کراچی کی بندرگاہ حاصل کرنا تھا۔ تاکہ وہ گرم پانیوں تک پہنچ سکیں۔ مشرقی پاکستان کی جغرافیائی صورت اس منصوبہ کے عملانے میں معاون ثابت ہوسکتی تھی۔ مگر کشمیر چونکہ وشط ایشیاء کی ریاستوں کے قرب میں واقع ہے۔ اس لئے سویت روس وسط ایشیاء کے مسلم صوبوں پر یعنی قزاکستان، آور بیجان، ترکمنستان وغیرہ پر اپنا قبضہ رکھنے کے لئے یہ ضروری سمجھتا تھا کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ بن کر رہے۔ امریکہ کے ابھی چین سے تعلقات قائم نہ ہو سکے تھے۔ اس لئے وہ روس سے ٹکراؤ کی پالیسی اپنانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے جہاں پاکستان کے دو ٹکرے کرنے میں روس، امریکہ اور ہندوستان کی سیاست میں مماثلت تھی وہاں کشمیر کے معاملے میں روس کی پالیسی واضح تھی کہ کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے۔ یہ بات کشمیریوں کو کہنے کے لئے 1955 میں خروشیف اور بلگانن سرینگر تشریف لائے تھے۔ جہاں پاکستان کی تقسیم مشرقی پاکستان کی جغرافیائی حالت کی وجہ سے ممکن تھی وہاں کشمیر کی جغرافیائی حالت جو اسے وسط ایشیاء کا قرب نصیب کرتی ہے اس کی آزادی کے لئے اب رکاوٹ ثابت ہو رہی تھیں۔ شیخ صاحب ان بین الاقوامی سیاسی الجھنوں کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہ رکھتے

تھے۔اُن کے سب سے بڑے مشیر مرزا محمد افضل بیگ کو اپنے آبائی ٹاؤن اننت ناگ کا جغرافیہ تک معلوم نہ تھا۔ کشمیری چو، این، لامی کو چونی لال سمجھتے تھے۔ روس کے ایماء پر 1955 میں کمیونسٹ اور شوشلسٹ ممبران پارلیمنٹ اب کھلم کھلا ہندوستان کی پارلیمنٹ میں شیخ صاحب اور بیگ صاحب کے جمہوری حقوق کا واویلا کر رہے تھے۔ وہ ایسا کیوں کر رہے تھے؟ یہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ 1958 تک پاکستان کے سیاسی حالات اتنے مخدوش ہوئے تھے کہ پاکستان کے عوام چاہتے تھے کہ پاکستان میں فوج قیادت اختیار سنبھالے اور لوگوں کی بھرپور حمایت سے فوج نے 1958 میں پاکستان کی سیاسی قیادت سنبھالی اور ایوب خان برسر اقتدار آئے اور حالات کو مدنظر رکھ کر امریکہ کے ساتھ تعاون کرنا روس کی پیش قدمی پر روک لگانے کا ایک واحد راستہ نظر آیا تھا۔ امریکہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ روس افغانستان میں غلبہ حاصل کرے۔ 1955 میں روس نے ایران پر بھی اپنا اثر قائم کر لیا تھا اس لئے افغانساتان میں روس کا اثر روکنے کے لئے۔ امریکہ کو پاکستان کی اہمیت کا احساس ہوا تھا۔ پاکستان از سر نو منظم ہو رہا تھا۔ پاکستان، ایران اور ترکی ایک محوری قوت بننا چاہتے تھے۔ اس لئے اب رائے شماری سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لئے ہندوستان نے شیخ عبداللہ کا پاکستان سے سازش کرنے کا ڈھونگ رچایا تھا اور 1958 میں کشمیر سازش کیس کی سماعت کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس عمل کے در پردہ روس کا مشورہ حاصل تھا۔ اور اب ہندوستان کی سیاست کا ہر پہلو روس کی K.G.B کے زیرِ اثر آچکا تھا۔ کشمیر سازش کیس کا مقصد مقدمہ کو طوالت دینا تھا۔ اور کشمیر سازش کیس کی حقیقت یہ تھی:

اک اچٹتا سا جمال، ایک سر بہ زانو سا خیال

اور یہ انتہائی دُکھ کی بات ہے کہ کشمیر کی آزادی کا خیال آج بھی سر بہ زانو اور نئی سوچ میں گرفتار ہے۔ محاذ رائے شماری کے نعروں پر غور کریئے یہ لوگ مطالبہ کر رہے تھے:

یہ ملک ہمارا ہے، اس کا فیصلہ ہم کریں گے

رائے شماری فوراً کراو!

یہ دنیا کے سامنے اعلان تھا کہ کشمیر خود مختار ملک نہ بننا چاہتا ہے وہ سیکورٹی کونسل کی قراردادوں کے تحت ہندوستان یا پاکستان میں سے کسی ایک ملک کے ساتھ الحاق چاہتا ہے۔ پاکستان تو اس نظریہ کی وجہ سے اپنی یکجہتی کو تقویت پہنچا رہا تھا اور تقسیمِ ہند کے نامکمل ایجنڈا کی تکمیل کے نام پر مغربی پاکستان میں اپنے اندرونی خلفشار کو کم کر سکتا تھا۔ لیکن مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب ''ہم بنگالی ہیں اور بنگال ہمارا ہے'' کے علاحدگی پسند رجحان کو عوام میں عام کر رہا تھا۔ دراصل شیخ صاحب جانتے تھے کہ خود مختار کشمیر کے تصور کی کوئی حققیت نہیں۔ پاکستان سے امداد صرف رائے شماری کے نام سے مل سکتی ہے۔ جہاں تک خود مختار کشمیر کا تعلق ہے۔ شیخ صاحب صرف اتنا کہہ سکتے تھے:

پیاس کہتی ہے کہاب ریت نچوڑی جائے

اپنے حصے میں نہیں اب سمندر آنے والا!

☆☆☆

# کشمیر 1962 سے 1990 تک

## [میرے سینے میں اُلجھنے لگی فریاد میری]

ہندوستان اور روس کا معاشقہ 1958 سے لے کر 1962 تک تمام حدود کو پار کر چکا تھا اور پھر معاملہ یہاں تک آ پہنچا تھا کہ بھڑکتی جا رہی ہے دم بدم اک آگ سی دل میں" یہ آگ پاکستان سے انتقام کی آگ تھی روس ہی ایک ایسی واحد قوت تھی جو جنوبی ایشیاء میں نئی شورشوں کو نظم دے کر بنگلہ دیش کو وجود میں لانے کی اہلیت رکھتی تھی ۔اس تصور نے ہندوستان کو روس سے منسلک کر دیا تھا۔ روس کی K.G.B ہندوستان کے تمام خارجی معاملات میں داخل اندازی ہو رہی تھی ۔ اس دور میں چین اور روس کے سرحدی اختلافات نے نیا رُخ اختیار کیا تھا اب روس اور چین رقابت کے ماحول میں جی رہے تھے۔ چین نے ہندوستان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مسلسل سعی کی تھی ۔لیکن ہندوستان کا خیال تھا کہ روس اور چین کی رقابت ہندوستان کے لئے انتہائی فائدہ مند ہے۔ "ہندو چینی بھائی بھائی کے نعروں کے باوجود" ہندوسان کے رویہ میں سختی آ رہی تھی ۔ چین سے سرحدی تنازعہ ہندوستان سلجھا ہی نہ سکا تھا۔ چونکہ اب ہندوستان کا جوش رقابت نیا معیار جنون قائم کرنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ روس نے ہندوستان کو یقین دلایا تھا کہ گراں خواب چینی ابھی سنبھل ہی نہیں سکتے ۔ چین کی آبادی کافی تیزی سے پھیل رہی ہے چین کی زراعت کافی کمزور ہے۔ چین ابھی ایک

زرعی ملک ہے۔ اس کے کارخانے اور فیکٹریاں ابھی بہت پسماندہ ہیں۔ اس کی معیشت بہت ضعیف ہے۔ ہندوستان میں صنعتی انقلاب آچکا ہے۔ ہندوسان روس کی فوجی امداد کا حقدار ہے۔ وہ ایک فوجی طاقت ہے۔ غیر جانبدار ملکوں کی سربراہی ہندوستان کے ہاتھ میں ہے۔ عرب ممالک ہندوستان کے زیر اثر ہیں۔ مصر میں جمال عبدلناصر ہندوستان کو اپنی آرزوؤں کا کعبہ تصور کرتے ہیں اور اب نہرو کہہ رہے ہیں:

اُس جانِ میکدہ کی قسم بارہا جگر
کل عالم بسیط پر چھا کے پی گیا

روسی خود چین سے ستیزہ کار ہو ہی نہ سکتا تھا چونکہ پھر کمیونسٹ دنیا زوال کی طرف جاسکتی تھی اور مغربی طاقتیں بغیر کسی سعی کے کمیونسٹ تحریک کے وقار اور پندار کو ٹھیس پہنچاسکتی تھیں۔ لیکن روس جانتا تھا کہ ہندوستان کی تاریخ یہ ہے کہ کسی کی بے بسی دیکھ کر اُن کا فائدہ اٹھا کر ہی شوق کی گہرائیاں دور ہوسکتی ہیں۔ اب ہندوستان کی تلخیاں چین کی جانب رعونت بن رہی تھیں۔ نہرو کو یقین تھا کہ اگر سرحدی تنازعہ کے معاملہ میں ہندوستان چین پر حاوی ہونے کا ڈرامہ رچا سکے تو ایشیاء، روس اور ہندوستان کی جاگیریں بن جائے گا اور چین مزید بیس سالوں تک صرف ایک دریوزہ گر کی طرح قال وقلیل پر مجبور ہوجائے گا۔ پھر پاکستان سے پاکستانی کشمیر حاصل کرنا ایک معمول کی بات ثابت ہوگی۔ اُس کے ساتھ ساتھ روس اور ہندوستان مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بناسکیں گے اور ہندستان کا یہ شہکار جمیل نہرو کو ایک جادو بیان شخصیت بنادے گا اور نہرو کی سوچ کا یہ عالم تھا کہ ”ہر گمان میں اک یقین سا، ہر یقین میں سو گمان“ اس وقت ہندوستان کی فوج کے سربراہ بی ایم کول تھے۔ جو نہرو کے بہت قریب تھے اور کشمیری پنڈت تھے۔ جو انکسار جمیل جانتے ہی نہیں تھے کیا شے ہے۔ اور

یہی رعونت محشر جذبات کو بھڑکاتی ہے۔ جنرل بی ایم کول صرف کتابی جنرل تھے۔ ان کے آباؤ اجداد نے سو پست سے سپاہ گری کی روایات کا نام بھی نہ سنا تھا۔ البتہ انہیں جنگی کتابیں ایک پڑھے لکھے طوطے کی طرح یاد تھیں۔ اُنہوں نے نہرو کو یقین دلایا کہ ہندوستانی فوج کے پاس اس قدر اسلحہ ہے کہ چین ہندوستانی سورماؤں کی خاک پا کو اپنی قضا سمجھے گا۔ بدھ مت کی تہذیب کو ہندوستان کے برہمنوں نے ہندوستان کی سرزمین سے مٹا دیا تھا۔ اب بدھ مت چین میں پناہ گزین ہے۔ اس لئے چینی ہندوستان سے صلح کل کی فریاد کریں گے یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان کے وزیرا عظم اور ہندوستان کی فوج کے سربراہ دونوں کشمیر برہمن تھے۔ اور وہ اپنی تمناؤں کا کھیل کشمیر کے لداخ صوبے میں کھیل رہے تھے۔ روس کو برہمنوں کی رعونت دیکھ کر یقین ہو چلا تھا کہ ہندوستان اور چین اب اتنا اُلجھ جائیں گے کہ اگے 30 سال تک ہندوستان، روس کا مرہونِ منت رہے گا۔ اور پھر وہ ہوا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پنڈت جی نے اکتوبر 1962 میں ایک پریس کانفرنس بلائی اور اعلان کیا کہ ہندوستانی افواج کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ لداخ میں چینی دراندازوں کو سرحد پر زبرستی دھکیل دیں۔ ہندوستان کے تمام اخبارات نے پنڈت جی کے حکم کو شہہ سرخیوں میں شائع کیا۔ ہندوستانی فوج نے چینی چوکیوں پر اچانک زبردست حملہ کردیا۔ پہل ہندوستان نے کی تھی۔ جنگ کا بگل ہندوستان نے بجایا تھا۔ جارحیت ہندوستان کی طرف سے شروع ہوئی تھی۔ دست اندازی ہندوستان نے کی تھی۔ دنیا دم بخود تھی کہ اس ڈرامہ کا انجام کیا ہوگا؟ امریکہ کی تمام تر ہمدردیاں ہندوستان کے ساتھ تھیں۔ چین امریکہ کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ تمام مغربی ذرائع ابلاغ ہندوستان کی حمایت میں متحد تھے۔ ہندوستان کو روس اور امریکہ دونوں کی اعانت حاصل تھی۔ سب چاہتے

تھے کہ ہندوستان چین پر غالب آئے اور ہندوستان ایشیاء میں ایک نئی عظیم طاقت بن کر اُبھرے۔

حقیقت یہ تھی کہ روس کی خفیہ ایجنسیوں نے پنڈت جی کو یقین دلایا تھا کہ چین کی فوج ابھی بیلچہ بردار دہقانوں کا ایک غیر منظّم گروپ ہے اور ہندوستان کی فوج گذشتہ ایک سو برس سے مغربی طرز پر تربیت یافتہ منظّم فوج ہے۔ جو جدید اسلحہ سے لیس ہے اور لداخ کی وادیوں میں 1947 سے تعینات ہے اور روس بھی اسلحہ فراہم کر رہا ہے اور اس طرح لداخ میں چین کو ہزیمت اٹھانی پڑے گی، روس اور ہندوستان وسط ایشیاء اور جنوبی ایشیاء پر اپنا اثر رسوخ قائم کر سکیں گے اور پھر پاکستان کے پارہ ہائے جگر ہندوستان کے وفاق میں پرو لئے جائیں گے۔ روس کو کراچی تک راہداری حاصل ہوگی اور ہندوستانی اور روس کی بحریہ اب بحر ہند کے پانیوں کی تقدیر کی داور ثابت ہوں گی۔ روس واقعی ہندوستان کی فوج کی اہلیت کا قائل تھا۔ ہندوستانی عزم نا قابل تسخیر نظر آ رہا تھا۔ تمام حالات اور قراین ہندوستان کی برتری کی خوش آیند پیش گوئی کر رہے تھے اور ہندوستانی فوج ''دوزخ تیرے قبضے میں ہے'' کے جذبہ سے سرشار یلغار پر آمادہ ہوگئی تھی اور یلغار بھی ''ہر ہر مہادیو'' کے نعروں سے ایک نیا جوش خروش حاصل کر رہی تھی اور اپنے خدائی دعویٰ میں ہندوستانی فوج سمجھتی تھی کہ اُسے ایک خدا نہیں دس کروڑ بھگوانوں کی تائید اس کوہستانی جنگ کا رخ بدلنے کے لئے حاصل تھی۔ پنڈت جی خارق عادات کامیابی اور کامرانی کا مژدہ سننے کے لئے ماہی بے آب کی طرح بے تاب نظر آ رہے تھے۔ مگر زمینی حقائق کچھ اور تھے۔ چینی جوابی حملہ اتنا شدید تھا کہ لداخ کے کوہ و متن، لداخ کے ہامون اور کوہستان میں لداخ کے سنگلاخ پہاڑوں کی چوٹیوں کے وسط میں ایک ایسے خونی کھیل کا آغاز ہوا جس نے

پانی پت کی تیسری جنگ کی یاد تازہ کر دی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کی یلغار کے سامنے ڈیڑھ لاکھ مرہٹی فوج ایسی حواس باختہ ہوئی تھی کہ مرہٹہ سردار اپنی دھوتی اور چپل چھوڑ کر میدانِ جنگ سے فرار ہوئے تھے۔ ایک لاکھ کے قریب مرہٹہ مارے گئے اور باقی سورما اپنی جان بچی اور لاکھوں پائے کہتے ہوئے اپنی شرم، حمیت اور غیرت کو بھی میدانِ جنگ کے حوالے کر کے فرار کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ یہ بھی تاریخ دانوں نے پانی پت کی تیسری جنگ کے متعلق تاریخ میں درج کی ہے۔ آج لداخ میں بھی ہندوستانی فوج حواس باختہ ہو کر اپنے چپل اور جوتے چھوڑ بھاگنے کے نئے معیار قائم کر رہی تھی۔ آسام میں چین کی پیش قدمی جاری تھی۔ اب چین کی کامیابی مسلم تھی۔ اس نے جنگ بندی، بلکہ یک طرف جنگ بندی کا اعلان کر دیا یہ بات قابلِ غور ہے کہ امریکہ نے فیلڈ مارشل ایوب خان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس صورتحال کا فائدہ نہیں اُٹھائے گا اور پاکستان کشمیر میں امن قائم رکھے گا۔ ہندوستان کو برادر اخیانی تصور کرے گا۔ اور ہندوستان کے ساتھ باون تولے پاؤرتی کا معاملہ کرے گا۔ اور کشمیر کے تنازعہ کے حل کے لئے بات چیت کا سلسلہ احترام کے ساتھ جاری رکھے گا۔ امریکہ بھی چاہتا تھا کہ ہندوستان چین کو سبق سکھائے اور چینی کمنیوازم میں جو اُبھال آیا ہے وہ اب ختم ہو کہ ماوزے تنگ کی قیادت اُبکائی لینے لگی۔ لیکن امریکہ اور روس دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان ایک کاغذی شیر ہے اور ایک شکست آمادہ قوم ہے جو چین کی جارحیت کی خوف سے سہم گئی ہے۔ یہ ایک شکست فاش تھی

ہندوستان کی رائے عامہ بھی اس قدر ششدر نظر آ رہی تھی کہ ان کا احتجاج بھی حرفِ بے نوا بن چکا تھا۔ ہندوستانی قوم کی پس ہمتی نے روس کی آنکھیں کھول دیں۔ ہندوسان ایک محوری طاقت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ خود روس نے چین

کے ساتھ اپنے سرحدی تنازعات پر امن طور طے کرنے کا عزم کر لیا اور امریکہ نے فیصلہ کر لیا کہ ایشیاء میں چین سے تعلقات بحال کرنا امریکی مفادات کے لئے سود مند ثابت ہوں گے۔ اس جنگ سے ایشیاء میں ایک نئی حکمت عملی کا آغاز ہوا۔ پاکستان کے سب سے ذہین سیاست دان ذوالفقار علی بھٹو نے اس جنگ سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پاکستان کی سلامتی چین سے مفاہمت کرنے مین ہے اور یہ ذوالفقار علی بھٹو کی فراست اور دور اندیشی کا اعجاز ہے کہ اُنہوں نے 1963 کے اوائل میں ہی چین کے ساتھ کشمیر میں سرحدی تنازعہ باوقار طریقے سے چین کو اس کا جائز حق دے کر چین سے معاہد کر کے پاکستان اور چین کے لازوال دوستی کی بنیاد قائم کر لی۔ اور اس حکمت عملی نے ہندوستان کو غرور آ گہی کو سرنگون کر دیا تھا اور ہندوستان میں پنڈت نہرو فریاد کر رہے تھے:

"اُڑ گیا رنگ۔۔ کھل گیا اپنا بھرم"

کرشنا مَنن کو قربانی کا بکرا بنایا گیا۔ بی، این، کول اپنی کمان داری کو ترک کر کے گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔ پنڈتِ نہرو نفسیاتی طور پر علیل ہو گئے پھر اُن پر فالج کا دورہ پڑا۔ اور اُنہوں نے اب کشمیر کی گتھی سلجھانے کے لئے آخری حربہ استعمال کیا۔ جو اُن کے لئے غو غائیے فکر ناتمام ثابت ہوا۔

ایک تاریخ واقعہ ہے کہ 1962 کی ہند چین سرحدی جنگ کے فوراً بعد 1963 میں موئے مقدس کا حضرت بل کی درگاہ سے گم شدگی کا واقعہ پیش آیا۔ درگاہ حضرت بل کی عظمت کشمیری دل و دماغ میں چھائی ہوئی تھی۔ اس واقعہ نے پورے کشمیر میں آگ لگا دی۔ کشمیر کی وادی میں ہندوستان مخالف جذبات کی آندھی چلنے لگی۔ اتنا بڑا عوامی انقلاب گذشتہ پانچ صدیوں سے وقوع پذیر ہی نہ ہوا تھا۔ کشمیر کے مرد و

زن، شیر خوار بچے، جوان جینے مرنے کی بازی لگا کر سڑکوں پر آئے کہ محفوظ ہی نہیں، درگاہ حضرت بل کشمیری مسلمانوں کی تہذیب، کلچر، روایات کی سب سے نمایاں اور عظیم علامت تھی۔ جسے کشمیر کے لوگ خاص طور پر دیہات کے لوگ کعبۂ صغیر تصور کرتے تھے ''موئے مقدس کی چوری'' کا کوئی جواز ہی نہ تھا۔ عوام نعرہ لگا رہے تھے ''اصلی ملزم کو پیش کرو'' یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ اصلی ملزم تو درکنار موئے مقدس کی چوری کے سلسلے میں نقلی ملزم کو بھی پیش نہ کیا گیا۔ عوامی رائے دل فگار نظر آ رہی تھی۔ بقولِ بی۔ ایم۔ ملک جو اس وقت ہندوستان کی آئی، بی، کے سربراہ تھے۔ ہندوستان کی خفیہ ایجنسیوں نے موئے مقدس کی بازیابی کا ڈرامہ اس آشوب میں جہاں کے ہوتے ہوئے کامیابی سے سرانجام دیا اور کرن سنگھ جو کشمیر کے صدرِ ریاست اور مہاراجہ ہری سنگھ کے اکلوتے فرزند تھے اُنہوں نے ''موئے مقدس'' کی بازیابی کی خبر نشر کی اور یہ ہنگامہ اپنے منطقی انجام کو پہنچنے کے بغیر ختم ہو گیا۔ جب پنڈت جی نے دلی میں تفاصیل سُنی تو اُن پر سکتہ طاری ہو گیا کہ کشمیر میں ہندوستان مخالف جذبات ابھی ختم نہیں ہوئے۔ بلکہ جوان ہو رہے ہیں۔ بقولِ جوش ملیح آبادی:

شبنم و برف کے اس حلقۂ غمناک میں بھی
اُٹھ رہا ہے دل انسان سے دھواں کیا کہنا!

اور پنڈت جی جوان دنوں مرضِ مایوس (Depression) میں مُبتلا تھے۔ محسوس کر رہے تھے کہ خوابوں اور خیالوں کے حریری ملبوس جب اپنی حقیقت کے خاروں سے اُلجھ جاتے ہیں تو انسان اپنے سامنے اپنی نظر میں برہنہ ہو جاتا ہے اور برہنگی فریب نہیں حقیقت ہوتی ہے اور وہ مقام آتا ہے:

کھلا ہے چہرۂ روشن کوئی نقاب نہیں

## نگاہِ شوق مگر پھر بھی کامیابی نہیں

سوال یہ ہے کہ موئے مقدس حضرت بل کی گمشدگی کا اصلی ملزم کون تھا اور موئے مقدس کی بازیابی کے ساتھ ہی کشمیر میں یہ تقاضا کہ اصلی ملزم کو پیش کرو کیوں ایک دم معدوم ہو گیا؟ کیوں شیخ صاحب، بیگ صاحب (مرزا افضل بیگ) بخشی صاحب، صادق صاحب، خود جماعت اسلامی نے اس مطالبہ کو ترک کر دیا؟ کیوں میر واعظ کا یہ تقاضا کہ اصلی ملزم کون ہے ترک کر دیا گیا؟ اور خود کیوں کشمیر کے عوام نے یہ مطالبہ ترک کر دیا؟ اور حقیقت میں اصلی ملزم کون ہے؟ موئے مقدس کی گمشدگی کے ڈرامہ کا اصل مفہوم کیا تھا؟ ''ایک معمہ ہے نہ سُلجھنے کا نہ سُلجھانے کا'' کہہ کر ہم اپنا دامن چھڑا نہیں سکتے۔ قیاس آرائیوں کی تراش اور خراش سے اس بارے میں ہم اپنی سوچ کا پیکر تراش نہیں سکتے۔ منطقی استدلال کے اصول ظاہر کرتے ہیں کہ واقعات اور قرائن اور سیاسی منظر نامہ کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ہم کچھ نتیجے اخذ کر سکتے ہیں جو ممکنات کے حدود میں شامل ہیں۔ لیکن اِن سوالوں کا جواب نہ مِل سکا ہے

اُس وقت کے آئی، بی، کے سربراہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ موئے مقدس کی بازیابی ہندوستان کی خفیہ ایجنسیوں کا نکتہ عروج کا راز ہے۔ جو نا قابلِ تشہیر ہے۔ اس دعویٰ کو آپ سیاسی منظر نامہ کی روشنی میں دیکھئے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ 1962 میں ہندوستان اور چین کی جنگ کا خاتمہ، ہندوستان کی اس صدی کی سب سے بڑی فاش شکست پر انجام پذیر ہوا تھا۔ روس کو اطمینان ہو گیا کہ ہندوستان ایک کم پایا طاقت ہے۔ جو دیوارِ چین کو منہدم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ہندوستان کی افواج کی پستی گہرائیوں کو چھو رہی ہے اور چین تو درکجا یہ پاکستان کے ساتھ بھی کوئی فیصلہ کُن جنگ نہیں لڑ سکتی ہے۔ 1948 میں جب پاکستان خاک نشین تھا ہندوستان

کی افواج کوئی فیصلہ کُن جنگ اختتام تک پہنچا ہی نہ سکی تھی۔اب 1962 کے چین اور ہندوستان کے معرکے نے روس کی آنکھوں سے پردہ اُٹھا دیا تھا کہ ہندوستان بلندیوں پر پرواز کرنے کے ارادے تو رکھتا ہے مگر وہ بال و پر نہیں رکھتا ہے۔اور اب روس جانتا تھا کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی ذوالفقار علی بھٹو جیسے صاحبِ کمال کے ہاتھوں میں ہے۔جس کی نگاہ تیز اور عقابی روح ،اور جس کے درونِ دل میں پاکستان کی یکجہتی کا تصور تھا۔اس کی نگاہِ شوخ اس راہ کو تلاش کر رہی ہے۔ جہاں پاکستان اور چین ہمراہی بن سکتے ہیں۔اس لئے روس کے لئے پاکستان کے لئے ایک آدرش بن چکی تھی۔عوام کی معاونت اُسے حاصل تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان، شیخ مجیب الرحمان کا سب سے بڑا حمایتی بن چکا تھا۔روس اور ہندوستان کے نظریات میں مکمل ہم آہنگی تھی اور پاکستان کی تقسیم کی سب سازشیں روبہ عمل تھیں۔اس لئے پاکستان کی توجہ مغربی پاکستان کے حالات سے ہٹانے کے لئے موئے مقدس کی گمشدگی کا ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ یہ روس کی K.G.B کے مشوروں اور فکر کے اجالوں میں جنوبی ایشیاء میں بالکل نئے استعارہ ہے۔نئی سیاسی علامات، نئے رمز و کنایہ،نئی تراکیب، نئے معنی و مفہوم اور نئی سوچ کا کُھلم کُھلا اعلان تھا۔اس لئے 1963 میں ہی ذوالفقار علی بھٹو نے کمال فراست سے کشمیر مئیں چین کے ساتھ سرحدی تنازعہ ختم کر کے نئے سرحدی معاہدہ پر دستخط ثبت کر دیئے تھے۔اب کشمیر کے حالات نے پاکستان کی توجہ مشرقی پاکستان کے بجائے کشمیر کی طرف مبذول کر دی اور ہندوستان کو شیخ مجیب الرحمان سے ایک گہری سازش کو انجام پذیر کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ ہندوستان اور روس کی خفیہ ایجنسیوں کے راز اندر راز کے عنکبوت کے جال اب پیچیدہ تر نظر آرہے تھے۔ امریکہ کو ان ارادوں کی آگہی تھی۔مگر امریکہ کی سیاسی استدلال کے مطابق ایک تقسیم

شدہ مغربی پاکستان ایسے ذرائع حاصل کرنے میں اتنا محدود ہو جائے گا کہ حالات اُسے امریکہ کی اعانت حاصل کرنے پر مجبور کردیں گے۔ خروشیف اور بلگا منن نے 1955 میں سرینگر میں ہندوستان سے کہا تھا۔ کشمیر کے لئے تم پہاڑ کی چوٹی سے ہمیں آواز دو اور ہم بُوستان، سرو و گل و شمشاد کی وادی میں اس طرح آن پہنچیں گے جیسے بادِ نسیم گلشن میں اپنی آمد کا اعلان کرتی ہے۔ اس لئے ہندوستان کے لئے رنجوری کی کوئی بات نہیں صرف کامرانی ہی کامرانی ہے۔ یہ تھی روس اور ہندوستان کی مفاہمت کی بنیاد اور اب ہندوستان کی خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ روس کی K.G.B کشمیر میں ایک نیا کھیل کھیلنے پر آمادہ نظر آرہی تھی۔ اب امریکہ نے بھی فیصلہ کرلیا کہ چین کے مقابلے میں ہندوستان کی فوج کو از سر نو منظّم کرنا ہوگا اور ہندوستان کو امریکہ کی فوجی معاونت بھی کرنا ہوگی۔ سال 1964 میں ہندوتان پاکستان کے ساتھ نئ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو چُکا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو اب ماوزے تنگ کے خیالات سے کافی متاثر تھے کہ ہندوستان چونکہ پاکستان سے آبادی کے لحاظ سے، قدرتی وسائل کے لحاظ سے، فوجی طاقت کے لحاظ سے، معاشی طاقت کے لحاظ سے پاکستان سے بہت زیادہ قوی ہے۔ اس لئے کشمیر میں ہندوستان کے آتش و آہن کے حصار کو صرف گوریلا جنگ سے ڈھایا جاسکتا ہے۔ خوشحال خان خٹک نے افغانوں کو اس گوریلا جنگ کے قصیدے پڑھ کر سُنائے تھے کہ اس جنگ کے خوف سے مغل شاہ سواروں کی گردسمندان کے پہاڑ کی چوٹیوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔ اس سے قبل اس گوریلا جنگ کا موجد حسن بن صباح تھا۔ جس نے خلافت اسلامی کو کھلونا بنا دیا تھا اور پھر اسی جنگ نے انگریزوں کو پہلی اور دوسری برٹش ہندوستان اور افغانستان جنگ میں چھٹی کا دودھ یاد دلایا تھا خود ماوزے تُنگ نے سرخ فوج کو اس طرز جنگ کو اپنانے

کو کہا تھا۔ اور چینی کمیونسٹ پارٹی کو کامیابی کی منزل پر پہنچا دیا تھا۔ اب 1965 کے آغاز میں ہی بھٹو صاحب نے جنرل اختر حسین ملک کو کشمیر میں نئی حکمت عملی اپنانے پر آمادہ کیا تھا تا کہ ہندوستان مفاہت کے لئے میز پر آنے کے لئے آمادہ ہو جائے۔ اس لئے آزاد کشمیر کے ریٹائر فوجی طلب کر لئے گئے اور کشمیر میں مسلح جدو جہد کی روایت قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ایسا کیوں سوچا؟ ایسا قدم کیوں اُٹھایا تھا۔ 1962 میں ہندوستان اور چین کی جنگ کے دوران پاکستان امریکہ کے دباؤ کے تحت غیر جانبدار رہا تھا۔ جنگ کے اختتام پر روس کو یقین ہو گیا کہ پاکستان اب چین کا حلیف بن جائے گا۔ پاکستان کو اس ارادے سے باز رکھنے کے لئے پنڈت نہرو نے شیخ صاحب کو جیل سے رہا کر دیا۔ شیخ صاحب سے مفاہمت کی اور شیخ صاحب کو یقین دلایا کہ پاکستان، ہندوستان اور کشمیر ایک فیڈریشن بن کر رہ سکتے ہیں اور اس طرح خود مختار کشمیر کا خواب پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے اس لئے وہ پاکستان جا کر اس نظریہ کی ادشاشاعت کریں اور عوامی تائید حاصل کریں۔ چنانچہ یہ نظریہ لے کر شیخ صاحب پاکستان تشریف لائے جہاں اُن کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ اُنہوں نے عوامی جلسے منعقد کئے جن میں لاکھوں لوگوں نے شرکت کی تھی۔ شیخ صاحب کو پاکستان میں کشمیر کی آزادی کا ہیرو تصور کیا جانے لگا۔ حفیظ جالندھری نے اُن کے قصیدے گائے، ذرائع ابلاغ نے انہیں کشمیر کا مسیحا کہا۔ پاکستان کی سیاسی جماعتوں نے شیخ صاحب کی عظمت کو تسلیم کیا۔ مگر جب شیخ صاحب نے کشمیر، پاکستان اور ہندوستان کی فیڈریشن کا تذکرہ کیا تو فیلڈ مارشل ایوب خان صدرِ پاکستان نے اس تجویز کو ناقابلِ عمل کہہ کر مسترد کر دیا۔

اول کشمیر، پاکستان اور ہندوستان کی فیڈریشن قائم کرنے کا مقصد اکھنڈ

بھارت کی تشکیل نو تھا۔ دوم اس منصوبہ کا مقصد پاکستان اور چین میں ایک ناقابلِ عبور خلیج پیدا کرنا تھا۔ سوم اس منصوبہ کا مقصد پاکستان کی خارجہ پالیسی کو ہندوستان کے خارجہ پالیسی کا تابع بنانا تھا۔ چہارم اس منصوبہ کا مقصد نظریۂ پاکستان کی نفی کرنا تھا۔ شیخ صاحب یہ منصوبہ لے کر آزاد کشمیر کے لیڈروں سے گفت وشنید چاہتے تھے کہ اچانک 27 مئی 1964 کو آنجہانی نہرو پر دل کا دورہ پڑا تھا اور وہ انتقال کر گئے تھے۔ شیخ صاحب نہرو کی موت پر زار زار روئے اور اپنا دورہ ملتوی کر کے واپس دلی چلے آئے تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے شیخ صاحب کے دورۂ پاکستان سے نتیجہ اخذ کیا کہ ہندوستان ابھی اکھنڈ بھارت کے ایجنڈہ پر قائم ہے۔ گر شیخ صاحب کے انداز بیان سے وہ سمجھنے لگے کہ یہ کشمیری عوام ہندوستان کی قیادت سے متنفر ہیں اس لئے اگر 1965 میں آزاد کشمیر کے کشمیری مجاہد مسلح جدوجہد کے آغاز کریں گے تو انہیں عوام کی بھرپور حمایت حاصل ہوگی اور پھر ہندوستان کشمیر کا حل ڈھونڈنے کے لئے سعی کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ ہندوستان بھی یہی باتیں شیخ مجیب الرحمان سے کہہ رہا تھا۔ اس وقت پاکستان کو ان باتوں کا علم نہ تھا۔ مگر جب 1968 میں شیخ مجیب الرحمان پر اگرتلہ سازش کا مقدمہ چلایا گیا تو یہ تمام حقائق منظر آئے تھے۔ اس لئے پاکستان کی شیخ صاحب سے الفت اور شیخ مجیب الرحمان کی ہندوستان سے محبت تھی:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

دونوں جانب عقل وخرد پر ناز کرنا ہی فضول تھا۔ پاکستان کی اعانت سے

اگست 1965 آزاد کشمیر کے گوریلا کشمیر آئے اور سرینگر میں اپنی کاروائیوں کا آغاز کر دیا اور 6 ستمبر 1965 کو ہندوستان نے لاہور اور سیالکوٹ کے علاقے پر بھاری فوج اور ٹینکوں سے حملہ کر دیا۔ ہندوستان یہ روس کے اشارہ پر کر رہا تھا۔ 17 دن یہ جنگ چلی اور 23 ستمبر 1965 کو یہ جنگ اختتام پر پہنچی تھی اور پھر روس نے درمیان داری کرنا چاہی ۔ لیکن تاشقند 11 جنوری 1966 کو لال بہادر شاشتر وزیر اعظم ہندوستان کا انتہائی مشکوک حالات میں انتقال ہو گیا اور معاملہ لٹک گیا۔

میں نے اس سیاسی منظر نامے کے تسلسل کی طرف توجہ مرکوز کی ہے۔ چونکہ میں نہ تو تاریخ دان ہوں کہ ان واقعات کی صحیح انشراح پیش کر سکوں گا نہ ہی سیاست داں ہوں۔ ان کی توضیحات پیش کر سکوں۔ نہ ہی مجھے صاحبِ علم ہونے کا دعویٰ ہے کہ ان کی توضیحات بیان کروں۔ لیکن ان کے تسلسل کو مدِ نظر رکھ کر اپنا تاثر بیانکر سکتا ہوں۔ میرا تاثر یہ ہے کہ حالات ، واقعات ، قرائن کا تسلسل ہمیں یہ سوچنے کی اجازت دیتا ہے کہ:

اول 1953 میں شیخ عبداللہ کو وزیر اعظم کے عہدہ سے علاحدگی پسند ہونے کے الزام میں برطرف کرنا، صرف پاکستان کی توجہ مشرقی پاکستان کی طرف سے ہٹانے سے تھا۔

دوم 1955 میں موئے مقدس رائے شماری کا قیام بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ سوم 1964 میں موئے مقدس کی گمشدگی بھی اسی گہری پالیسی کو منطقی انجام تک لے جانے کی ایک سعی تھی اور یہ سب کچھ روس کی اعانت سے ہو رہا تھا۔

چہارم ، پاکستان کے وجود کو ہندوستان نے کبھی تسلیم ہی نہ کیا تھا اور انگریز اور سویت روس پاکستان کے وجود کو اپنے مفادات کے خلاف تصور کرتے تھے چونکہ

پاکستان، ایران اور ترکی ایک محوری طاقت بننے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ایران تیل کی دولت سے مالا مال ہے اس لئے وسط ایشیاء کی تیل کی فراہمی کی سیاست عرب و عجم کی پرانی رقابتوں پر قائم کی جارہی تھی۔ سویت روس اور امریکہ یوں تو بالا انفرادا لگ الگ نظریہ رکھتے تھے۔ مگر تیل کی فراہمی کے بارے میں اُن کی پالیسی میں اشتراک تھا۔ کہ عرب، اسرائیل جھگڑے کو ہوا دے کر عرب ممالک کے اختلافات کی آگ کو ہوا دے کر اور ایران اور ترکی کی رقابتوں کا ڈھونگ رچا کر وہ تیل حاصل کر رہے تھے۔ اس معاملے پر دونوں کا اتفاق تھا۔

اب جنوبی ایشیاء میں ہندوستان کی مدد سے چونکہ مشرقی پاکستان میں ڈیڑھ کروڑ ہندو آباد تھے اور مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان ہندوستان سے ہی عبور و مُرور ممکن تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں تفریق رکھنا اُن کے اس ارادے کی تکمیل کے لئے مکتفی تھا کہ وہ پاکستان کو مناسب وقت پر تقسیم کر سکیں۔ اسلئے بقولِ کلدیپ نائر جو کہ ایک مقتدر صحافی ہیں، ماونٹ بیٹن نے راجہ گوپال اچاریہ کو 1950 میں عندیہ دیا تھا کہ پاکستان کا وجود اکیس سال کے اندر اختتام کو پہنچے گا۔ یہ پیشن گوئی 1971 میں تکمیل کو پہنچی تھی۔ اس دوران ہندوستان نے شیخ مجیب الرحمان سے رابطے قائم کئے اور بنگالی قومیت کو بلاکشش طاقت مشرقی پاکستان کے ہندو متمول طبقے نے بنا دیا تھا۔ ہندوتان کے ذرائع ابلاغ نے بڑی کامیابی سے شیخ مجیب الرحان کی سیاست کو لسانی بنیادوں پر عوام میں مقبول بنانے میں اہم رول ادا کیا، اور نئی بالیدگی عطا کی۔ 1968 میں پاکستان خواب گراں سے جاگا اور جب مشرقی پاکستان کے حالات کی تاویل کرنا چاہی تو انہیں آگہی ہوئی کہ شیخ مجیب الرحمان اور ہندوتان کے درمیان پاکستان کو تقسیم کرنے کے لئے جو سازش ہوئی ہے وہ اب عملی طور پر منزلوں

میں داخل ہوئی ہے۔ 1968 میں اگر تلہ سازش کیس عدلیہ کے سپرد کیا گیا جس کا سب سے اہم کردار شیخ مجیب الرحمان تھا۔ اگر تلہ سازش کیس بالکل حقیقت پر مبنی تھا اور جنرل محمد یحیٰ خان نے جو بیان کلکتہ کے بنگالی نژاد جج جسٹس حمود الرحمان کو تحریری طور دیا یعنی محمد طاہر ایڈوکیٹ لاہور ہائیکورٹ نے کمیشن کے وساطت سے دیا اس میں اُنہوں نے بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کی ایک وجہ اگر گلہ سازش کیس کو منطقی انجام تک پہنچانا بتایا ہے۔ یہ پاکستان کی حکومت کی غفلت اور سب سے بڑی فاش غلطی تھی ۔1965 سے ہی بنگالی قومیت نے اپنے اردوں کا اظہار اس وقت ظاہر کیا جب پاکستان کے 1965 کے صدارتی انتخابات میں مشرقی پاکستان میں فیلڈ مارشل ایوب خان کی انتخابی شکست کے لئے ہر ممکن سعی کی گئی تھی ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ 1958 میں حکومت سنبھالنے کے فوراً بعد فیلڈ مارشل ایوب خان نے اپنی ساری توجہ مشرقی پاسکتان کی تعمیر اور ترقی کی طرف مبذول کردی تھی۔ لیکن ایوب خان نے جو آئین نافذ کیا تھا اس سے بنگالی قومیت کو تقویت ملی کہ انہیں سیاسی طور غلبہ حاصل کرنے سے باز رکھا جائے گا۔ اور ہندوتان اور پاکستان کی 1965 جنگ کے فوراً بعد مشرقی پاکستان میں بنگالی مغربی پاکستان کے خلاف کُھلم کُھلا اظہار رائے کر رہے تھے حتیٰ کہ ایواب خان کے زمانے میں پاکستان میں تمام ترقی اور ڈیولپمنٹ مشرقی پاکستان میں ہی وقوع پذیر ہو رہی تھی، اور ان حالات میں ہمیں شیخ مجیب الرحمان کی فروری 1966 کی اس تقریر کو ذہن نشین کرنا ہوگا جس میں انہوں نے آل پاکستان نیشنل کانفرنس کے سامنے اپنا چھ نکاتی فامولہ پیش کیا تھا۔ وہ چھ نکات تھے:

اوّل: آبادی کی بنیاد پر انتخابات ہوں گے اور حکومت تشکیل دی جائے گی۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ مشرقی پاکستان کی آبادی مغربی پاکستان سے وسیع تھی۔

دوم: مرکزی حکومت صرف ڈیفنس اور امورِ خارجہ رکھ سکے گی۔

سوم: کرنسی ایک نہیں، بلکہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔

چہارم: معاشی حالات (ہر صوبے یعنی) مشرقی اور مغربی پاکستان کے حدِ اختیار میں علیحدہ علیحدہ طور پر رہیں گے۔

پنجم: فارن زرمبادلہ دونوں صوبے علیحدہ علیحدہ طور حاصل کریں گے، اور اُن کا حساب صوبائی طور پر رکھا جائے گا۔

ششم: دونوں صوبہ جات علیحدہ علیحدہ ملیشیا یا فوج رکھنے کے حقدار تصور کیے جاسکیں گے۔

شیخ مجیب الرحمان نے جب یہ چھ نکاتی فارمولہ پیش کیا تھا اُس وقت مشرقی پاکستان کی شرح ترقی ورلڈ بنک اور بین الاقوامی اداروں کے مطابق ہندوستان کے مغربی بنگال سے بہت زیادہ تھی، اور 1965 کی جنگ میں مشرقی پاکستان نہیں بلکہ مغربی پاکستان نقصان عظیم اُٹھا چکا تھا اور 1965 کی جنگ کے دوران ہندوستان نے اعلانیہ طور کہا تھا کہ وہ مشرقی پاکستان کا خیر خواہ ہے اور جھگڑا صرف مغربی پاکستان سے ہے اور اس دوران بھی مشرقی پاکستان کے ہندو ہندوستان کی بنکوں میں دولت ڈیپازٹ کر رہے تھے۔ 1947 میں جب پاکستان وجود میں آیا تو مشرقی پاکستان کی 80% دولت اور تجارت ہندو اقلیت کے ہاتھ میں تھی۔ جن کی مغربی بنگال کے تجارتی اداروں کے ساتھ گہرے روابط تھے اور اس لئے قانون جائیداد مہاجرین مشرقی پاکستان پر نافذ ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نہرو، لیاقت علی معاہدہ 1947 میں مشرقی پاکستان کو مستثنیٰ رکھا گیا تھا۔

ان حالات کا تذکرہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی 3 جون 1966 کی

تقریر میں بطور وزیر خارجہ پاکستان کھل کر کیا اور صاف صاف اعلان کیا کہ ہندوستان مشرقی پاکستان کے اندرونی معاملات میں کُھلم کُھلا مداخلت کر رہا ہے۔ یہ تقریر انتہائی اہم تاریخی مواد ہے۔ 1965 سے 1970 تک مشرقی پاکستان کی ہندو اقلیت کلچرل آرگنائزیشن کا ایک جال بچھا رہی تھی اور کلچر اور بنگالی زبان کے نام پر کُھلم کُھلا بنگالی قومیت کو مستحکم کر رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 19 جون 1968 کو اگرتلہ سازش کیس سپیشل جج کی عدالت میں دائر کیا گیا تھا، اور ہندوستان کی اس سازش میں شمولیت لیفٹننٹ کمانڈر معظم کی ڈائری سے ثابت تھی۔ جس سے صاف ظاہر تھا کچھ اور بنگالی فوجی افسر بھی اس مقدمہ میں ملوث پائے گئے تھے اور ہندوستان اس سازش میں مکمل شریک تھا۔

صدر ایوب خان 10 فروری 1968 کو دل کے عارضہ میں یا کسی اور بیماری میں علیل ہو کر مفلوج ہو چکے تھے اور ذوالفقار علی بھٹو کی پیپلز کانفرنس اُن کی مخالف بن چکی تھی۔ پاکستان کے حالات ایک نئی گردش میں تھے۔ بقولِ غالبؔ:

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان<br>
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

اور پھر صدر ایوب نے حالات سے مجبور ہو کر پاکستان کی یکجہتی کے خاطر کرمنل لا ترمیمی آرڈننس 1968 منسوخ کر دیا اور شیخ مجیب الرحمان نے اعلانیہ کہا کہ وہ 1970 کے صدارتی انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ لیکن پاکستان کے بگڑے ہوئے حالات کے پیشِ نظر 25 مارچ 1969 کو فوج نے ایوب خان کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا اور جنرل یحییٰ خان نے صدرِ پاکستان کا منصب سنبھالا تھا۔ اس لئے کشمیر کے 1953 سے لے کر 1971 تک کے تمام حالات کا تعلق مشرقی

پاکستان کے حالات سے منسلک ہے۔ چونکہ کشمیر اور بنگلہ دیش کے متعلق ہندوستان کی تمام پالیسی روس کی معاونت اور امریکہ کی دانستہ چشم پوشی کو مدِ نظر رکھ کر مرتب کی گئی تھی ۔اس پالیسی کا ایک بین الاقوامی پہلو بھی تھا۔ جس کی کوئی علمیت نہ تو شیخ عبداللہ کو نہ ہی کشمیر کے کسی لیڈر کو، یا کسی جماعت کو تھی ۔ انہیں بین الاقوامی پس منظر کو سمجھنے کا شعور ہی حاصل نہ تھا۔ ان کی تمام سیاست صرف ریجنل تھی اور کشمیری عوام کی سیاسی جہالت، اُن کے لیڈروں کی حالاتِ حاضرہ سے لاعلمی، اُن کی وسط ایشیاء سے دُوری، اُن کی سویت روس کے حالات سے غیر واقفیت، ہندوستان کی بختیاری کو چار چاند لگارہی تھی ۔اور بقولِ ساحر لدھیانوی:

وہی ظلمت ہے فضاؤں میں ابھی تک طاری
جانے کب ختم ہو، انسانوں کے لہو کی تقطیر
جانے کب نکھرے سیہ پوش فضا کا جوبن
جانیئے کب بجائے گی ستم خوردہ بشر کی تقدیر؟

اِن حالات میں ہم ایک تسلسل دیکھتے ہیں اور تسلسل حادثہ نہیں ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش کا قیام دوقومی نظریہ کی نفی کرتا تھا اور ہندوستان چاہتا تھا کہ بنگلہ دیش کے قیام کی گہری چھاپ کشمیر کی وادیوں پہ نظر آئے گی۔ اس لئے اب بڑی گہری نگاہ سے اور پہلو دار زاویوں سے ہمیں غور و تفکر کرنا ہوگا کہ کیا اسبات تھے جنہوں نے بنگلہ دیش کو ایک حقیقت بنا دیا۔ اِس کا مقصد پاکستان کے نظریئے کی نفی کرنا تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جنرل محمد یحییٰ خان ایک انتہائی ذہین اور قابل ترین جنرل تھے جو صحیح معنوں میں محب الوطن تھے۔ یحییٰ خان ایک فوجی آمریت قائم ہی نہ کرنا چاہتے تھے وہ ایک جمہوری پاکستان کا خواب دیکھ رہے تھے ۔ وہ ذاتی طاقت اور

مفادات کو حاصل کرنا اپنا مقصود ہی نہ تصور کرتے تھے۔ اس لئے اُن کی زندگی کا منشاء غیر جانبدارنہ انتخابات کروانا اور پاکستان میں اقتدار عوام کے نمائندوں کے حوالے کرنا تھا۔ جنرل ایوب خان صرف فوجی حکومت کی بقاء کے لئے سعی کرتے رہے تھے ۔ جنرل ضیا الحق فوجی لباس میں تنگ نظر کٹر مُلا تھے۔ جو اسلام کی روایات کے مطابق امیر المومنین بننا چاہتے تھے اور اس لئے کبھی انتخابات کے حامی ہی نہ تھے۔ جنرل پرویز مشرف صرف امریکہ کی خوشنودی حاصل کر کے اپنا فوجی نظامِ حکومت برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جنرل محمد یحییٰ خان ایک سچے، پُرخلوص فوجی آمر تھے جنہیں پاکستان کو ایک مضبوط جمہوری ملک بنانے کا سودا سر میں سما گیا تھا۔ اس لئے مارچ 1969 سے ہی یحییٰ خان نے انتخابات کرانے پر پوری توجہ مرکوز کر دی تھی اور وہ غیر جانبدارنہ انتخابات کے زبردست حامی تھی۔ لیکن یحییٰ خان کی بدقسمتی یہ تھی کہ پاکستان کی عوام نے ایوب خان کے 1962 کے آئین کو مسترد کر دیا تھا اور ایوب خان کے زمانے میں مشرقی پاکستان نے جو حیرت انگیز ترقی کی طرف قدم اُٹھایا تھا اس وجہ سے خود پاکستان کی فوج کے کچھ جنرلوں کی جنگی وفاداری مغربی پاکستان سے تھی اور کچھ اہم سیاست داں اور سیاسی پارٹیاں اس نتیجہ پر پہنچ چکی تھیں کہ مشرقی پاکستان اب مغربی پاکستان پر ایک معاشی بوجھ ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ شیخ مجیب الرحمان مشرقی پاکستان کی بدحالی کا ذمہ دار مغربی پاکستان کو قرار دے کر بنگالی قومیت کی رُوح کو بیدار کر رہا تھا۔ یحییٰ خان نے اپنے آدرشوں کی تکمیل کے لئے 1970 میں نہایت ہی غیر جانبدارنہ انتخابات کروا کر جمہوریت کی داغ بیل ڈالنا چاہی تھی انتخابات کے نتائج نے دنیا کو چونکا دیا تھا۔ شیخ مجیب کو مشرقی پاکستان میں سو فیصد ووٹ ملے تھے ۔ مگر مغربی پاکستان میں ایک بھی سیٹ نہ ملی تھی اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی

پیپلز پارٹی بڑی ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی مگر اُس سے مشرقی پاکستان میں ایک سیٹ بھی نہ ملی تھی۔ اس لئے سے بڑا سوال یہ تھا کہ پاکستان کی حکومت کون سی جماعت تشکیل دے گی اور پاکستان کا وزیر اعظم کون ہوگا؟ شیخ مجیب اسے چھ نکاتی فارمولہ کا قبل ازیں اعلان کر چکے تھے اور ذوالفقار علی بھٹو ان چھ نکات کو تسلیم ہی نہ کر سکتے تھے۔ اور یحییٰ خان جمہوری اصولوں پر عمل کرنا چاہتے تھے اور شیخ مجیب الرحمان کو اقتدار منتقل کرنا چاہتے تھے لیکن جب مغربی پاکستان کی سیاسی جماعتوں نے اس کی مخالفت کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان میں رائے عامہ فوج اور پنجابیوں کے خلاف ایک نفرت کا سیلاب بن کر بہنے لگی اور اب شیخ مجیب الرحمان نے تقاضا شروع کیا کہ پاکستان کی فوج کو مشرقی پاکستان سے انخلا کرنا چاہیے۔ اس لئے یحییٰ خان شیخ مجیب الرحمان کو اقتدار نہ سونپ سکے۔ لیکن جنرل یحییٰ خان جنوری 1971 میں ڈھاکہ گئے اور شیخ مجیب الرحمان سے طویل مذاکرات کئے اور شیخ مجیب کو پاکستان کے وزیر اعظم کے عہدہ کی پیش کش کی تھی۔ اب جنرل یحییٰ خان چاہتے تھے کہ جنرل اسمبلی کا اجلاس طلب کیا جائے اور 120 یوم کے اندر اندر جنرل اسمبلی کو پاکستان کا نیا آئین بنانے کی استدعا کی جائے۔ یہ رائے خود شیخ مجیب نے دی تھی کہ فروری 1971 میں جنرل اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا جائے۔ اس لئے جنرل یحییٰ نے ڈھاکہ میں جنرل اسمبلی کا اجلاس بلانا چاہا۔ لیکن شیخ مجیب نے اعلان کیا کہ جنرل اسمبلی جس میں 313 ممبر منتخب ہوئے تھے۔ اس کا اجلاس 15 فروری 1971 میں ڈھاکہ میں بلانے کا اعلان ہونا چاہیے نہیں تو ڈھاکہ میں عوامی احتجاج کا سلسلہ شروع کیا جائے گا۔ یحییٰ خان نے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شیخ مجیب الرحمان کو پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر مخلوط حکومت بنانے کا مشورہ دیا تھا تاکہ آئین کی تشکیل ممکن

ہو سکے۔ لیکن ذوالفقار علی بھٹو نیشنل اسمبلی کا اجلاس ڈھاکہ میں بلانے کے حق میں نہ تھے اور اس طرح ڈھاکہ میں عوامی احتجاج کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا تھا۔ وہ شیخ مجیب الرحمان کے چھ نکات کو تسلیم ہی نہ کر سکتے تھے۔ جنرل یحیٰ خان نے شیخ مجیب کو اسلام آباد آ کر بھٹو اور دیگر مغربی پاکستان کے سیاست دانوں سے مذاکرات کرنے کے لئے دعوت دی۔ جو شیخ مجیب الرحمان نے ٹھکرادی تھی۔ اس لئے اب بھٹو کی پیپلز پارٹی اور شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ میں مفاہمت ممکن ہی نہ تھی۔ لیکن یحیٰ خان نے مارچ 1971 میں ڈھاکہ میں نیشنل اسمبلی کا اجلاس بلانے کا فیصلہ کر لیا تو پیپلز پارٹی نے اعلان کر دیا کہ وہ اس اجلاس کا بائیکاٹ کریں گے۔ یہ اعلان 28 فروری 1971 کو کیا گیا۔ باقی پارٹیوں نے مغربی پاکستان کی بائیکاٹ کا اعلان 3 مارچ 1971 کو کر دیا تھا۔ اس لئے مجبوراً یحیٰ خان نے اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا تھا۔ 2 مارچ کو صاحبزادہ یعقوب خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کر دیا گیا تھا۔ 6 مارچ 1971 کو شیخ مجیب الرحمان نے عوامی جلسہ میں چار نکاتی فارمولہ پیش کیا تھا یعنی:

اوّل: مشرقی پاکستان میں مارشل لا فوراً ختم کیا جائے۔

دوم: اقتدار عوامی لیگ کے حوالے کر دیا جائے۔

سوم: ایک کمیشن قائم کیا جائے جو چند روز قبل فوج کی عوام پر فائرنگ کی وجوہات دریافت کرے۔

چہارم: پاکستانی فوج کو بارکوں میں واپس بلالیا جائے۔

یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ فوراً اس تقریر کے بعد لفٹینٹ جنرل یعقوب خان نے غالباً امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مشرقی پاکستان کے گورنر کے عہدے سے اپنا استعفیٰ دے دیا تھا۔ اس استعفےٰ کے متعلق یحیٰ خان نے حمود الرحمان

کمیشن میں جو بیان محمد طاہر ایڈووکیٹ لاہور کی وساطت سے دیا تھا۔ اس میں یحییٰ خان نے صاف کہا کہ جنرل یعقوب خان نے کچھ غیر ملکی طاقتوں کے ایماء پر گورنر کے عہدے سے ایسے نازک وقت میں استعفیٰ دے کر پاکستان اور فوج سے غداری کی ہے ۔جس کی وجہ سے اُن کا کورٹ مارشل ہونا چاہیے تھا۔ یحییٰ خان نے اپنے بیان میں صاف کہا تھا کہ صرف جنرل یعقوب خان ہی بلکہ پاکستان کی افواج کے بہت سے اہم افسران استعفیٰ دینا چاہتے تھے اور ملک کے مفادات کے خلاف کام کر رہے تھے۔

اس کے فوراً بعد 10 مارچ 1971 کو یحییٰ خان ڈھاکہ چلے گئے اور 25 مارچ 1971 کو ڈھاکہ میں نیشنل اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا تھا۔ 15 مارچ کو یحییٰ خان پھر ڈھاکہ گئے اور عوامی لیگ کے نمائندوں سے مذاکرات کئے تھے اور اس روز اب شیخ مجیب نے جنرل یحییٰ خان کو مطلع کیا تھا کہ بنگالیوں نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ نہیں تو نیشنل اسمبلی کو منقسم کرنا ہوگا اور اس طرح دو علیحدہ آئین مرتب ہو سکیں گے ۔اور پھر یہ دو اسمبلیاں ایک مشترکہ اجلاس بلا کر فیڈریشن کی نسبت اعلان کر سکتے ہیں۔
یحییٰ خان نے اس مرحلہ پر مغربی پاکستان سے مذاکرات کے لئے جن اشخاص کو طلب کی اُن میں:

(۱) ذوالفقار علی بھٹو

(۲) خان ولی خان

(۳) ممتاز دولتانہ

(۴) مفتی محمود

(۵) قیوم خان

(۶) سردار شوکت حیات

(۷) اور بلوچستان کے بزنجو شامل تھے۔ مگر کوئی مفاہمت ہی نہ ہوسکی تھی حتیٰ کہ ان لوگوں نے شیخ سے کافی طویل مذاکرات کیئے تھے۔ یہ 15 مارچ یا اس کے آس پاس کا واقع ہے، اور بھٹو نے اب اس بغاوت کو فوجی طور کچلنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ بات بھی یحییٰ خان اپنے بیان میں جو اُس نے محمود الرحمان کمیشن کو دیا ہے۔ خاص طور پر درج کروائی ہے۔ لیکن مغربی پاکستان کے باقی سیاسی رہنماؤں نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ یحییٰ خان نے شیخ مجیب کو پیغام بھیجا کہ وہ اس کی تجاویز قبول کرنے کو تیار ہے اگر وہ پاکستان کے وزیر اعظم کا عہدہ قبول کریں اور نیشنل اسمبلی کا اجلاس طلب کریں اور پھر جمہوری طریقے سے وفاق کی تجویز کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ لیکن شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے جواب میں کہ اب وہ صرف بنگلہ دیش بنانے کے مقصد کو عملی جامہ پہنائیں گے۔ ان حالات میں جنرل یحییٰ خان نے 25 مارچ 1971 کو فوج کو امن واپس قائم کرنے کی ہدایات جاری کی تھیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ 26 مارچ 1971 کی صبح سے فوج اور پولیس سے تمام بنگالی افسر فرار ہو کر شیخ مجیب کی عوامی لیگ میں شامل ہونا شروع ہوئے تھے اور ان لوگوں نے کُھلم کُھلا بغاوت کا اعلان کر دیا تھا۔ بنگلہ دیش میں جو مشرقی پاکستان کہلاتا تھا۔ بنگالیوں کے جذبات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بہت قلیل فوج تعینات کی گئی تھی۔ اس لئے مغربی پاکستان سے دو ڈویژن فوج مشرقی پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ یحییٰ خان کی خداداد قابلیت اور فوجی صلاحیت کا کمال تھا کہ ہوائی جہازوں کے ذریعہ پورے ساز و سامان کے ساتھ دو ڈویژن فوج صرف دو ہفتوں کے اندر بنگلہ دیش پہنچ گئی تھی۔ جنگ عظیم دوم کے بعد فوج کی منتقلی کا ایسا عظیم کارنامہ دُنیا نے نہ دیکھا تھا۔ اور پھر فوج نے بنگالی عوامی لیگ کی بغاوت کو مکمل طور کچل کر رکھ دیا تھا۔ اس

مرحلہ پر ہندوستان نے بنگلہ دیش میں عملی طور مداخلت کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اب ہندوستان کی فوج بنگلہ دیش میں بنگالیوں کی حمایت میں لڑ رہی تھی اور ہندوستان نے یہ وجہ دی تھی کہ مغربی بنگال میں ہندو مہاجرین لاکھوں کی تعداد میں آئے ہیں اس لئے اپنے دفاع میں ہندوستان یہ حملہ کرنے پر مجبور ہے چونکہ مشرقی پاکستان میں ہندو بنگالیوں کا قتل عام جاری ہے۔

لیکن حقیقت یہ تھی کہ روس فوجی طور پر اس جنگ میں ہندوستان کی مدد کر رہا تھا۔ روس کے جنگی ٹرانسپورٹ جہاز، چھاتہ بردار ہندوستانی فوج کو ڈھاکہ پر اتار رہے تھے۔ امریکہ بھی چاہتا تھا کہ پاکستان منقسم ہو اور پاکستانی فوج کے کچھ اہم جنرل بھی امریکہ کے خیالات سے متفق تھے اور چاہتے تھے کہ بنگلہ دیش وجود میں آئے۔ صاحبزادہ یعقوب خان نے کسی غیر ملکی طاقت کی ایماء پر مارچ 1971 میں گورنر مشرقی پاکستان کے عہدہ سے استعفیٰ دیا تھا اور پاکستان کی سیاسی جماعتیں مشرقی پاکستان کو اب اپنے اوپر سیاسی بوجھ تصور کر رہی تھیں۔ چین پاکستانی فوج کے افسران کے رویہ سے واقف تھا۔ اور اس لئے وہ صرف زبان سے پاکستان کی حمایت کر رہا تھا اور یہ وہ تاریک رات تھی، یہ منظر تھا جس کی نسبت جوش صاحب نے کہا ہے:

"بن میں جیسے رات کو ابلیس کی پرچھائیاں"

قبل ازیں اندرا گاندھی نے خود امریکہ کا دورہ کیا تھا اور امریکی رائے عامہ کو تقسیم پاکستان کے خیال سے ہم آہنگ پایا تھا اور وہ اپنی مسکراہٹوں میں صبح درخشان لئے۔۔ ہندوستان آئی تھی اور پھر بنگلہ دیش بنانے کے لئے ہندوستانی فوج پاکستان پر حملہ آور ہوئی تھی۔ اس فوجی حملہ کے باوجود پاکستانی افواج میں اتنی زیادہ صلاحیت تھی کہ وہ جنگ کا رُخ موڑ سکتے تھے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان کی فوج کے اہم

جنرل اور بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی بنگلہ دیش کو یعنی مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان پر ایک اقتصادی بوجھ تصور کرتے تھے۔ اس لئے بنگلہ دیش بنانے میں پاکستان کی افواج کے کچھ اہم جنرلوں کی ہمدردیاں بھی شامل تھیں اور اس طرح شیخ مجیب اور ان لوگوں کا درداب ''دردِ مشترک'' تھا۔ جس درد کے گرد و پیش اب سیاست گردش کر رہی تھی۔ ورنہ ہندوستان کی فوج اتنی ناقابل تھی کہ انہیں ڈھاکہ پر چھاتہ بردار سپاہی اتارنے کے لئے اور بمباری کے لئے روسی جہاز منگوانے پڑھے تھے۔ اور روس نے ان کی اُمیدوں کی کشت ویران کو شاداب بنادیا تھا۔ شیخ مجیب مغربی پاکستان کے در پردہ اعانت سے جس میں فوج کی ہمدردیں شامل تھیں اپنی تحریک چلا رہے تھے وہ ہندوستان کی امداد سے بنگلہ دیش بنا ہی نہ سکتا تھا۔ خود پاکستان نے کچھ فوجی جنرل مشرقی پاکستان میں تشہیر بازی کی بنیادیں ہلا دینے میں مصروفِ عمل تھے۔ اس لئے بنگلہ دیش کا وُجود میں آنا ایک تاریخی عمل تھا۔ جوش نے کیا خوب کہا ہے:

جمی ہے دماغوں پر برف مُدت سے
ددلوں میں دولت برق و شرار پیدا کر
مذاق بندگی عصر نو کی تجھ کو قسم
نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

پاکستان کے کچھ فوجی جنرل اور مغربی پاکستان کے کچھ اہم سیاستداں صرف بنگلہ دیش میں ہی نہیں بلکہ مغربی پاکستان میں نئے مزاج کا پروردگار تخلیق کر رہے تھے اور یحییٰ خان ایک آدرش پسند کے طور پر سمجھ رہے تھے:

لایا بزم و رزم کی ارض تضاد سے
یہ طبل جنگ ساز شبستان تیرے لئے

ان کا خیال تھا اس مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے؟ لیکن یہ سادگی ہائے تمنا تھی کہ اس مسئلہ کا کوئی حل ممکن ہوتا اس لئے جنگ ناگریز تھی اور ہندوستان نے سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت بہت زور دار حملہ کیا تھا۔ پاکستان کی جنگ ہارنے کی دو وجوہات تھیں۔

اوّل یہ پاکستان کی فوج جنگ ہارنا چاہتی تھی، دوم مغربی پاکستان کے کچھ اہم سیاست دان مشرقی پاکستان کو اقتصادی بوجھ تصور کرتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ بنگلہ دیش کا وجود کشمیریں کو حوصلہ دے گا کہ وہ ہندوستان کے خلاف بنگلہ دیش کی مثال سے وجدان حاصل کر کے مسلح جدوجہد کا آغاز کریں گے اور ہندوستان کی کامیابی اُن کی سیاسی شکست ثابت ہوگی۔ میں نے یہ نتیجہ اس لئے اخذ کیا ہے چونکہ واقعات اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ 20 نومبر 1971 کو ہندوستان نے پہلے مشرقی پاکستان پر بھرپور حملہ کر دیا تھا اور پاکستانی کشمیر کی طرف بھی دراندازی کے اقدام کئے تھے۔ پاکستان کے مغربی فضائی حدود کی خلاف ورزی کی جانے لگی تھی۔ ان حالات میں صدرِ پاکستان نے پاکسانی فضاییہ کو حکم جاری کیا تھا کہ وہ مغربی پاکستان سے ملحق ہندوستان کی فضائی تنصیفات پر فوراً بمباری جاری کریں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جنرل مانک شاہ نے اندرا گاندھی سے کہا تھا کہ وہ چار دسمبر کے روز مغربی پاکستان پر حملہ کریں گے۔ اس لئے یحیٰی خان نے بری فوج کو بھی حکم دیا تھا کہ پاکستان سے ملحقہ 150 میل سرحدی علاقہ پر قبضہ کرنے کے فوراً بعد دلی کی طرف پیش قدمی کی جائے۔ لیکن دونوں احکامات پر فوری طور عمل نہیں کیا گیا۔ پاک فضائیہ نے 3 دسمبر کو ہندوستان پر نیم حملہ کیا تھا لیکن بری فوج نے کوئی زبردست کاروائی نہیں کی تھی۔ فضائی فوج کے سربراہ نے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی تھی۔ آخر کیوں؟ اور پاکستان کی بحریہ بھی خاموش

تماشائی تھی ؟ آخر کیوں؟ جنرل یحییٰ خان نے اپنے فوجی مقاصد حاصل کرنے کے لئے صرف 11 گھنٹے کا وقت مقرر کیا تھا لیکن فضائی فوج، بحریہ اور بری فوج کے سربراہوں نے کوئی دلچسپی نہ لی تھی۔ یحییٰ خان کو یقین ہو گیا کہ پاکستان جنگ ہار چکا ہے۔اس لئے 10 دسمبر 1971 کو جنگ بندی کرانے کے لئے سلامتی کونسل سے رجوع کیا گیا اور پھر 15 دسمبر 1971 کو جنرل عبدالرحمان خان نیازی نے صدر پاکستان کو پیغام دیا کہ جنگ بندی کا معاہدہ کیا جائے تا کہ پاکستان کی فوج بنگلہ دیش سے واپس آسکے۔لیکن اس کے برعکس جنرل نیازی نے یک طرفہ طور صدرِ پاکستان کی اجازت حاصل کئے بغیر 16 دسمبر 1971 کو ہندوستانی افواج کے روبرو ڈھاکہ میں ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ حتیٰ کہ لوکل کمانڈر کے معاہدہ کے مطابق پاکستانی افواج کو کہا گیا تھا کہ انہیں ہتھیار ڈالنے کے بعد پاکستان جانے کے لئے راہداری دی جائے جائے گی۔ مگر ہوا اس کے برعکس آخر کیوں؟ پاکستان کے فوجی جنرل، فضائیہ اور بحریہ کے سربراہ کس کی ہدایت پر عمل کر رہے تھے؟ کیا وجہ تھی کہ نومبر 1971 اور دسمبر 1971 میں روسی بحریہ کے جہاز کراچی کی بندرگاہ کے عقب میں تعینات کئے گئے تھے۔ لیکن بحریہ کے سربراہ نے مکمل خاموش اختیار کی تھی۔ روس کی فضائیہ عملی طور پر ہندوستانی فضائیہ کو راڈار اور الیکٹرانک آلات سے اہم اطلاعات فراہم کر رہی تھیں اور ہندوستان میں تعینات تھیں۔ اس کے باوجود فضائیہ کے کچھ وفادار افسروں نے ذاتی طور ہندوستان کی فضائیہ کا مقابلہ کیا اور 150 جنگی جہازوں کو ناکارہ قرار دیا گیا۔ اگر میں غلط بیانی سے کام لے رہا ہوں۔ ہندوستان کی حکومت کو چاہیے کہ وہ تعداد و شمار کی نسبت اور نقصان کی نسبت ایک وائٹ پیپر جاری کرے اور صحیح اعداد شمار عوام کے سامنے پیش کرے۔ اس کے بعد روس کی فضائیہ کی مدد سے کراچی اور اٹک میں

ہندوستان کی فضائیہ نے تیل کی تنصیبات اور سُوی گیس فیکٹری کو عظیم نقصان پہنچایا تھا۔ جنرل یحییٰ خان نے مغربی پاکستان میں جنگ جاری رکھنے کا اعلان کر دیا تھا۔ مگر اب سلامتی کونسل نے نہیں بلکہ جنرل اسمبلی نے جنگ بندی کی قرارداد منظور کر لی تھی۔ اور اب یہ بات منظرِ عام پر آئی کہ ہتھیار ڈالنے کے وقت پاکستان کی فوج کے پاس کس قدر اسلحہ تھا کہ وہ مشرقی پاکستان میں چھ ماہ تک ہندوستان کے ساتھ جنگ جاری رکھ سکتے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان حالات میں جب کہ جنرل عبدالرحمان خان نیازی کو صرف جنگ بندی کی اجازت دی گئی تھی۔ اُنہوں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے یک طرفہ طور ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کس کے ایماء پر کیا تھا؟ ائیر مارشل رحیم جو فضائیہ کے سربراہ تھے اور جنرل گُل حسن کا رول کیوں منفی رہا تھا؟ اور پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈالنے کے بجائے ملحقہ چین کے علاقے میں کیوں پناہ نہ لی تھی۔ جب کہ یہ پناہ پاکستانی فوج کو مل سکتی تھی؟ یہ انتہائی دُکھ کی بات ہے کہ صاحبزادہ لیاقت علی خان کی قتل کی تحقیقات کی رپورٹ تلف کر دی گئی اور جسٹس محمود الرحمان کی رپوٹ کو صیغۂ راز بنا دیا گیا۔ اس طرح قیاس آرائیوں کا دور شروع ہوا اور ان قیاس آرائیوں کے گرد و غبار میں پاکستان کی صحیح تاریخ دھندلا گئی ہے۔ جنرل محمد یحییٰ خان کو 20 دسمبر 1971 کو حراست میں لے لیا گیا۔ جنرل یحییٰ تقریباً گیارہ سال حراست میں رہے اور حراست کے دوران اُن کا انتقال ہو گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے نئے سربراہ بن گئے اور اب پاکستان کے بربادیاں ختم ہونے کے بجائے پھر سے مصیبتوں کے سائے میں سانس لینے لگیں۔ حوادث کا ایک نیا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ حالات کی آندھی اب تیز تر گرج رہی تھی۔ ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا تھا۔ میں چونکہ پاکستان کی تاریخ رقم نہیں کر رہا ہوں پھر کشمیر کا رخ کروں گا اور بنگلہ

دیش کا وجود کیسے کشمیر کی سیاست پر اثر انداز ہوا تھا اس انقلاب کا اختصار سے جائزہ لوں گا۔ چونکہ تغیر حالات ہی زمانے کا رُخ قائم کرتے ہیں اور یہی حالات جوش کی زبان میں ''طوفان بدوش وصاعقہ پیا وحشر خیز'' نظر آتے تھے۔ کیا وجہ تھی کہ بنگلہ دیش کے وجود نے کشمیریوں کے سینے میں آزادی کی اُمنگوں کو ساکت وصامت کر دیا تھا؟ آخر کیوں؟ کیوں نہ بنگلہ دیش کی مثال نے شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس کو نیا وجدان عطا کیا تھا؟ کیوں نہ اس مثال سے سبق لے کر کشمیری آزادی کی تمناؤں کی خاطر جنون خیز جدو جہد پر آمادہ ہوئے تھے؟ آخر بنگلہ دیش کی مثال کشمیریوں کی تمناؤں کو ولولہ خیز بنا سکتی تھی۔ اگر بنگلہ دیش آزاد ہو سکتا ہے تو کشمیر بھی آزاد ہو سکتا ہے۔ یہ خیال کیوں سہم گیا؟ اور کشمیریوں کی آواز پر شب کا سکوت کیوں چھا گیا تھا؟ کشمیریوں میں حیات کی ترنگ پیدا ہی کیوں نہ ہوئی؟ حتیٰ کہ کشمیر کی وادیوں میں تنگ گھاٹیوں میں گرجتے ہوئے آبشاروں کی صدائیں بھی خاموش ہو گئیں؟ آخر کیوں؟ 16 دسمبر 1971 کو پاکستان کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں اس مشکل گھڑی میں ذوالفقار علی بھٹو جیسا بلند ہمت، بلند حوصلہ، بلند خیال قائد ملا۔ جس نے پاکستان کی ہولناک شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا۔ جس نے پاک قوم کے جیالوں کو نیا حوصلہ، نیا وعزم، نیا ولولہ، نئی جینے کی تمنا، نئی آرزو عطا کی۔ ایک نئی جہت عطا کی۔ اگر جناح صاحب نے پاکستان بنایا تھا تو بھٹو صاحب نے پاکستان کو خدا کی عنایت سے از سر نو محکم کیا ہے۔ لوگوں کی آشفتہ خاطری ان کی نئی قوتِ نمو کا محرک ثابت ہوئی۔ پاکستان پھر سے اُبھرا اور اپنی جغرافیائی تناظر Startegic Position کی وجہ سے پہلے سے زیادہ اہم ملک ثابت ہوا۔ لیکن 16 دسمبر 1971 کو کشمیر کا المیہ شروع جو آج بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہا۔ اب وہ مقام آن پہنچا تھا جس کے متعلق کسی نے

کہا ہے:

تاریخ کی آنکھوں نے وہ دور بھی دیکھا ہے
لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی!

لیفٹننٹ جنرل عبدالرحمان خان آفندی نے صرف 16 دسمبر 1971 کو پاکستانی فوج کی جانب سے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ہتھیار ڈال کر صرف اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ نہیں لگایا تھا بلکہ اُنہوں نے حقیقت میں شیخ عبداللہ کی طرف سے بھی ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اور اس روز کشمیر کی آزادی کی تحریک آخری سانس لینے لگی تھی۔ شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ کو اپنی 22 سالہ سیاسی جدوجہد سیاسی آوارہ گردی دکھائی دی تھی ایسا کیوں ہوا؟ انسانوں کی نفسیات کی طرح قوموں کی نفسیات ہوتی ہے۔ کوئی نفسیات ماہر، اس نفسیاتی حادثہ کی توجہ دے سکتا ہے۔ کس خیال نے شیخ صاحب اور محاذِ رائے شمارے کے دل و دماغ پر قبضہ کیا تھا؟ باغیوں کا گروہ کیسے ایک رات میں ہندوستان کے خادفان خانہ زاد کی فہرست میں سرِ فہرست نظر آنے لگا تھا یہ انقلاب۔۔ تھا یا صبح محشر کا آغاز؟ آفات سماوی میں اس سے بڑی کون سی آفت کشمیر پر آئی ہے؟ اب شیخ صاحب کی پست ہمتی کا بھٹو صاحب کی علوہمی سے تقابلہ کیجئے۔ 16 دسمبر 1971 کو صرف بنگلہ دیش وجود میں نہیں آیا تھا۔ 90,000 پاکستانی فوجی قیدی بنا لئے گئے تھے۔ بے نظیر بھٹو نے اسے پاکستان کی تاریک ترین رات قرار دیا ہے۔ 500 فوجیوں پر ہندوستان نے جنگی جرائم میں ملوث ہونے کے لئے مقدمہ چلانے کا عندیہ دیا تھا۔ پاکستان کی آدھے سے زیادہ فضائیہ تباہ کردی تھی اور ایک تہائی بحریہ کے جہاز مفلوج بنا دیئے گئے تھے۔ پاکستان کی معیشت مذلت میں گرفتار تھی۔ لوگ مفلوک الحال تھے اور عوام فاقہ کشی کر رہے تھے۔ اس مایوسی کے عالم میں بھٹو

صاحب نے روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگا کر محنت کش طبقہ کو منظم کیا۔ زرعی اصلاحات کا اعلان کیا اور اپنی ذاتی دس ہزار ایکڑ زمین سرنڈر کی۔ فیکٹریوں، مزدوروں کی باہمی شراکت کا اعلان کیا اور ساتھ ہی ایک نیا آئین پاکستان بنانے کا اعلان کیا اور مئی 1972 میں اندرا گاندھی کے ساتھ شملہ میں مذاکرات کر کے شملہ سمجھوتہ کیا اور 90,000 ہزار پاکستانی فوجی قیدیوں کی رہائی حاصل کی ۔ اندرا گاندھی اور کانگریس کی سیاست کو ان ہی کے علاقے یعنی شملہ میں مات دے دی تھی اتنا ہی نہیں 29 اونچے درجے کے فوجی افسروں کو یک جنبش قلم نوکری سے برخواست کیا تھا اور سال 1972 میں ہی شملہ سمجھوتہ کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان ایک نیوکلیائی طاقت بنانے کا اعلان کیا اور حکومت کینڈا کے ساتھ ایک باضابطہ نیوکلیائی معاہدہ کیا تھا۔ دس بڑی بڑی انڈسٹریاں جو پاکستان میں اہم تھیں انہیں قومیانے کا اعلان کر دیا اور اسی زمانے میں 13 سال کی عمر تک کے بچوں کی تعلیم کو لازمی قرار دیا تھا۔ یہ سب کچھ 16 دسمبر 1971 سے لے کر 16 دسمبر 1972 تک ہو چکا تھا اس کے برعکس 1972 کا سال کشمیریوں کے لئے منحوس ترین سال ثابت ہوا۔ شیخ صاحب نے سال 1972 میں ایک انٹرویو لندن ٹائمز جریدے کے نمائندے پیٹر ہر کرسٹ کو 10 مارچ 1972 کو دیا تھا اور اُنہوں نے فرمایا تھا کہ ''ہمارا ہندوستان سے جھگڑا الحاق کی نسبت سے ہی نہیں صرف ہمیں کس قدر اندرونی خود مختاری چاہیئے اس کی نسبت سے ہمارا تنازعہ ہے''۔ اسکے فوراً بعد ہندوستان نے شیخ صاحب سے مذاکرات کا اعلان کیا تھا اور اس طرح بیگ پارتھا سارتھی مذاکرات شروع ہوئے تھے۔

کشمیر میں ایک خاموشی چھا گئی۔ محاذِ رائے شماری کے کارکن کچھ نہ سمجھنے کے قابل تھے۔ عام عوام شیخ صاحب کی سیاست کو فلسفیانہ، منطق سمجھتے تھے کہ وہ ہر بات پر

فلسفہ جانتے ہیں۔ان کی حکایات شرین اور ان کی سیاست کا مخفی اور ظاہر بتاتا ہے کہ پاکستان ایک ناکام ملک Faild State ہے جو بہت جلد کانچ کی طرح ٹوٹ جائے گا اور کشمیری خود آزادی کی گراں بازاریاں برداشت ہی نہیں کر سکتے۔نفسیات اور خاص کر سماجی نفسیات کے ماہرین کی تحقیق کے لئے ایک پوری قوم کا پست ہمت بغیر کسی وجہ کے ہو جانا، ایک اہم سوال ہے۔ایک اہم معمہ، ایک نہایت اہم چیستان ہے۔جس کا جواب صرف نفسیاتی جدلیات میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔شیخ صاحب اور بیگ صاحب کو اپنی 22 سالہ جدو جہد کیوں سیاسی آوارہ گردی لگی؟ یہ بھی ایک نفسیاتی سوال ہے جو محنت شاقہ کی تحقیق کا محتاج ہے۔کشمیر کی نفسیات کو سمجھنا بہت مشکل کام ہے۔شائد اس لئے :

یہاں جو ہے متاعِ زندگی سے سُرخ رُو ہو کر
مہذب بستیوں میں جا کے اکثر لوگ لوٹ آتے ہیں

ان باتوں پر غور کرتے ہوئے ہماری سوچ مفلوج دکھائی دیتی ہے چونکہ ہم بے معنی سیاست کو راز و نیاز و اسرار سمجھتے ہیں اور یہ طرزِ فکر ہمیں اندھیرے اور اُجالے کے درمیان دھکیل دیتا ہے۔جہاں کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ صاحب نے 1947 میں پاکستان کو ڈاکستان کہا تھا۔آج وہ پاکستان کو ڈاکستان بنتا دیکھ رہے تھے۔انہیں پاکستان سے کوئی عقیدت نہ تھی اب وہ ہندوستان کی فوجی طاقت کی عظمت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ہندوستان کے دانشوروں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ امکان یہی ہے کہ چند ہفتوں میں پاکستان کے ٹکرے ٹکرے ہو جائیں گے اور کشمیری اپنے زور بازو سے ہندوستان کی عظیم طاقت کی کلائیاں موڑ نہیں سکتے ہیں۔اس لئے ہندوستان سے مفاہمت ہی ایک واحد راستہ ہے

۔ جب کہ پیری اور شیب راستے کا سنگ گران ثابت ہو رہی تھی۔ ماؤزے تنگ، شی گوارو، ہوچی من جب ایسے مقام پر پہنچے تھے تو اُنہوں نے مایوسی کا فلسفہ ہی نہیں اپنایا بلکہ عوام کو پیغام دیا:

عرصہ عالم کا ہر ذرّہ ہے میدانِ عمل

اور اگر حلق پر خنجر کی دھار بھی پھر رہی ہو موت کی نہیں چشم حیوان کی تمنا کرو کیونکہ ناکامی صرف ایک سوچ کا نام ہے اور ان لوگوں نے ہی دنیا کی تاریخ بدل ڈالی ہے، بھٹو صاحب کو بھی جب موت کا پیغام ملا تو اُنہوں نے جنرل ضیا الحق سے رحم کی التجا نہ کی تھی اور یہ جنرل ضیا الحق کی فاش شکست تھی۔ ضیا الحق نے بھٹو کو پھانسی دے کر پاکستان کے عوام میں جمہوریت کی جڑیں اُن کے لہو سے سیراب کر دیں تھیں اور پاکستان پھر اُبھرے گا کے خوابِ پریشان کو حقیقت بنا دیا اور ہندوستان کو احساس ہوا کہ پاکستانی قوم ایک زندہ قوم ہے۔ پاکستان ایک تاریخی حقیقت ہے۔ تخیل نہیں اور عوام کا عزم پکار پکار کر کہہ رہا ہے:

کوئی قوت راہ سے مجھ کو ہٹا نہیں سکتی

کوئی ضربت میری گردن کو جھکا نہیں سکتی

ہندوستان پر خوف کے سائے منڈلانے لگے کہ اگر پاکستان کا وجود قائم ہے تو شیخ رشید سابق پاکستانی منسٹر کے الفاظ میں:

''کشمیر لا مندر کا پرشاد نہیں جو حلق سے آسانی سے نگلا جا سکتا ہے'' شیخ رشید صرف اس ایک جُملے کی وجہ سے کشمیر کی تاریخ کے حاشیہ میں یاد کیا جائے گا۔ اب کشمیر کا تنازعہ بھی ایک میوزیم میں نمائشی تاریخی چیز نہیں۔ بلکہ بقولِ جوش ملیح آبادی:

قلب شب میں یا شعور تصورِ صبح کا ہے بے قرار

1972 میں شیخ عبداللہ نے اندرا گاندھی ایکارڈ کیا۔ جس کا لب لباب دفعہ 370 کو برقرار رکھنا تھا۔ جس میں ہندوستان کو اعتراض نہیں تھا چونکہ 1975 تک تمام ہندوستانی قوانین کشمیر پر لاگو ہو چکے تھے۔ گورنر ہندوستان کا نافذہ کردہ شخص ہوگا جو گورنر راج کا اعلان کرسکتا ہے اور پھر مرکزی حکومت کی ہدایات پر کشمیر میں انتظامیہ نافذ العمل رہے گی یہ قانون لاگو ہو چکا تھا۔ کشمیر کا جسٹس ہندوستانی اور غیر کشمیر ہوگا۔ اور تمام ہائیکورٹ جج صدرِ ہندوستان مقرر کرے گا۔ ہندوستان اور فوج کی خفیہ ایجنسیاں باقاعدہ اور قانونی طور پر ہندوستان کی سالمیت پر برقرار رکھنے کے لئے مرکز کو اطلاعات فراہم کریں گی۔ گورنر ان حالات کو الگ طور مرکز کو کشمیر کے حالات سے باخبر رکھے گا۔ کشمیر معاشی معاملات میں مرکز کے زیرِ اثر رہے گا۔ یہ سب امور شیخ صاحب نے تسلیم کر لئے۔ کرنسی ہندوستان کی رہے گی۔ فارن ٹریڈ کے اختیارات ہندوستان کی پارلیمان کو حاصل ہوں گے اور معاشی طور پر کشمیر ہندوستان کے تابع رہے گا۔ یہ امر شیخ صاحب پر واضح کر دیا گیا تھا۔ اس لئے ہندوستان کو دفعہ 370 کے قائم رکھنے میں اب کوئی اعتراض نہ تھا۔ اس لئے کانگریس نے 1975 میں شیخ صاحب پر اعتماد کا ووٹ دے کر انہیں کشمیر کا وزیر اعلیٰ منتخب کیا۔ 13 نومبر 1974 کو اندرا شیخ ایکارڈ تشکیل پایا اور 1975 میں شیخ صاحب دوبارہ کشمیر میں برسر اقتدار آئے تھے۔ لیکن مرکز اب چاہتا تھا کہ کشمیر کے عوام اس ایکارڈ کے تصدیق کریں۔ اس لئے اغلب ہے شیخ صاحب کی اجازت سے کانگریس 1977 میں ان کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ اسمبلی میں دے کر نئے الیکشن کرانے کی فضا ہموار کر دی تھی۔ شیخ صاحب اب عوام سے کہہ رہے تھے کہ وہ کانگریس میں شامل نہیں ہوں گے اور نیشنل کانفرنس پارٹی کا وجود ختم نہیں کیا جائے گا اور اس طرح نیشنل کانفرنس پارٹی، کشمیر میں قومیت کی

علامت بن گئی اور 1977 کے انتخابات غیر جانبدارانہ طریقہ سے انجام پذیر ہوئے اور وادی کشمیر میں شیخ صاحب کو سو فیصد ووٹ ملے۔ شیخ صاحب کی کامیابی مرکز کی فتح تھی۔ یہ اندازہ عبداللہ ایکارڈ پر مہر تصدیق ثبت کرنے کا اعلان تھا اور شیخ صاحب کی مقبولیت اب آسمان کو چھو رہی تھی۔ شیخ مجیب کو اتنی بڑی حمایت بنگلہ دیش میں حاصل نہ ہوئی تھی۔ بنگلہ دیش میں جماعت اسلامی، بہاری مسلمان، موینا بھاشانی اور خود بنگالیوں کا ایک بہت بڑا حلقہ شیخ مجیب سے متفق نہیں تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی سالوں بعد شیخ مجیب الرحمان او اس کے خاندان کے بیشتر افراد کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ اس لئے میں علاحدگی پسند زعما کی اس منطقی استدلال کی نفی کرتا ہوں کہ کشمیر کی تاریخ آزادی کی وجہ سے اندرا شیخ ایکارڈ سے وجود میں آئی تھی۔ 1977 کے انتخابات نے ثابت کر دیا کہ شیخ صاحب کشمیر کے واحد لیڈر ہیں اور کشمیری قومیت کی واحد علامت ہیں اور اس لئے 1977 کے انتخابات نے ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں میں اس خیال کو مستحکم کر دیا کہ کشمیر پر واقعی ''برلا مندر کا پرشاد'' ہے جو نگل تو لیا گیا مگر ابھی ہضم کرنا باقی ہے۔

کشمیر ذہن خطوط منقسیم پر نہیں چلتا، وہ کبھی مخروطی ہے اور کبھی خط چلیپا اور اس میں کبھی جوش ابر باراں ہے، کبھی روح طوفان مفطر ہے۔ اور کبھی سکوت شام کی طرح خاموش راز پنہان لئے نمایاں تفادات پر خود حیران اور ششدر ہے اور اس کے زیر و بم کسی استدلال اور کسی جدلیات کے اصول مقرر نہیں کرتے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کشمیریوں کو خود اپنی قومیت پر اعتماد نہیں ہے، اور کشمیری سمجھتے ہیں:

پرتو چشم فسوں خیز برہمن کے سوا
نقش رنگینی رخسار بتا کچھ بھی نہیں

اور اس لئے چشمِ فسوں چیز برہمن نے ہمیشہ کشمیریوں کو مسحور کیا ہے۔ انہیں کبھی خوشحال خان، خٹک کے نغموں نے بے قرار نہیں کیا ہے اور زندگی کے سفر میں وہ برہمن کی چشم فسوں خیز سے اپنا اتا پتاہ پوچھتے رہے اور بقولِ جوش ملیح آبادی:

جوش میرے حق میں جو بُت بن چکا تھا برہمن

کیا خبر تھی برہمن بن کر خدا ہو جائے گا''!

1977 کے انتخابات نے واضح کر دیا کہ کشمیر کی وادی کو لوگوں نے سومناتھ کا مندر بنا ڈالا ہے۔ جہاں شیخ صاحب کی پرستش کی جاتی ہے اور شیخ صاحب کی مقبولیت کا 1977 میں یہ عالم تھا کہ بقولِ شاعر:

پرستش کی یہاں تک کہ اے بُت تجھے

نظر میں سبھون کی خدا کر چلے

سال 1982 میں شیخ صاحب کا انتقال ہوا، ان کے فرزند ڈاکٹر فاروق عبداللہ کشمیر کے وزیر اعلیٰ بنے اور پھر ہندوستان کو موقعہ ملا کہ فاروق عبداللہ اور ان کے بہنوی خواجہ غلام محمد شاہ کی رقابتوں کو کشمیر کی سیاست کی روح بنایا جائے۔ ہندوستان میں اسی دوران جنتا حکومت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اندرا گاندھی کی نیشنل کانگرنس پھر برسرِ اقتدار آئی تھی اس کی ایک بڑی وجہ ہندوستان میں روس کی مداخلت تھی۔ اندرا گاندھی روس کے بہت قریب تھی۔ بلکہ K.G.B کے ساتھ مکمل مفاہمت کر رہی تھی۔ بنگلہ دیش بن چکا تھا اور اب سویت روس اپنے منصوبہ کے دوسرے حصہ پر عمل کر رہا تھا۔ اس لئے روس افغانستان میں ''پرچم'' اور ''خلق پارٹی'' کے اختلافات کا فائدہ اُٹھا کر افغانستان پر فوجی قبضہ 1978 میں کر لیا، یا کر لینے کی بات ٹھان لی۔ ویتنام نے کمبوڈیا پر حملہ کر دیا تھا۔ اس لئے سال 1978-1979 میں جنوبی ایشیاء کی تاریخ کو رُخ

موڑنے والے سال تھے۔ روس کی فوجی موجودگی نے افغانستان میں پشتون آبادی کو سویت روس کے خلاف جہاد کے لئے کمربستہ کر دیا تھا۔ 18/19 دسمبر 1978 کو روس کی فوجیں بلگرام کے شہر میں داخل ہوگئیں تھیں۔ اور 27 دسمبر 1978 کے بعد افغانستان میں روس کی فوجیں مکمل طور تعینات ہو چکی تھیں۔ سویت روس یہ سمجھتا تھا کہ افغانستان 25000 ہزار دیہاتوں کا جو خودمختار ہیں ایک ملک ہے۔ اس لئے وہاں لوگ متحد ہو کر سویت روس کے قبضہ کے خلاف احتجاج نہیں کریں گے۔ لیکن اُن کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ 1979 میں افغانستان میں 85000 ہزار روسی فوج تعینات ہو چکی تھی جس میں ہر سال اضافہ کرنا پڑا اور فوج کی تعداد اب ایک لاکھ پندرہ ہزار ہوگئی۔ سویت روس کی فوجوں کو فضائیہ کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ سویت روس نے افغانوں کی معاشی بدحالی دور کرنے کے لئے بہت سے وعدے کیئے تھے مگر افغانوں نے اُن وعدوں کو ٹھکرا دیا۔ اس وقت جنرل ضیاالحق پاکستان کے صدر بن چکے تھے اور امریکہ نے جنرل ضیاالحق کو یقین دلایا کہ پاکستان پر سویت حملہ کی مدافعت تب ممکن ہے کہ افغانوں کی سویت روس کے خلاف مزاحمت کرنے کے لئے اُنہیں فوجی ساز و سامان سے لیس کیا جائے تاکہ افغان مزاحمت کار پاکستان کی سرزمین میں پناہ لے سکیں۔ وہاں فوجی تربیت اور فوجی اسلحہ حاصل کر سکیں جو امریکہ انہیں فراہم کرے گا اور اس طرح سویت روس کے خلاف مزاحمت کو مستحکم کیا جاسکتا ہے۔ جنرل ضیاالحق نے اس تجویز سے مکمل اتفاق کیا اور اب امریکہ فوجی اسلحہ پاکستان کے ذریعہ افغان جاہدین کے پاس پہنچنا شروع ہوگیا۔ اب جماعت اسلامی پاکستان کھُلم کھُلا افغان مجاہدین کی حمایت کر رہی تھی۔ پاکستان کی آئی ایس آئی اور دیگر خفیہ ایجنسیاں اس منصوبہ کو رُو بہ عمل لا رہے تھے اور اب سویت روس کو اندازہ ہوا کہ جہاد کے نام پر

اسامہ بن لادن عرب اور یمنی مجاہدوں کو القاعدہ کے نام پر امریکہ کی امداد سے منظم کر رہا ہے اور افغانستان پر فوجی قبضہ رکھنے کے لئے اسے بھاری قیمت چکانا پڑے گی۔ افغانستان کی جنگ روس کی معاشیات کو تباہ کر رہی تھی اور سویت روس میں معاشی حالات امریکہ کی گندم برآمد پر پابندیوں کی وجہ سے بالکل خراب ہو رہے تھے۔ اب سویت روس کے لئے افغانستان پر قبضہ رکھنا محال ہو گیا۔ اور معاشی حالات نے سویت روس کے خاتمے کے حالات پیدا کر دیئے تھے۔ 1989 اور 1990 میں سویت روس کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ وسط ایشیاء کے مسلم ممالک آزاد ہو گئے۔ روس افغانستان میں اپنی شکست تسلیم کر کے وہاں سے نکل آیا تھا۔ اب آئی ایس آئی نے کشمیر میں اسلحہ بردار مزاحمت کا منصوبہ بنایا۔ چونکہ افغانستان کے جہاد کے خاتمے پر پاکستان کے ہاتھ کافی امریکہ کا بھیجا ہوا اسلحہ موجود تھا۔ اور پنجاب میں سکھوں کی ہندوستان کے خلاف مزاحمتی تحریک بھی چل رہی تھی۔ اس لئے ضیاالحق نے آپریشن ٹوپاز کے نام پر کشمیر میں آئی ایس آئی کو اسلحہ بردار تحریک چلانے کی ہدایت کی تھی۔ یہ ضیاالحق کا اپنا اختراع نہ تھا یہ ترغیب اسے گلبدین حکمت یار اور کچھ جماعت اسلامی کی علماء کی طرف سے ملی تھی۔ کیونکہ ضیاالحق کا اپنا کوئی منصوبہ نہ تھا وہ صرف جماعت اسلامای کا ایک ''چمچہ'' تھا اور چمچوں کا کام صرف اوروں کے جذبۂ خوردنی کو اپنی معاونت سے آسان بنانا ہے۔ یہاں میں ایک وضاحت بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر مصنف کے لئے فرض ہے کہ کوئی بھی کتاب تصنیف کرتے وقت وہ پہلے ایمانداری کے معیار قائم کرے اور پھر اُن معیاروں کی کسوٹی پر اپنے موضوع سے انصاف کرے چونکہ کوئی بھی کتاب اپنے مصنف کی زندگی کی حدود سے ہمیشہ تجاوز کرنے کی سعی کرتی ہے۔ ورنہ وہ اس کی اپنی حیات میں مردہ قرار دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے کیا خوب

کہا ہے:

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
وہ فلسفہ حق لکھتا نہ گیا خون جگر سے

اور خون جگر میں انگلیاں ڈبو کر کچھ تحریر کرنے کے لئے خلوص نیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے اپنے جرم سے اقبال ہے کہ میں کشمیر میں ملی ٹنسی کے حالات پر قلم اُٹھانے سے گریز کر رہا ہوں۔ چونکہ کشمیر میں ابھی ملی ٹنسی جاری ہے اور میں ہمعصر حالات پر کوئی رائے ایمانداری سے قائم ہی نہیں کر سکتا۔ چونکہ واقعات کی تفاصیل مجموعہ اضداد ہوا کرتی ہے۔ عسکری تنظیموں کے بیان ایک رُخ پیش کرتا ہے اور حکومت کے ادارے ایک دوسرا رُخ بیان کرتے ہیں اور حقیقت انہی خرافات میں کھو جاتی ہے۔ اس لئے میں کشمیر میں عسکریت پسندی کے رجحانات کی بناء پر ان کے عوام میں پذیرائی پر اس عسکریت کی بظاہر ناکامی پر، اس کے عوامل پر، اس کے اثرات پر، اس کے کشمیر کے سماج پر اپنی چھاپ ڈالنے پر کشمیری عوام کی عسکریت کی نفسیات سے متاثر ہونے پر، عسکریت اور آئی ایس آئی کے در پردہ تعلقات پر اپنے تاثرات قلمبند کرنے سے گریز کروں گا چونکہ میری زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ ''میں زہرِ ہلال کو کبھی کہہ نہ سکا قند'' اور ہو سکتا ہے کہ میری رائے سے جماعت اسلامی اور کشمیر کی عسکریت پسند تنظیموں کے رہنما آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر میری صورت سے متنفر ہو جائیں اور سچ تو یہ ہے کہ اب پیری کی منزلوں کی جانب رواں ہوتے ہوئے مجھے اپنی زندگی پہلے سے زیادہ پیاری آنے لگی ہے۔ چونکہ میری اصطلاح میں پیری صرف سوچ کا نام ہے۔ انسان کے اندر جسمانی تغیر ایک فطری عمل ہے۔ مگر یہ تغیر انسان کی سوچ کو بوڑھا نہیں بنا سکتا اور جسم کا اپنا کوئی الگ نظام نہیں ہوتا وہ ہمیشہ دماغ کا تابع ہوتا ہے

۔اس بات کا بڑی خوبصورتی سے شاعر نے ''ابھی تو میں جوان ہ وں'' کا غنایہ لکھ کر اظہار کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کشمیر میں عسکریت سے متعلق ابھی چار دہائیوں کے بعد جب حالات اور واقعات کی گرد بیٹھ جائے اور ماحول کچھ مصنفا ہو۔ اس موضوع پر قلم اُٹھانا چاہیے ورنہ کوئی بھی تحریر نمایاں ابہام کی شکار ہوسکتی ہے۔ اور غلط نقوش تراش ہوسکتے ہیں۔ اسلئے میں اختصار سے صرف چند باتیں ضمیمہ کے طور پر پیش کروں گا تاکہ اس کتاب کو خوشگوار طریقہ سے انجام تک پہنچایا جاسکے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آئی ایس آئی کے ایماء پر جماعت اسلامی پاکستان نے جماعت اسلامی کشمیر کی سوچ پر اثر انداز ہونا شروع کیا۔ بقولِ بے نظیر بھٹو مرحومہ جماوعت اسلامی پاکستان اور پاکستان کی فوج رشتہ ازدواج میں منسلک ہوچکے تھے ۔نظام مصطفیٰ کے نام پر فوج نے افغانستان کے جہاد کو منظم کیا۔ طالبان کی حمایت کی اور ضیاالحق نے پاکستان میں نظام مصطفیٰ قائم کرنے کا اعلان کیا۔ حتیٰ کہ ضیاالحق نے سنت نبی برحق کی تائید میں کبھی ریش مبارک سے اپنے رُخ کو نہیں کیا۔ اس طرح وہ جناح صاحب اور ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کی صف میں کھڑے ہوگئے تھے۔ اب سعودی عرب پاکستان کی جماعت اسلامی کی کُھلم کُھلا اعانت کر رہا تھا۔ بے نظیر بھٹو صاحب نے تحریر کیا ہے کہ جماعت اسلامی کو حوصلہ بخشنے کے لئے سعودی عرب ایک سمندری جہاز میں مولانا مودودی مرحوم کی کتابیں خرید کر لاتا تھا اور باقاعدگی کے ساتھ ان کتابوں کو بحیرہ عرب کی لہروں کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ بے نظیر بھٹو صاحب کی اہمیت یہ ہے کہ وہ عام خاتون نہیں تھیں وہ پاکستان کی وزیر اعظم رہ چکی تھیں اور آج تک سعودی عرب کی حکومت نے اُن کے بیان کی تردید نہیں کی ہے۔ اس طرح ایک طرف جماعت اسلامی پاکستان کے زیر اثر جماعت اسلامی کشمیری جوانوں کو منظم کر

رہی تھی دوسری طرف آئی آیس آئی امان اللہ خان کی جماعت جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ کی اعانت کر رہی تھی تا کہ کشمیری قومیت کے نام پر نوجوانوں کو آزادی کی تحریک کی ترغیب دی جائے۔اس لئے دو نظریات میدان عمل میں سرگرم تھے۔

جماعت اسلامی جو کشمیر میں جہاد کے نام پر لوگوں کی حمایت حاصل کر رہی تھی اور جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ جو تحریک آزادی کے نام پر نوجوانوں کی ہمدردیاں حاصل کر رہا تھا۔ ہندوستان افغانستان میں اب پشتونوں کے خلاف شمالی افغانستان کے تاجک، ازبک اور ہزارا کے نسلی گٹھ جوڑ کا ساتھ دے رہا تھا۔ جو افغانستان میں پشتونوں کا حریف تھا۔ یہ ہندوستان کی فاش غلطی تھی چونکہ اب پشتون کشمیر کی گھاٹیوں میں ہندوستان کے لئے ایک تیسرا محاذ قائم کرنا چاہتے تھے ۔ اور کشمیر میں عوام ہندوستان سے متنفر تھے۔ چونکہ ہندوستان نے کشمیر کو اپنی جاگیر سمجھ رکھا تھا اور اختر الایمان کی زبان میں کشمیری ہندوستان سے کہہ رہے تھے کہ 1987 کے انتخابات نے کشمیر میں ہمیں بتایا ہے:

[ہمارے لئے کھوکھلا لفظ جمہوریت ہے، تقاریر ہیں لیڈر کی' ہمارے لئے روزناموں کے صفحات ہیں۔ اشتہارات ہیں، نیم جنسی ہمارے لئے دیوتاؤں کے بُت ہیں۔خدا کے فرامین ہیں اور غلطی جو بدرنگ ہے حال کی طرح اور گورے لٹھے کی کوسے بھری ہے۔ ہمارے لئے صرف روٹی کی جدوجہد ہے۔

عورتوں کے برہنہ بدن کی تمنا سے آگے کچھ بھی نہیں۔ ہماری رگوں میں جو شراب ہے اس کی شدت کبھی کم نہ ہوگی] اور واقعی کشمیریوں کی رگوں میں ہندوستان کی نفرت کا تیزاب دوڑ رہا تھا۔گردش کر رہا تھا اور اب کشمیری کیا چاہتے تھے:

جو دی تھی تم نے اذیت وہ میں نے لوٹا دی

اوراس طرح کشمیر میں لبریشن فرنٹ کے نام پر جدو جہد آزادی کا آغاز ہوا گلیوں میں، چوراہوں پر، کھلیانوں میں، کھیتوں میں، مساجد کے میناروں سے ایک ہی آواز گونج رہی تھی ''ہم کیا چاہتے آزادی اور آزادی کے نعروں کی گونج نے ہندوستان کے چین کو خاشاک کی طرح پھونک ڈالا تھا۔ کشمیر ایک ایسا شمشان گھاٹ بن چکا تھا جہاں کشمیر ''بھارت کا اٹوٹ انگ ہے کی چتا جل رہی تھی۔ ہندوستان کے لئے صرف ایک ہی تصور باقی رہ گیا تھا کہ وہ اب روس کے بجائے امریکہ کا ساتھ دے۔ جو اسلامی ممالک کی بیداری سے اس لئے خوفزدہ ہوگیا تھا کہ اسے اسرائیل کا وجود خطرے میں نظر آرہا تھا۔ اس لئے ہندوستان اور اسرائیل اب حلیف بن چکے تھے۔ ضیاالحق اب اسامہ بن لادن کی القاعدہ کی سوچ سے پیمان وفا باندھ رہے تھے۔ اس لئے 1987 کے انتخابات کے بعد اور ابھی کشمیر اپنی جنگ آزادی کا اعلان کرنے ہی والا تھا امریکہ، ہندوستان اور اسرائیل سمجھ رہے تھے کہ ضیاالحق کو ایک ہی طریقہ سے خاموش کیا جاسکتا ہے وہ ہے ضیاالحق کا کسی حادثہ میں ہلاک ہونا۔ اور حالات کی ستم ظریفی دیکھیئے یہ حادثہ ہو ہی گیا اور ضیاالحق کا جہاز جب گرا تو اس میں اس کے ہمراہ رابن رافل کا شوہر پاکستان میں امریکہ کا سفیر بھی ہمراہ تھا۔ رابن رافل دلی میں امریکہ کے سفارتخانے میں تعینات تھا۔ یہ ہیں اتفاقات زمانے کے؟ یہ 17 اگست 1988 کا واقعہ ہے۔ ضیاالحق کا جہاز بہاولپور کے پاس گرا تھا۔ بقولِ پرویز مشرف:

''اس حادثہ کی وجوہات مشکوک وشبہات (Mystery) میں کفنائی ہوئی ہیں چونکہ اس حادثہ کے تحقیق کنندگان کو کچھ ذُرات پوٹاشم، کلورین، انٹی منی اور فاسفورس دستیاب ہوئے تھے اور اس لئے تحقیق کنندگان کی رائے میں درون خانہ سازش اس حادثہ کی وجہ ہوسکتی تھی'' یہ بیان جنرل پرویز مشرف نے بطورِ صدر پاکستان

دیا اور پرویز مشرف کے مطابق نامعلوم وجوہات کی بناء پر اس معاملہ کی تحقیقات کرنا ہی مناسب نہ سمجھا گیا تھا۔ صدر ضیاالحق کی موت کی خبر سنتے ہی شہرِ سرینگر میں سخت احتجاج ہوا۔ سرینگر نعروں کی آگ میں جل رہا تھا۔ سنگ بازی ایک طوفان کی شکل اختیار کر گئی اور اس روز سے ہی کشمیر میں ہندوستان کے خلاف احتجاج کی مہم کا آغاز ہوا۔ حتیٰ کہ 31 جولائی 1988 کو پہلی بار سینٹرل ٹیلی گراف کے باہر گالف کلب سرینگر کے باہر دو دھماکے ہوئے تھے جو شہر سرینگر (205) میں جے کے ایل ایف کی سرگرمیوں کا اعلان تھے، اور پھر نومبر 1988 میں بے نظیر بھٹو صاحبہ نے مخلوف سرکار بنائی تھی۔ لیکن پاکستان میں ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ نومبر 1988 اور اکتوبر 1999 کے درمیان پرویز مشرف کے بیان کے مطابق کسی بھی اسمبلی نے کسی بھی صوبہ میں اپنا مقررہ وقت پورا نہیں کیا تھا۔ وزیر اعظم کے عہدہ میں چار بار تبدیلی ہوئی اور تین بار صدر پاکستان تبدیل ہوئے تھے۔ ان حالات میں جب پاکستان میں سیاسی غیر یقینی حالات عروج پر تھے کشمیر میں آئی ایس آئی ملی ٹنسی کی اعانت کر رہی تھی یہ ہندوستان کی خوش قسمتی کا روشن باب تھا اور انہی گیارہ سالوں میں یہ عجیب اتفاق ہے کہ پاکستان کی افواج کے چار سربراہ بدلے گئے، فوج اور سول انتظامیہ میں اختلافات منظر پر آئے تھے اور سول انتظامیہ میں وزیر اعظم اور صدر کے درمیان بھی اختلافات کا ایک دور شروع ہوا تھا اور سوال یہ تھا کہ کیسے اس سیاسی بے یقینی کو ختم کیا جائے اور پاکستان میں سیاست کو نظام اور تسلسل عطا کیا جائے۔ کشمیری پاکستان کے سیاسی حالات سے بے خبر آئی ایس آئی کے مرتب کئے ہوئے خطوط پر اُنہی گیارہ برسوں میں نذر لہو دے رہی ہے حیات کے ماحول میں آس لگائے بیٹھے تھے کہ پاکستان کی افواج اُن کی امداد کو آئے گی۔ جیسے بنگلہ دیش میں جب بنگالی تحریک کو ک

فوجی طور پر کچل دیا تھا تو ہندوستانی افواج مکتی باہنی بن کر پاکستان کی افواج کے ساتھ برسرِ پیکار ہوئی تھی لیکن پاکستان کی اندرونی غیر یقینی نے یہ Option پاکستان سے چھین لیا تھا۔ پاکستان کی اندرونی سیاسی غیر یقینی کا تعلق افغانستان کے جہاد سے تھا۔ پاکستان سیاسی غیر یقینی کے حالات میں نئے مارشل لا کی طرف رواں تھا۔ اس لئے میں اختصار سے افغانستان کے حالات کی طرف اشارہ کروں گا تاکہ کشمیر کے حالات سمجھ میں آسکیں۔ چونکہ ایران میں اسلامی انقلاب آچکا تھا اس لئے سویت روس کے خلاف افغان مجاہدین کو امداد صرف پاکستان کے ذریعہ بہم کی جاسکتی تھی۔ ایران امریکہ کی رقابت شروع ہو چکی تھی اور امریکہ کے پاس پاکستان سے مفاہمت کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ یہ بات غور فکر چاہتی ہے کہ پاکستان امریکہ سے مفاہمت کرنے کے لئے مجبور تھا چونکہ ہندوستان اور روس کھلم کھلا بلوچ علیحدگی پسندوں کی امداد کر رہے تھے اور کھلم کھلا بلوچستان اور سرحد میں عوامی نیشنل پارٹی کی حمایت کر رہے تھے ۔ جو پٹھان اور بلوچ قومیت کی دعویٰ دار تھی۔ اس لئے ان خطروں کا مقابلہ کرنے کا واحد راستہ اسلام کے نام پر جہاد کے نام پر افغانوں کو منظّم کرنا تھا۔ ورنہ خدشہ تھا کہ ہندوستان اور سویت روس کی امداد سے عوامی نیشنل پارٹی صوبہ سرحد اور بلوچستان میں پاکستان سے علیحدہ ہونے کے واسطے ایک اسلحہ بردار تحریک کا آغاز کرنے میں کامیاب ہو اس طرح اور پاکستان کے ٹکرے ٹکرے ہو جاتے ۔ اس لئے ان ہی برسوں میں طالبان کو صوبۂ سرحد میں اسلامی نظام قائم کرنے کے نام پر منظّم کیا گیا اور اس طرح اسلام آباد نے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں علیٰحدگی پسند قومیت کے رجحان جو بلوچستان اور صوبہ سرحد میں ایک نئے فتنہ کا آغاز کر رہے تھے کو مکمل طور پر شکست دے دی تھی۔ عوامی نیشنل پارٹی کھلم کھلا سویت روس اور ہندوستان کی طرف مائل تھی۔ طالبان ایک

نیا تصور نہیں تھا۔ جنگ عظیم دوم میں بالکل اسی طرح جرمنی کے خلاف فرانس کے عوام نے احتجاجی تحریک چلائی تھی اور پھر جب روس نے مشرقی یورپ پر غلبہ حاصل کیا تھا تو ناروے میں احتجاجی تحریک چلی تھی اور یورپ کے کچھ اور ممالک نے بھی ایسی احتجاجی تحریکوں کو جنم دیا تھا اور اس لئے امریکہ کی پالیسی یہ تھی کہ افغانی احتجاجی تحریکوں کو معاشی اور فوجی امداد دی جائے تاکہ روس پر اتنا معاشی بوجھ ڈالا جائے کہ وہ افغانستان میں اپنی شکست قبول کرے۔ امریکہ کی خوش نصیبی تھی کہ ضیا الحق صدر پاکستان تھے اور وہ جماعت اسلامی کے زبردست حامی تھے اور اب امریکہ کے اس ایجنڈا کو جماعت اسلامی پاکستان کامیابی سے عملا رہی تھی۔ اغلب ہے کہ آئی ایس آئی کے ایماء پر جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ نے 31 جولائی 1988 کو اپنی جدو جہد کا آغاز کیا۔ لیکن اب اس وقت سے ہی جماعتِ اسلامی پاکستان نے جماعت اسلامی کشمیر کے ساتھ روابط قائم کئے اور اب حزب المجاہدن کا قیام وجود میں لایا گیا اور انہیں اسلحہ فراہم کیا گیا تھا۔ اور سال 1994 تک حزب المجاہدین نے جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ کو پس پشت ڈال دیا اور کشمیری قومیت کے بجائے نظامِ مصطفیٰ کے نام پر کشمیر میں ہندوستان کے خلاف جدو جہد کی قیادت سنبھال لی تھی۔ اسی طرح افغانستان سے روس کے انخلاء پر اب طالبان نے افغانستان پر غلبہ حاصل کیا تھا اور قومیت کے نام پر جو افغان جماعتیں سرگرم تھیں اُن کا مکمل خاتمہ کر دیا تھا اور طالبان اور القاعدہ کے ہاتھوں میں افغانستان کی تقدیر تھی۔ القاعدہ کا آغاز 1980 میں ہوا تھا اور 1988 تک اسامہ بن لادن ایک اہم سیاسی طاقت بن کر اُبھرا تھا اور تمام عرب ممالک میں اپنا اثر و رسوخ قائم کر چکا تھا اور اب یہ افریقہ کے ساحل علاقے میں خاص طور پر ایک اثر انداز ہو رہا ہے۔ القاعدہ امریکہ کے مخالف عرب ممالک میں

ایک تحریک بن چکا تھا۔اس لئے اسامہ بن لادن نے طالبان کے ملا عمر کی دختر سے ازدواج کر کے طالبان اور القاعدہ کی سیاست کو ایک موڑ دیدیا تھا اور اس طرح مئی 1996 سے اسامہ بن لادن جلال آباد میں خود رہائش پذیر تھا۔ 1998 میں القاعدہ نے کینیا اور تن زانیہ میں امریکی تنصیبات پر دھماکے کرا کے امریکہ کو طالبان کے خلاف منظم کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مُلا عمر کے کہنے کے مطابق ہندوستان اور ایران اب افغانستان میں شمالی اتحاد Northern Alliance کی حمایت کر رہے تھے۔ چونکہ طالبان ایران کے خلاف تھے وجہ یہ تھی کہ ایران اہلِ تشیعہ ملک تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر میں تحریک اپنے عروج پر تھی۔لیکن اب امریکہ کی اعانت سے فیصلہ کیا گیا کہ کشمیری قومیت کو پھر سے اُبھرنے کا موقع فراہم کیا جائے اور کشمیر میں 1996 میں انتخابات کروا کر نیشنل کانفرنس کی حکومت ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی سربراہی میں قائم کی گئی تھی۔ اور اسی دوران 1998 میں ہندوستان نے اعلان کیا کہ سیاچین کے علاقے میں اس نے پاکستان کے دو حملے پسپا کئے تھے۔اس وقت پاکستان میں نواز شریف وزیر اعظم تھے اور اب کشمیری مجاہدین کی باضابطہ جھڑپیں ہندوستان سیکورٹی ایجنسیوں سے ہو رہی تھیں اور ہندوستان اب کشمیر میں پاکستان کی آئی ایس آئی کی توجہ ہٹانے کے لئے شمالی سرحدی علاقوں پر یعنی شکما سیکٹر Shaqma Sector پر فوری طور فوجی کاروائی فضائیہ کی امداد سے کرنا چاہتا تھا اور اب کشمیر اور پاکستان کی سرحد پر ہندوستانی فوج نیلم وادی پر برابر توپوں سے گولہ باری کر رہی تھی۔ اور اس لئے جنرل پرویز مشرف نے کرگل سیکٹر میں تمام دروں پر فوجی تعینات کر دی تھی اور اس طرح 2 مئی 1999 کو کرگل میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک مختصر جنگ کا آغاز ہوا تھا۔ دراصل 28 مئی 1998 کو پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کر کے ایک

ایٹمی طاقت ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان
کے درمیان جنگ ممکن ہی نہ تھی اس لئے جنرل پرویز مشرف نے ہندوستان کو کرگل
میں کوئی قدم اُٹھانے سے پہلے کرگل میں 28 میل تک کے علاقے میں نئی
چوکیاں قائم کر لیں تھیں ۔اور اس طرح کرگل جنگ کا آغاز ہوا تھا۔لیکن اب امریکہ
ہندوستان کی امداد کر رہا تھا چونکہ پاکستان ایک ایٹمی طاقت بن چُکا تھا اور امریکہ چاہتا
تھا کہ نواز شریف حکومت پر جماعت اسلامی کا غلبہ ختم کیا جائے ۔ اس
لئے 4 فروری 1999 کو صدر بل کلنٹن نے نواز شریف کو امریکہ بلا کر جنگ بندی کا
اعلان کر دیا تھا۔اب پاکستان کی فوج نواز شریف کی حکومت کے برخلاف منظّم ہو چکی
تھی ۔چونکہ کرگل میں پاکستان کی فوج کی مرضی کے برخلاف جنگ بندی کا اعلان کیا
گیا تھا۔جنرل پرویز مشرف ایک دورہ پر سری لنکا گئے ہوئے تھے۔نواز شریف نے
اُنہیں برطرف کرنے کا اعلان کیا اور ایک نیا فوجی سربراہ مقرر کرنا چاہا جو اُن کا حامی تھا
۔12 اکتوبر 1999 جو جب جنرل پرویز مشرف سری لنکا سے واپس کراچی آرہے
تھے تو کراچی کے ہوائی اڈے کو بند کر دیا گیا۔لیکن جنرل پرویز مشرف نے تفصیلات
دی ہیں کہ فوج نے اُن کے طیارہ کو جب صرف پانچ منٹ کا ایندھن باقی رہا تھا فوجی
اڈہ پر اتار دیا اور نواز شریف کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور پرویز مشرف برسرِ اقتدار
آگئے تھے۔اس سب کا تعلق کشمیر کے واقعات سے ہے۔چونکہ نواز شریف کے زمانے
میں جماعت اسلامی پاکستان اور کچھ مجاہدین کی سرگرم تنظیمیں کشمیر میں جہاد چلا رہی
تھیں ۔لیکن فوج کشمیر میں آئی ایس آئی کی اعانت سے دوبارہ کنٹرول حاصل کرنا
چاہتی تھی ۔ چونکہ اب امریکہ افغانستان میں طالبان کی حکومت کا خاتمہ چاہتا تھا اور
کشمیر میں مکمل آزادی کے بجائے اندرونی خودمختاری پر زور دے رہا تھا تا کہ جو کشمیر کا

علاقہ ہندوستان کے زیرِ قبضہ ہے وہ ہندوستان کے پاس رہے اور جو پاکستان کے زیرِ قبضہ ہے وہ پاکستان کے پاس رہے۔ اس لئے پاکستان جو نواز شریف کے دور میں دیوالیہ ہو گیا تھا اب پھر سے معاشی استحکام حاصل کر سکتا تھا۔ 1999 میں پاکستان کا مالی خسارہ 5 بلین ڈالر تک پہنچ چکا تھا۔ اس لئے لوگوں نے اور تجارتی حلقوں نے فوجی راج کا خیر مقدم کیا تھا۔ کشمیر میں مشرف کے برسرِ اقتدار آنے کا مطلب یہ تھا کہ فوج اب نہ تو جماعت اسلامی پاکستان اور نہ ہی جماعت اسلامی کشمیر کو کوئی اہمیت دے گی اور حزب المجاہدین کو صرف آئی ایس آئی کا ایجنڈا چلانا ہوگا۔ کشمیر میں اسلامی جہاد کے خاتمے کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ سچ ہے:

"کٹھ پتلیاں ہم سب ہیں<br>
اور فلک جادوگر<br>
کسی کو نہیں کسی کی خبر"

فلک کی جادوگری اب کٹھ پتلیوں کا نیا کھیل منظر عام پر لانے والی تھی اور پرانے حالات کو مسخ کر کے نیا ماحول قائم کرنے پر بضد تھی اور ان حالات کا مخفی اور ظاہر سمجھنا بہت دشوار نظر آ رہا تھا۔ سعودی عرب کی حکومت طالبان سے 1998 سے مطالبہ کر رہی تھی کہ اسامہ بن لادن کو سعودی عرب کے حوالے کر دیا جائے اور 1998 میں سعودی عرب کے وزیر خارجہ اور پاکستان کی آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل اس سلسلے میں خود مُلا عمر سے ملے تھے اور ملا عُمر نے ان کے مطالبہ کو ٹھکرا دیا تھا۔ پھر ستمبر گیارہ 2001 کا دن آیا کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر القاعدہ نے حملہ کر کے ساری دنیا کو چونکا دیا۔ سارے امریکہ کی رائے عامہ میں ایک خوفناک بھونچال آیا تھا اور پرویز مشرف کی زبان میں دُنیا پہلے جیسی نہ رہے گی اور نہ تھی" اور پرویز مشرف نے

24 گھنٹوں کے اندر اندر امریکہ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ یہ انتہائی دانش مندانہ قدم تھا ورنہ اگلے اڑتالیس گھنٹوں کے اندر اندر ہندوستان اور اسرائیل پاکستان پر امریکہ کے مدد سے حملہ کرنے کی ٹھان رہے تھے۔ پرویز مشرف نے فیصلہ کر کے پاکستان کو تباہی سے بچالیا تھا اور یہ ہندوستان کی دوسری سیاسی شکست فاش تھی چونکہ اب کشمیر کے معاملے میں کچھ دیر کے لئے امریکہ عملی مداخلت کرنے سے گریز کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب پاکستان پھر سے طالبان کے خلاف جنگ جاری رکھنے میں امریکہ کا معاون ثابت ہوگا اور اس طرح پاکستان کی فوجی حکومت اسلام کے نام پر جہاد کی حمایت نہیں کرے گی۔ بلکہ پاکستان میں فوجی انقلاب انہی وجوہات کی بنا پر آیا تھا اور 11 ستمبر 2011 سے بہت قبل جنرل پرویز مشرف نے فروری 2001 میں کئی مذہبی تنظیموں پر پابندی عائد کر دی تھی چونکہ مذہبی تنظیمیں اب پاکستان میں فرقہ ورانہ فسادات میں ملوث تھیں۔ جنرل ضیا الحق کے دور میں چوٹی کے 64 اہلِ تشیعہ افسران اور علما کو سرِ عام قتل کر دیا گیا تھا اور نواز شریف کے دور میں بھی شیعہ مخالف تنظیموں کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ حتیٰ کہ پاکستان کی ایک تہائی آبادی یا تو اہلِ تشیعہ ہے یا اُن کی ہمدرد اور کشمیر کے شمالی صوبہ جات میں اکثریت اہلِ تشیعہ کی ہے اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ 1947 سے لے کر آج تک کسی اہلِ تشیعہ نے نہ وعلیحدگی پسندوں کا ساتھ دیا ہے اور نہ ہی پاکستان کی سالمیت کے خلاف کوئی قدم اُٹھایا ہے۔ بلکہ اہلِ تشیعہ رائے عامہ نے ہمیشہ پاکستان اور ایران کی مفاہمت کا ساتھ دیا ہے تاکہ پاکستان، ایران اور ترکی ایک محوری طاقت بن کر اُبھر سکتے تھے۔ لیکن یہ خواب اس لئے تشنہ تکمیل رہا چونکہ اہلِ تشیعہ فرقے کے خلاف فرقہ دارنہ نفرت کی دیواریں کھڑی کی گئیں تھیں ورنہ پاکستان، ایشیاء کا جرمنی ثابت ہوتا اور معاشی طاقت بن جاتا اور

کشمیر میں پاکستان کی معاشی خوشحالی کی اُمیدوں کی نئی دُنیا روشن ہوتی ۔ ہندوستان صرف کشمیر میں پاکستان کی معاشی بدحالی سے کشمیری عوام کو خایف کر کے اپنا قبضہ قائم رکھ سکا ہے۔ پاکستان میں شیعہ سُنی اختلافات نے ہندوستان کو بہت ہی زیادہ فائدہ پہنچا ہے۔لیکن پاکستان کی تاریخ میں شیعہ سُنی اختلافات ایک حادثہ نہیں ایک سانحہ ہیں اور ایران اور پاکستان کی سیاست کا اثر کافی حد تک کشمیر کے واقعات پر اپنی چھایا ڈال چکا ہے۔ اس لئے آج بھی کشمیریوں کی منزل دور دکھائی پڑتی ہے۔ مجھے اختر الایمان کے الفاظ سنائی دیتے ہیں:

ٹھہر ٹھہر دل مضطر یہ ننگ دنام نہ کھو
جنون شوق کا کم بخت احترام نہ کھو
ہزار لالہ وگل سنگ راہ بن جائیں
ہزار پاؤں مسافت کے بار سے ہو چور
ابھی نہیں ابھی منزل ہزار کوس ہے دور!

پاکستان نے ایران سے دوری رکھ کر کشمیر کے معاملے کو طوالت میں ڈال دیا ہے۔ ہندوستان آج بھی ایران کے تیل کا محتاج ہے، ایران اور پاکستان کی مفاہمت کی روایتیں مغل شاہ ظہیر الدین بابر کے زمانے سے قدروں، اصولوں اور ضابطوں کی بناء پر استوار کی گئیں تھیں لیکن ہم نے ہندوستان میں جس اسلام کو رائج کیا اس کا مُدعا صرف یہ ہوا:

" قرآن کی آیتوں کے ساتھ ارواح اب وجد کو
خمیری روٹیوں اور قورمے کے ساتھ رخصت کر دیا ہم نے
خدا بھی خوش ہوا ہو گا کہ زیبائے جہاں خوش ہیں

عمل سے اپنے مُنہ کھولے تھا دوزخ بھر دیا ہم نے!''

اور کشمیر کا المیہ یہ ہے کہ کشمیری ذہن بہت رتخبل ہے۔ پاکستان کی آئی ایس آئی اور کشمیر کا المیہ یہ ہے کہ کشمیر کی جنگ آزادی کی تحریک، کشمیری زبان بولنے والوں کی قومیت کی تحریک بن رہی ہے۔ اس لئے آئی ایس آئی نے فیصلہ کیا کہ آزادی کی تحریک کو اب جموں خطے کی جانب موڑ دینا چاہیے۔ خود الیاس کشمیری کا تعلق اس خطہ سے تھا اور حافظ سعید کا ذہنی رجحان بھی اس خطے سے تھا اور اس طرح اب پونچھ اور راجوی اس تحریک کو قائم رکھنے کے لئے استعمال ہیں۔ لیکن اس حکمت عملی کی روبہ عمل لانے میں پاکستان نے بہت دیری کردی تھی ۔ چونکہ 11 ستمبر 2001 کے بعد ہندوستان کو یقین ہوگیا کہ پاکستان کی حکومت امریکہ کی افغانستان کی جنگ میں حلیف بن چکی ہے اور حکومت پاکستان کو اب امریکہ کی جنگ افغانستان میں لڑنا ہوگی جس کا پہلا نتیجہ حکومتِ پاکستان کی افواج اور طالبان اور دیگر مسلح تنظیموں کے تصادم میں ظاہر ہوگا اس لئے کشمیر میں پرویز مشرف اب حزب المجاہدین کی کوئی امداد کرنے کے قابل ہی نہ رہیں گے۔ جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ 1994 میں نئی جنگ بندی کا اعلان کرکے ایک سیاسی جماعت بن چکی تھی۔ اس لئے 1996 میں نیشنل کانفرنس کی حکومت اندرونی خودمختاری کے نعرہ کی آڑ میں انتخابات کے ذریعہ قائم کی گئی تھی۔ اب صدر پرویز مشرف اور جماعت اسلامی پاکستان جو کشمیر کی سیاست پر اثر انداز ہو رہی تھی کے راستے جدا جدا ہو گئے تھے۔ افغانستان میں حامد کرزائی کی حکومت قائم ہو چلی تھی جو ہندوستان کی دوستی کو اس لئے اہم سمجھتا تھا کہ پاکستان کا تمام اثر و رسوخ افغانستان میں صرف سرد آگ بن جائے۔ آئی ایس آئی کی بدقسمتی یہ ہے کہ کشمیر میں تحریک آزادی چلانے کے لئے اُس نے جن لوگوں کو ترغیب دی تھی اُن میں سے چند

لوگوں نے اس تاریخ کو بازیچہ اطفال بنا دیا تھا۔ چند ایسے شوریدہ ارادوں کو صرف جماعت اسلامی پاکستان کے ایجنڈا کا جزو سمجھتے تھے اور جو باقی تھے وہ خطے کی سیاست سے نابلد تھے۔ ان کا۔ تصور یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ پاکستان اور ایران کی باہمی مفاہمت کن بنیادوں پر قائم ہوئی تھی ؟ اور اب پاکستان اور سعودی عرب میں کن باتوں پر اشتراک قائم ہے۔ القاعدہ جو 1980 میں وجود میں آیا تھا۔ اس کے پاکستان کے ساتھ کون سے روابط تھے؟ اور القاعدہ اور سعودی عرب کی حکومت کے درمیان تفادات کی بنیاد کیا تھی؟ ایران اور عراق کی جنگ کی اثرات پاکستان پر کتنے اثر انداز ہو رہے تھے؟ لیبیا، ایران اور شام کی سیاست کیوں روس کی قربت حاصل کر رہی تھی ؟ اور القاعدہ اور طالبان مشترکہ جہاد لڑ رہے تھے۔ اس کے اثرات پاکسان پر اثر انداز ہو سکتے ہیں اور اثر انداز ہوئے اور 11 ستمبر 2011 کے بعد کشمیر اور پاکستان کے حالات پر امریکہ کیسے اثر انداز ہو رہا ہے؟ اُن کا بے سود تخیل یہ سمجھنے سے عاری تھا کہ اب پاکستان کو پاکستان کے اندر ان ہی عسکری تنظیموں سے برسرِ پیکار ہونا ہوگا؟ خاص طور پر ان لوگوں کو کوئی اندازہ نہ تھا کہ روس افغانستان میں اس لئے جنگ ہارا تھا چونکہ طالبان وزیرستان میں پناہ لے کر افغانستان میں روسی گوریلا جنگ میں مصروف رکھ سکتے تھے جس نے روس کی معیشت کو تباہ و برباد کر دیا تھا اور تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اب حقانی نٹ ورک نے اسی وزیرستان میں پناہ لے کر امریکہ کے خلاف ایک ایسی جنگ لڑی ہے کہ اب امریکہ کی معیشت بھی تباہ ہو رہی ہے اور اُبامہ سرکار اپنی ناکامی کو صفحات تاریخ پر رقم ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ اور امریکہ چاہتا ہے کہ وزیرستان میں پاکستان کی افواج حقانی نیٹ ورک کے خلاف نئی جنگ شروع کرے۔ لیکن پاکستان کی افواج حقانی نیٹ ورک سے مفاہمت کر کے پاکستان کی سالمیت کو

محفوظ بنا سکتی ہے اور کشمیر کے ان رہنماؤں کو معلوم ہی نہیں کہ حقانی نیٹ ورک کا کشمیر کی تحریک آزادی کے متعلق کیا رویہ ہے؟ اور وہ کون سا رُخ اختیار کر سکتا ہے؟ اور پاکستان کی موجودہ سیاست کون سا نیا عنوان بدل رہی ہے ؟ اس لئے 11 ستمبر 2001 کے بعد ہندوستان نے اطمینان کا سانس لیا اور اب وہ پاکستان کو کشمیر حل کرنے کی دعوت دے رہا ہے تاکہ بل کلنٹن کے اس منصوبہ پر عمل کیا جائے کہ جو حصہ کشمیر کا ہندوستان کے پاس ہے وہ ہندوستان کا اٹوٹ انگ بن کر رہے اور جو حصہ پاکستان کے زیر قبضہ ہے وہ پاکستان کا حصہ بن کر رہے اور پھر ہندوستان، پاکستان دونوں تجارت اور بازار کی سیاست کے تحت ایک دوسرے کے حلیف اس لئے بن سکیں تاکہ ہندوستان سارک ممالک کا سربراہ بن کر اُن کی سیاست پر چھا کر چین کے خلاف ایک نیا رقیب ثابت ہو۔ یہ ہے نئی امریکہ سیاست کا غیر مشروط اور غیر مشکوک ہدف۔ اس لئے 11 ستمبر 2001 کے بعد کشمیر کی تاریخ آزادی نے بہ چشم خود دیکھا:

پھر وہی فردا کی باہیں پھر وہی میٹھے سراب
پھر وہی بیدار آنکھیں پھر وہی بیدار خواب
پھر وہی وارفتگی تنہائی افسانوں کا کھیل
پھر وہی سرگوشیاں وہ دیوانوں کا کھیل
پھر وہی رخسار وہ آغوش وہ زلفیں سیاہ
زندگی کی بے بسی اُف ''وقت کے تاریک جال''
درد بھی چھننے لگا امید بھی چھننے لگی
مجھ سے میری آرزوِ دیدہ بھی چھننے لگی

پھر وہ تاریک ماضی، پھر وہی بے کیف حال!

اور میرا اپنا نقطہ نظر کشمیر کی تاریخ آزادی کے متعلق یہ ہے کہ یہ تیز ہواؤں کی طرح آئی اور سر سے گزر گئی۔ میں اس کتاب کا اختتام اپنے کہے ہوئے قطعہ پر کروں گا:

طوفان بلاخیز کے دامن میں پلا ہوں

اک زخم کہن ہوں سل نہیں سکتا

ہاں تیری ہواؤں کا مقدر نہیں ہوتا

تم ڈھونڈنا چاہو میں مل نہیں سکتا

اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ کچھ برسوں میں نئی نسل کشمیر میں طوفان نہیں قیامت برپا کرے گی۔ عین ممکن ہے ہمیں پچاس سال صبر کرنا ہو لیکن قوموں کی تاریخ میں پچاس سال ایک ساعقہ برُدوش ساعت ہوتی ہے اور اس وقت کے لوگ نئی نسل سے کہہ سکیں گے:

ہے یہ وہ روزِ قیامت، مبارک ہو تمہیں

جہاں تک ہمارا تعلق ہے:

ہم تو خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے!

اور کشمیر جنوبی ایشیاء میں اب ایک نیا میدانِ جنگ بن سکتا ہے۔

☆☆☆

# حرفِ اوّل

مزاجِ بندگیٔ عصرِ نو کی تجھ کو قسم

نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

(جوشؔ)

شاعر وقت کی آواز ہوا کرتا ہے۔ نئے مزاج کے پروردگار کا نعرہ شاعرانہ تعلّی ہی نہیں وقت کا تقاضا بھی ہے۔ آج کا انسان درسِ حیات کا ایک اہم سبب سیکھ رہا ہے کہ انسانیت، فرقہ، قبیلہ، قوم، نسل یا مُلک کی خیالی سرحدوں میں بٹ کر رہ نہیں سکتی۔ زندگی مائل بہ پرواز ہے، اُن رفعتوں پر جنھیں یہ دیواریں عبور نہیں کر سکیں۔ یہ بلندیاں شش جہت کی قید سے آزاد ہیں۔ نہ کوئی سمت ہے اور نہ کوئی فاصلہ! قوموں اور فرقوں کی قید ختم ہو چکی ہے۔ مذہب اور فرسودہ رسم و رواج کی بندشیں ٹوٹ چکی ہیں۔ یہ آدمیّت کی ہی نہیں، انسانیت کی بھی نہایت ارفع منزل ہے۔ کہ ہمارے بیشتر اصول آفاقیت کے تصور پر مبنی ہیں۔

ضرورت ہے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں ان قدروں کا ازسرِ نو جائزہ لیا جائے۔ یہاں پر ہم اس بات کی طرف توجہ دلائیں گے کہ آفاقی کردار کا جائزہ لیتے وقت حقیقت پسندی (Realism) اور آدرش پسندی (Ideolism) کے نظریۂ حیات کی محک پر ہی ان گراں مایہ اقدار کو پرکھا

جاسکتا ہے۔آج کل کے سائنسی استدلال کے مطابق حقیقت پسندی اور آدرش پسندی کے درمیان حدِ فاصل نہیں کھینچی جاسکتی ۔ یہ دونوں فلسفے ایک دوسرے سے منطبق نظر آتے ہیں۔دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔

حقیقت پسندی دراصل آدرش پسندی کو جنم دیتی ہے۔حقیقت پسندی وہ ہے جس کا حقیقت میں وجود ہے اور جو وجود کو ہمارے قویٰ تسلیم کرتے ہیں اور آدرش پسندی وہ ہے جس کا وجود ہونا چاہیے۔رُوسی مُفکر پلیخنوف اپنی مختصر مگر دلچسپ کتاب ''آرٹ اور شوشیل لائف'' میں تاریخی مادیت اور فُنونِ لطیفہ کی بحث کرتے وقت اس غلطی کا شکار نظر آتا ہے کہ انسانی سماج نے صرف حقیقت پسندی کے نظریہ پر عمل کر کے ترقی کی ہے اور تاریخ بذاتِ خود اس فلسفہ کی عملی پہلو کی داستانِ طویل ہے۔

اس کے برعکس دوسرا طبقۂ خیال یہ ہے کہ انسانی سماج نے صرف آدرش پسندی کے فلسفہ کو اپنا کر ترقی کی ہے۔کارلائل تو بُت پرستی شیوۂ انسانیت قرار دیتا ہے اور اُس کی نگاہوں میں انسانیت کی تاریخ آدرش Idealism کے پروردہ ہے۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فِکر و ادراک کے یہ دونوں طبقے انتہا پسندی سے کام لے رہے ہیں۔ حقیقت پسندی کے ماننے والے آدرش کی اہمیت کو قطعاً نظر انداز کرتے ہیں اور آدرش پسند، حقیقت کی طرف وہ توجہ نہیں دیتے جو مطلوب ہے۔انسانی سماج اور تاریخ کا ارتقاء حقیقت اور آدرش دونوں کی مسلسل کاوش سعی کا نتیجہ ہے۔حقیقت نے آدرش کو جنم دیا ہے یوں کہیے کہ حقیقت اور آدرش میں کوئی تضاد نہیں۔دونوں فلسفۂ حیات ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔اس بحث سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل حقیقت کی اعلیٰ ترین شکل آدرش ہے۔جس وقت ہم اپنے آدرش کو پالیتے ہیں تو وہ آدرش، آدرش نہیں رہتا بلکہ حقیقت بن جاتا ہے اور پھر یہ نئی حقیقت ایک بالکل نئے آدرش کو جنم

دیتی ہے۔ یہ ارتقاء کے زینے کی مختلف کڑیاں ہیں جو آج ہمارے لئے آدرش ہے وہ آئندہ کی نسلوں کے لئے حقیقت ہوگا۔ جنھیں آج ہم حقیقت دیکھ رہے ہیں، زمانۂ قدیم کے یہی آدرش تھے۔

ہم نے آدرش اور حقائق دونوں کے سہارے بدلتی ہوئی قدروں کا جائزہ لیا ہے۔ ہمیں ایک ایسا سماج قائم کرنا ہے جو آفاقیت اور انسانی برادری کے عظیم اصولوں پر مبنی ہو۔ چونکہ انسانی اندازِ فکر کی تشکیل سماجی ماحول کرتا ہے اور سماجی تقاضے انسانی اندازِ فکر کے لئے مہمیز کا کام دیتے ہیں، ان اقدار کا جائزہ لینا اور بھی ضروری ہوگیا ہے، کیونکہ ان کی موزونیت اور وسعت پر ہی اس نئے آفاقی سماج کی بُنیادیں استوار کی جاسکتی ہیں۔

اس طویل موضوع پر یہ مختصر سا مقالہ ایک سعی لاحاصل ہی نہیں بلکہ مُصنف کو امید ہے کہ کتابچہ کے شائع ہونے کے بعد وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہوگا۔

ہے صحرا اب بھی صحرا اگر خونِ پا کا فیض
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

☆

# بابِ اوّل

انسانی تہذیب صدیوں کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ جُوں جُوں اُس کا دائرہ عمل وسیع ہوتا گیا، انسان کا نظریۂ زندگی، زندگی کے عظیم تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے زمانے کی روش کے مطابق تبدیل ہوتا گیا۔ یہی تجربات اُس کے شعور، اِدراک اور تخیل کو وُسعت بخشتے رہے ہیں۔ یہی وُسعت وہی تغیر یا انقلاب ہے، جس کے آستانے پر بقائے دوام صدیوں سے یا یُوں کہئے ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک سجدہ ریزی رہی ہے۔ انسانی شعور میں ایک نیا انقلاب آنے کے بعد انسان اور اُس کا رُوحانی ارتقاء ماورائیت کی حدوں سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ یہ فلسفہ اب تقویم پارینہ سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ نئے فلسفۂ حیات کے منطقی استدلال کے مطابق انسان کسی ماورائے کائنات سے وِجدان حاصل نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اُس کرہ ارض کے مناظر حیات آفریں وحُسن خیز اس کی نگاہ کو وسعت اور اس کے تخیل کو نکھار بخشتے ہیں اور اس طرح اس کے مطمحِ نظر کے دقیع سے دقیع تر ہونے کو مفکروں نے ارتقاء اور شاعر نے کوششِ ناتمام سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ایک مسلسل عمل کی کیفیت ہوتی ہے جس کی آخری منزل دورِ حاضر کے سائینسدان کی نظر میں وحدانیت کا وجود ہے۔ جس فلسفہ کو تراش کر ارتقاء کی یہ خواہش انسانی تسکین حاصل کرتی رہی ہے اور بقولِ ان کے یزداں کی بلندیوں کو انسان چھُو کر ہی دم لے گا۔ اس نفسیاتی توحید کے ساتھ ساتھ فلسفی یہ نکتۂ نگاہ بھی پیش کرتا ہے کہ خدا کے وجود سے بھی درحقیقت انکار نہیں کیا

جاسکتا ہے۔دراصل خدا کسی مادی شکل کا نام نہیں، وہ صفت کا نام ہے۔وہ طاقت اور مادہ دونوں کی شکل میں ظاہر ہے۔اس صفت کو نہ ہی پیدا کیا جاسکتا ہے اور نہ ضائع کیا جاسکتا ہے۔ مخصوص سائنسی اصطلاح میں ا، سے صِفت کی بقائے دوام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔یہ اشیا کے نمودِ ظاہری کی محرک ہے۔اسی صفت کی ایک شکل اگر طاقت ہے تو دوسرا روپ یا مادہ ہے۔طاقت کی معراج یہ ہے کہ وہ مادہ کی شکل میں مظہر ہو۔ اور مادہ کی انتہا یہ ہے کہ وہ طاقت کا روپ دھار لے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور رہیں گے۔یہی وجہ ہے کہ مادہ کے بغیر طاقت کا کوئی وجود نہیں یا یوں کہیے کہ مادہ کے ارتقاء میں طاقت کی قوتیں جلوہ افروز ہیں۔اسی ارتقاء کا ایک مظہر آفر منیش کا وجود ہے۔آفرنیش مادہ کے ارتقاء کی ایک شکل ہے۔

آفرنیش عناصر کے ظہور و ترتیب کا نتیجہ ہی سہی، لیکن عناصر میں ظہور ترتیب کویں ہوا؟ کیسے ہوا؟ چند ایسے بنیادی سوالات ہیں جن کے متعلق ہماری لاعلمیت مسلم ہے اور جن کے سامنے بادلِ ناخواستہ ابھی ہمیں اپنا سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔البتہ آفر نیش کے وجود میں آنے کے بعد اس کے طنطنہ و طمطراق اِس کی شوکت و تجمل، اس کی سیمابی فطرت اس کا اضطراب ماحول پر چھا جانے کی سعی یا دوسری صورت میں اپنے آپ کو ماحول کے مطابق بنانے کی کوشش ارتقا کا وہ زینہ ہے جس کے مختلف مدراج طے کر کے آفرنیش کے اولین غولوں جیسے حشرات الارض، استخوان شکستہ، دشت وصحرا کے قومی ہیکل اور دیو قامت حیوانات، خوبصورت اور خوشنما پرندوں اور فطرت کے سب سے زیادہ عظیم شاہکار، اشرف المخلوقات اور سرتاجِ عالم یعنی حضرتِ انسان کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔

زندگی نے یہ سفر ایک ہی جست میں طے نہیں کیا، اس کے لئے وہ وقت کی

دشوار گزار اور پُر خطر راہوں سے گزری ہے۔ دراصل زندگی کی کوئی منزل نہیں۔ وہ ہمیشہ سے سفر میں رہی ہے اور اپنی بقاء کے لئے اُسے ہمیشہ سفر میں رہنا ہوگا۔ زندگی کا ارتقاء اسی سے قائم ہے کہ وہ، خُوب سے خُوب تر اور مکمل سے مکمل تر ہوتی رہے۔ زندگی با قاعدہ متواتر اور مسلسل ترقی کر رہی ہے تا کہ اپنے آپ میں اور اپنے ماحول میں زیادہ سے زیادہ مماثلت قائم کرے۔ اس کے لئے اُسے اپنے داخلی ماحول اور سماج کو خارجی ماحول سے مطابق کرنا پڑا ہے، ماحول مسلسل تجربہ کرتا ہے اور وہ تجربات جن کے نتائج اس کے موافق ہوں، اُنھیں وہ قبول کرتا ہے اور ناموافق تجربات سے گُریز کرتا ہے۔ اگر اس زاویئے سے وہ ذرا بھی انحراف کرے تو وقت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ ماحول ملیا میٹ ہو جائے۔ ایسی صورت میں ماحول کے لئے صرف دو راستے رہتے ہیں:

(۱) ایک تو یہ کہ وہ اپنے آپ کو خود ترتیب دے، اُن عناصر کو جو تغیر سے اعکاف یا گوشہ نشینی اختیار کرنا چاہتے ہیں، حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔ اس حالت میں جو تغیر رُونما ہوتا ہے اُسے ہم انقلاب کہتے ہیں۔

(۲) دوم یہ ہے ماحول اُن عناصر کو جنہیں ہم رجعت پسند کہتے ہیں اور از سر نو اپنی تشکیل کا موقع دے تا کہ وہ خارجی ماحول کے عین مطابق ہو سکیں۔ ایسی صورت میں بھی تغیر ضرور رونما ہوتا ہے۔ لیکن ہم اسے محسوس نہیں کرتے۔

دونوں طرح کے انقلابات کا ماحصل ایک ہے، لیکن دونوں کا عمل جُداگانہ ہے۔ پہلی حالت میں تبدیلی اچانک رُونما ہوتی ہے۔ ہمیں ہمارے خوابِ گراں سے جھنجھوڑ دیتی ہے۔ وہ جو اس کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں اُنھیں آسیائے گردشِ ایام پیش کر رکھ دیتی ہے۔

دوسری صورت میں حالات کا تغیر اِتنا تیز کام نہیں ہوتا۔ تبدیلی جو رونما ہوتی ہے وہ ہمیں دھکے دیتی ہے، جھنجھوڑتی نہیں، ہم جاگتے ہیں، لیکن محسوس نہیں کرتے کہ کسی نے ہمیں جگایا ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا جاگنا عینِ فطری تھا۔ زندگی اب بھی سرگرمِ سفر ہے۔ وہ ایک بھی سامانِ سفر ٹھیک کرنے کی فکر میں ہے۔ وقت کے ساز ر زندگی اب بھی محوِ رقص ہے، نہ جانے یہ عمل کب سے جاری ہے اور کب تک جاری رہے گا۔

انسان سے پہلے جب بھی کسی ذی رُوح شے کو اس تغیر کا شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر سامنا کرنا پڑا ہے تو اُس نے صرف ایک ہی راستہ اختیار کیا وہ کہ وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنی تشکیل کی۔ ایسا کرنے میں اُس کی بقاء تھی اور اُس نے ایسا نہ کیا تو وقت نے اُسے مٹا دیا۔

انسان پر جب بھی اس آزمایش کا وقت گزرا ہے، انسان کی ہمیشہ سے یہ سعی رہی ہے کہ وہ ماحول پر چھا جائے۔ یہی تفاوت کی لکیر ہے۔ یہی باقیوں سے اُسے ممیّز کرتی ہے۔ ماحول پر چھا جانے کی خواہش، ماحول کی تسخیر ہمیشہ سے انسان کا اولین مقصد رہا ہے۔

سائینس، مذہب یا دیگر علوم، ادبِ عالیہ یا فنونِ لطیفہ اسی کا عطیہ ہیں۔ یہ جذبہ بہت ہی مقدس ہے۔ شروع شروع میں جب انسان وجود میں آیا تو اُس کی تمام تر کاوِش، اس کی تمام تر قوت، اُس کی تمام تر صلاحیت اس بار پر مرکوز ہوگی کہ وہ کیوں کر ماحول کے تقاضوں کو پورا کرے۔ کِس طرح سے وہ اپنے آپ کو ماحول کے عین مطابق بنائے۔ لیکن جس وقت اُس نے رہنے کا ڈھنگ سیکھا، ماحول سے کسی قدر شناسی حاصل کی تو اقبال کی زبان میں اُس کی نگاہ تیز......دل کے وجود کو چیرنے کی فکر

کرنے لگی۔

حقائق کا تیشہ اُٹھا کر وقت کے سنگلاخ کوہِ گراں سے ایک سازگار ماحول کی آبجو نِکال لیتا اُس کا دلچسپ ترین مشغلہ رہا ہوگا۔

پہلا زمانہ ماقبل تاریخ کا دور ہے، جس میں انسان نے ایک دوسرے کو سمجھنے کی سعی کی۔ لیکن دوسرا وہ جلیل القدر، عظیم الشان، تابناک دور ہے جس میں انسان نے اپنے ماحولکو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مذہب وعلوم فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ نے اسی دور میں جنم لیا ہے۔

اس کی شروع کی فتوحات پہیئے یا آگ پر قابو پالینا، یا غاروں میں مُبہم سے نقوش بنانا، آج ہماری نظروں میں اِن کی اہمیت کتنی بے معنی، مُہمل، لغو اور حقیر ہو، لیکن اُس زمانے میں اُس کی اہمیت کس قدر ہوگی، اس کا اندازہ ہم سبک نظری سے نہیں کرسکتے۔ اگر ہم ذرا اُس ماحول کا تصور کریں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ پہیہ یا آگ یا غاروں کے اُس مُبہم سے نقوش میں ایک پورا دور اور ایک پوری تہذیب دفن ہے!

انسانی تہذیب کے ارتقاء کو سمجھنے کے لئے ہم اُن واقعات کو جو بظاہر غیر ضروری اور حقیر ہیں، نظر انداز نہیں کرسکتے۔ یہ وہ سنگ میل ہیں، جن کے بغیر ماضی تو ماضی، حال درکنار، ہم اپنے مستقبل کے لئے بھی کوئی راہ متعین نہیں کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا کلچر اُن رسوم وروایات کو بھی اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے جو بظاہر کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود ہماری زندگی، ہماری تہذیب وتمدن کا بہت ہی اہم جُزو ہیں۔ ہم ان ہی رسوم وروایات کو اپنا آبائی اور قومی ورثہ سمجھتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں ہم ان پر فخر کرتے ہیں۔ ہماری تہذیب، ہمارا تمدن، ہمارا کلچر یہ سب ہمارے ماحول سے وابستہ رہے ہیں۔ یہی ہمیں پتہ دیتے ہیں کہ ماحول پر چھا جانے کی سعی انسان کا اولین

مقصد رہا ہے۔

شروع شروع میں جب انسان کو زندگی کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تو اس کی فکر اِن تشنہ تکمیل تقاضوں کی تشنگی مٹانے کے لئے حقائق کے چشمہ حیواں کی تلاش میں نکل پڑی۔ کوئی خضرِ خجستہ گام اس کا رہبر نہ تھا۔ کوشش ناتمام اس کے آگے بڑھنے کی محرک تھی۔ انسان نے ابھی اپنی منزلِ مقصود کو نہیں پایا ہے وہ اب بھی سرگرم سفر ہے۔ حقائق کو سمجھ لینا، حقائق کو پالینا، حقائق کی تلاش، صدائے جرس بن کر آج بھی اسے پیش قدمی کا پیغام دیتی ہے۔ یہ پیش قدمی فرد کے لئے ہی نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کیلئے دعوت ہے۔ کیوں کہ انسان ہر مشکل کا اجتماعی طور سامنا کرتا ہے۔ انسان اپنے ماحول میں یکسانیت پیدا کرتا آیا ہے اور اجتماعیت یکسانیت سے جنم لیتی ہے۔

ارتقاء کے عمل اور ردعمل کے دوران جب ماحول تبدیل ہوتا گیا تو عام طور پر آفرینش کی بقا اسی میں تھی کہ وہ اپنی تشکیل ماحول کے مطابق کرے۔ لیکن جیسا کہا جاچکا ہے، جس وقت زندگی کا عظیم معجزہ "انسان" کی صورت میں جلوہ گر ہوا، تو اس کی کوشش یہی رہی ہے کہ اپنے ماحول کی اپنے تقاضوں کے تحت صورت گری کرے۔ اس جادہ پیمائی میں زبان کی نشو ونما کے بعد اس کی پہلی منزل فنونِ لطیفہ کی ابتدا رہی۔ یہی وہ چیز ہے جس نے انسانی ماحول میں یکسانیت پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

انسان نے انفرادی تقاضوں کو اجتماعیت کی زنجیر میں جکڑ لیا ہے۔ انسانی فکر اور ادراک کی نوک پلک نے منتشر خیالات کے قطراتِ اشک کو پُرو کر رشک لعل بدخشاں بنادیا ہے۔ اضطرار کی تاریکیوں کو عزم وحوصلہ کے شمس وقمر کی تابانیاں عطا کی ہیں اور پھر اوہام کے استخوانِ شکستہ کو حقائق طعامِ لذیذ سمجھ کر نوشِ جان کرتے رہے ہیں

اورانسان کے اُفقِ تخیل پر صُبح درخشاں کی طرح یقینِ کامل نمودار ہوا ہے۔ حقائق پر یقین رکھ کر انسان نے زمانے کی تقدیر کو بدل دیا ہے۔ اس کی خاطر کبھی اُسے شہید کربلا بننا پڑا ہے اور منصور کی طرح کبھی دار و سن کی آزمائش سے گزرنا پڑا ہے اور کبھی سقراط کی طرح زہرِ ہلاہل کا جام مُنہ سے لگانا پڑا ہے۔ لیکن زہرِ ہلاہل کو اُس نے ہمیشہ زہرِ ہلاہل ہی کہا، شکر قند کبھی نہیں کہا۔ سراب کو سراب کے نام سے ہی پُکارا تسنیم و کوثر کبھی نہ کہا۔ حق و باطل میں ہمیشہ اس نے امتیاز کیا ہے، اور یہی چیز مخلوقاتِ عالم میں انسان کو بلند مرتبت ثابت کرنے کی سب سے محکم دلیل ہے۔

چونکہ اس محاکمہ میں ماسوائے ادبِ عالیہ اور فنونِ لطیفہ کے دیگر علوم و فلسفہ کا تذکرہ مطلوب نہیں، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انسان نے فنونِ لطیفہ یا ادبِ عالیہ کے ذریعہ اوّلین طور پر مذہب کا رُوپ دے کر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

یہ وہ چراغ ہے، جسے اُس نے ظلمت کے اُس طوفان میں خونِ دِل اور جگر کا سوز دے کر روشن رکھا اور اس کی ٹمٹماتی لَو میں وہ اپنی راہ تلاش کرتا رہا ہے۔ یہ راہیں کتنی طویل ہیں، اِن میں کتنے پیچ و خم ہیں۔ دشتِ تجسس کے نوکِ خار اس کی آمد کے مُنتظر ہیں اور سفر کٹھن ہے۔

آخر کار اس سفر کا انجام کہاں ہوگا؟

اس وقت کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ بقولِ علامہ اقبالؔ

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دِل سے پوچھ
جُوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

وقت کی ان چٹانوں کا سینہ چیر کر اور مصائب کے سنگِ گراں کو پاش پاش کر کے انسانیت آج بھی منزلِ مقصود کی جانب بڑھنے کے لئے نئی اور آسان ترین راہیں تلاش کرنے میں مشغول ہے۔

☆☆☆

# باب دوم

فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ کی ابتداء اور اہمیت کا مطالعہ کرنے کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ افادیت کے لحاظ سے ان دو کا مرتبہ کیا ہے۔ یہ کسی حد تک زندگی کی تنقید اور تفسیر ہیں۔ فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ کا ایامِ سلف میں کس قسم کا آفاقی کردار رہا ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ کا آفاقی کردار نہیں ہوسکتا، اور نہ ہی زمانۂ قدیم میں ان کا کوئی آفاقی کردار تھا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اقوامِ عالم میں افتراق ہے اور اپنی ضرورت اور موقعہ محل کے مطابق ادبِ عالیہ یا فنونِ لطیفہ کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس لئے ان سے کوئی بین الاقوامی اضافہ ممکن نہیں۔ یہ لوگ مادیت اور معیشت کے افسوسناک مباحث میں اُجھ کر فن کی طبقاتی تقسیم پر بضد ہیں۔ آج فن کو سرمایہ داری اور اشتراکی حصوں میں تقسیم کیا جارہا ہے۔ یہ لوگ اپنی زنبیل اور ژاژ لئے پھرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ سبدِ گل کی فیض بخشیاں اُنھیں ہی میسر ہیں۔ ان کی یہ خود فریبی ظلم ناروا سے کچھ کم نہیں۔ اس کے خلاف دانشورانِ عصرِ حاضر کو صدائے احتجاج بلند کرنا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو یہ ایک ناقابلِ معافی اخلاقی سفاہت ہوگی۔ مصلحتوں کی تجدید خفی صاحبِ قلم کو مرغوب نہیں کرسکتی۔ ہم نے مانا کہ قلم کار چھوئی موئی سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس کی نازکیٔ طبع کے لئے ژولیدگی کو سُلجھانا اہم وامکان کے صحرائے لق ودق میں سرو وسمن اور گلہائے رنگ رنگ کی تلاش لئے سُود کے مترادف ہے۔ یہ

کام مصلح، ناصح، فقیہہ اور بلند مغز فلسفی کا ہونا چاہیے۔ لیکن یہ لوگ اپنا فرض انجام نہ دیں تو آرٹسٹ نوکِ خار سے نبض رنگ و بُو کو چھونے پر مجبور ہے۔ یہ شاعر خوش نگاہ یا ادیب دقیقہ رس کے مذاق سلیم کے لئے بہت بڑی بد ذوقی ہوگی۔ لیکن غور کیجئے کہ واعظ کا رول ادا کرنے پر آرٹسٹ مجبور ہے۔ وہ اس گھناؤنے زخم پر پھاہا نہیں رکھ سکتا۔ آخر زخم جب ناسور بن جاتا ہے، اُس پر کیوں کہ مرہم لگایا جا سکتا ہے۔ اُسے تو کاٹ کر پھینک دیا جانا چاہیے تا کہ زہریلے جراثیم جسم کے دوسرے حصوں میں سرائیت نہ کر جائیں۔ مریض کے لئے عملِ جراحی کُلف کے کانٹوں کی سیج سے کچھ کم نہیں۔ لیکن چند لمحوں بعد ہی اُس کی راحت و شادمانی کا سامان بن جاتی ہے۔ جس چیز کو اُس نے تلخ تصور کیا تھا وہ نتیجہ میں دراصل شہد سے زیادہ شیرین تھا۔ اب وہ اپنے چارہ گر کا احسان مند ہوگا شاکی نہیں۔ ادبِ عالیہ یا فنونِ لطیفہ کی آفاقیت کی مخالفت کرنے والے اصحاب اپنی شکست کا اعتراف کر لیں گے۔ یہ چند لوگ جو فن کی طبقاتی تقسیم کرنا چاہتے ہیں، فن کی پاکیزگی، عفت، تقدیس اور لطافت بلکہ ادا کی ہزار شیوہ نیرنگیوں کو اپنی کم نظری کے باعث مُستحکم حُدود میں بلکہ صلابت و سلاسل میں جکڑ کر رکھ دینا چاہیے۔ وہ پھول سے اُس کی خوشبو کی لطافت، رات سے اُس کی سیاہی کی عظمت اور صُبح سے اُس کی درخشندگی کا حُسن چین لینا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا گلہائے احمریں کی آتشِ خنداں تنگ مایہ گریۂ شبنم کے چند بُوند قطروں سے کہیں بجھ سکتی ہے؟

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، دراصل آج کا تخلیق کار اپنے فرائض کو بھولتا جا رہا ہے۔ وہ ادبیاتِ عالیہ یا فُنونِ لطیفہ کے آفاقی کردار سے پوری طرح آشنا نہیں۔ نگاہِ نکتہ رس اچھی طرح جانتی ہیں کہ فنونِ لطیفہ و ادب عالیہ کی فطرت آفاقی ہے۔ ہر قوم کے کلاسیکی ادب سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اُس مہدیٔ برحق کو عالمِ تسور میں

دیکھیئے جو میدانِ کارزار میں شش جہت پر جب نگاہ دوڑاتا تو اپنے آپ کو بالکل تنہا پاتا ۔نہ کوئی ساتھی تھا اور نہ کوئی دوست۔ لیکن پھر فکرِ رسا اُمید کے دامن گیر ہوتی۔ اسی امید کی سُبک روہواؤں کے سہارے سے زنادی کی ناؤ چھوڑ دی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اس دریائے پُر آشوب میں کس کس جگہ بھنور ہیں؟ خاموشی اَمواج میں کتنے طوفان ہیں۔ کبھی پھولوں کا بستر میسر ہے۔ کبھی ایسا وقت بھی آئے گا کہ کانٹوں کی سیج پر سونا پڑے گا۔ کبھی کلیوں کا تبسم خوش آمدید کہہ رہا ہے، کبھی آگ کے دہکتے ہوئے انگارے استقبال کرنے کے لئے ہوں گے۔ یاس و مایوسی اور بیم و رجا کا عالم تھا جس میں وہ زندگی بسر کر رہا تھا۔

یہ قنوطیت اس کے تخیلِ رنگیں کی شعبدہ بازی نہ تھی۔ یہ وقت کی صدائے باز گشت تھی جو اس کے کانوں میں خطرے کا الارم بن کر گونجتی تھی۔ وہ تحت الشعور کے آئینہ میں آئندہ کے واقعات کا عکس دیکھتا تھا۔ اُسے حالات کا مقابلہ کرنا تھا اور حالات موافق نہ تھے۔ شروع شروع کے انسان اور بن مانس میں فرق کی گُنجائش بہت زیادہ نہ تھی۔ شروع کے انسان کا اہم ترین مُدعا بقائے نسل اور اپنی بقا تھی۔

اُس کے لئے راتیں حسین نہ تھیں، آسمان پر کسی دوشیزہ کی بکھری ہوئی زُلفوں کی طرح پھیلے ہوئے لاتعداد تاروں کے جال اُس کے لئے کوئی مفہوم نہ رکھتے تھے۔

چاند کی نرم و نازک کرنیں غدارِ محبوب سے کوئی مشابہت نہ رکھتی تھیں۔ بلکہ وہ جنگل کے وحشی درندوں کے لئے مشعل نُمائی کا کام کرتیں، جو کسی وقت بھی اُس کے تنگ و تاریخ غار کے غرفے پھاند کر اُسے لُقمہ اجل بنا سکتے تھے اور اگر اُن سے نجات ملتی تو نمودِ صبح دیکھنا نصیب ہوتی۔ پھر بھی جنگلی جانوروں اور وحشی پرندوں کے خوف سے

باہر نکلنا آسان نہ تھا۔ مہرِ نیم روز کی رُوح فرسا اور آتشیں شعاعوں میں جب کہ جنگل کے تمام جانور اپنے کچھاروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں، یہ بن مانس نُما انسان تلاش روزگار میں جنگل کی خاک پھانکتا۔ اُسے کچھ بھی سوچنے کی فرصت نہ تھی۔ بقولِ ابوالکلام آزاد ''یہ سچ ہے کہ خدا کی ہستی کا عقیدہ انسان کے ایک فطری احتیاج کا نتیجہ ہے'' لیکن اُس وقت اس نے اس عظیم فطری احتیاج کو بھی محسوس نہ کیا تھا۔ ایسے ہولناک ماحول میں فطری احتیاج جنم بھی نہیں لے سکتا تھا، جہاں غمِ روزگار کے صحرائے پُر خار ہوں۔ جہاں مصائب کے آتش فشاں شعلہ زنی کرتے ہوئے، جہاں پریشانیوں کے طوفانوں کی ہولناکیاں مُبازت طلب ہوں، جہاں زمانے کی زہریلی اور مسُموم ہوائیں زندگی کی نوخیز کلیوں سے اٹھکھیلیاں کرتی اُنہیں مسل دینا چاہتی ہوں۔

ذرا سوچیئے کہ ایک بے سہارا ابن مانس فطرت ک تمام مخالفت طاقتوں کی یلغار کی زد میں ہے، سنگدل فطرت اسے گھائل کردینے پر آمادہ ہے، وہ فطرت کی ہولناکیوں کا شکار ہے، زخم ہی زخم ہیں، جن سے لاچاری اور مُجبوری پیپ اور خون بن کر رس رہی ہے۔ تریاق کے دو گھونٹ میسر نہیں۔ پھر کیوں کر وہ ان زہرناکیوں کہ میں جی سکتا تھا؟ اِن ناسوروں کے لئے کہاں سے گُلِ شاموس لا سکتا تھا؟

ہر وقت ایک نیا سوال، ہر وقت ایک نیا مُعمہ، کس کو،، وا کرے۔ کس کو سُلجھائے...... سب کیس سب دقیق خم کاکُل کی طرح، یا جیسے تارہائے عبنکبُوت کے لاتعداد پیچ در پی جال...... ہر نئے خم کے سُلجھانے پر لاکھوں نئے پیچ وخم سامنے۔ ایک عقدہ وا کیا تو سینکڑوں نئے تقاضوں نے جنم لیا۔

ان حالات میں انسانیت فطرت کی قہرمانی قوتوں سے برسرِ پیکار تھی۔ پلّہ

فطرت کا بھاری تھا۔ انسانیت ہزیمت کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ اسے صفحہ ہستی سے مٹانے کیلئے لاکھوں جتن کئے گئے۔ کیا کیا سازشیں ہوئیں، خود اس کے من میں استخفاف شکست خوردگی کی بدلیاں اُٹھیں، طوفان آئے انسانیت کو فنا کرنے کے لئے پے در پے حملے ہوئے۔ انسانیت بے چاری کس کس سے عہدہ برا ہوتی؟ کہاں کہاں پناہ لیتی؟ کون تھا جو اسے آسرا دیتا؟ ان طوفانوں کی یورِش میں، ان طغیانیوں کی یلغار میں ،ان مصائب کی چمکتی ہوئی بجلیوں میں، ان لپکتے ہوئے کوندوں میں......۔

ایک صرف ایک اُمید کا دیا تھا جو ٹمٹما رہا تھا یا یوُں کہیے کہ عزم جواں کا جھلملاتا ہوا چراغ تھا، جسے انسانیت نے یقین کا خون دے کر زندہ رکھا اور جن کی مدہم مدہم روشنی میں وہ اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

اس ماحول میں انسان کو یہ فرصت کہاں تھی کہ وہ یہ سوچتا کہ مظہرِ فطرت کی ان تمام کارکردگیوں کے پیچھے کون سی قوت کار فرما ہے؟ انجم ہائے فلک کو درخشانی کس نے دی ہے؟ کیوں دی ہے؟ کیسے دی ہے؟ ماہِ سیمیں کی تابانی کس کے دم سے ہے؟ آفتاب کی شعاعیں روُح فرسا اور شعلہ بار کیوں ہیں؟ وہ تو صرف اتنا جانتا تھا کہ دریائے نیل میں طغیانی آتی ہے۔ کیوں آتی ہے؟ اُسے معلوم نہ تھا کیوں کہ یہ سوچنے کی اُسے فرصت نہ تھی۔ یہ طغیانی جب آتی ہے تو اُس کے لہلہاتے کھیتوں کو ویرانہ بنا کر رکھ دیتی ہے۔ اُس کے جھونپڑوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتی ہے۔ چند موجیں، یہ مُضطرب طوفان اُس کی تدبیروں کے دائرے میں گرفتار ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اس کا مطلب کیا ہوسکتا ہے؟ اُس نے تجربے سے سیکھا تھا کہ خود اُس کی قوم میں طاقتور مظلوم کو دبوچا تھا۔ کسی کی بے چارگی کی لاش پر اپنی مسرت کے محل تعمیر کئے تھے۔ کسی کے آنسوؤں سے اپنے قہقہوں کے زیر و بم پیدا کئے تھے۔

اس لئے اُسے احساس ہو گیا تھا کہ نیل کا دریا عظیم ہے اور وہ مظلوم ہے، نیل کا دریا طاقتور ہے اور وہ کمزور ہے۔ اس طاقت ور اور عظیم درندے کو خوش کرنا ہوگا ۔ اس کی عظمت کے راگ گا کر اس کی داستانِ ظلم کو تسامحِ عندیہ (Enphemism) کی شعبدہ بازی سے اِستحسانِ فطرت کے رُوپ میں ظاہر کر کے اس کی قہرمانی قوتوں کو فریبِ تخیل کی سحر کاری کے ذریعہ نعمت خداداد جتلا کر اور اس کے باوجود بھی اس قہرماں کا جلال بدستُور قائم رہا تو نوجوان حسین، اَلھڑ اور معصوم دوشیزاؤں کو جن کے لبوں پر مسکراہٹوں کے کنول کھلے ہوئے تھے۔ جن کی آنکھوں میں ستاروں کی چمک ہوتی، جن کے اَبروخمِ محراب سے ہزار گونہ نظر کش تھے۔ جن کی بل کھاتی نازنین کمر میں کوندوں کی لپک تھی۔ پائے نازک کی تال پر کلیاں چٹک اُٹھتی تھیں جن کی سُبک کرام چال دِل کی دھڑکن کی آہٹ سے بھی زیادہ......نیل کے کھولتے ہوئے لاوے، اس اُبلتے ہوئے سمندر، اس مضطرب طوفان کی نذر اُنہیں کیا جاتا! آن کی آن میں بل کھاتی ہوئی وحشی موجیں کسی مُنہ کھولے ہوئے اژدہے کی طرح اُنہیں نگل لیتیں۔

کِتنی بار ساحل سے ماں کی مامتا نے یہ تماشا دیکھا ہوگا؟!

اپنی کُوکھ سے اُگلے ہوئے کوہِ نُور کو قہر وغضب کے وحشی دیوتا کی بھینٹ چڑھتے دیکھا۔ دُھندلکوں میں کسی کے چمکتے ہوئے مینارۂ نُور کی طرح خلا میں گھومتے ہوئے کسی شہابِ ثاقب کی طرح، ٹمٹماتے ہوئے......ستارہ سحر کی طرح جن کی روشنی اور تابندگی چند لمحوں کے لئے نگاہ کو خیرہ کرتی ہے۔ یہ حسینائیں، یہ دوشیزائیں، یہ حُسن معصوم، یہ کلیاں، جن کے مُنہ ابھی بند تھے، چند لمحوں کے لئے سطحِ آب پر موجوں کے تھپیڑے کھاتیں، اُن کی کف در دہاں چیخیں، ان کے خروشاں نالے، ان کی آہیں،

کنارِ ساحل پر کھڑی ماماتا کی بے بسی پر طنز کا ایک گہرا گھاؤ لگاتیں اور آناً فاناً میں موجوں کے ارتعاش میں گُم ہو کر رہ جاتیں! ماں کی مامتا کا اِس سے سخت اور گھناؤنا، اِس سے کڑا اور وحشیانہ، اِس سے مُہیب اور قابلِ رحم امتحان کیا ہو سکتا ہے؟ کیا انسان کی واہمہ سے بھی عظیم آذر کو فطرت نے جنم دیا ہے؟

دراصل انسان فطرت کا عظیم ترین شاہکار ہے اور انسان کا عظیم ترین شاہکار اُس کا واہمہ ہے جو بعد میں منطق اور استدلال کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے، جس نے فنا کے اجزاء سے جل پریوں اور دیوتاؤں کی تخلیق کی، ان کی تشکیل کی، ان کے وجود کو منوایا۔

گورکی الفاظ میں:

"انسان نے پہلے اپنے دیوتا تراشے اور پھر ان کے عین مطابق افسانوی ہیرو تراشے جو عوام کی مجموعی صفات کا پیکر ہوتے ہیں::

دوسرا مفکر بھی شیوۂ بُت پرستی کو شیوۂ انسانیت قرار دیتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ قوتِ متخیلہ فطرت کا سب سے اہم معجزہ اور انسان کی عظمت کا اشاریہ ہے۔ واہمہ تخیّل کی غیر منظّم شکل ہے، جو قوتِ متخیلہ سے قوتِ استدلال کو نفی کرنے کے بعد باقی رہتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں واہمہ کسی چیز کے وجود کو بغیر استدلال تسلیم کرنے کا نام ہے۔ اس بات کو مانتے ہوئے کہ انسانی شعور کا ارتقاء ہوا ہے۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ واہمہ انسانی شعور کے ارتقاء کی پہلی منزل ہے۔

یہ واہمہ جس کی بیداد کی داستان، جس کے ظلم کی کہانی وقت کی خُونچکاں قلم سے تاریخ کے اَبدی اوراق پر رقم ہے، اسی کو تیشہ بنا کر اُولوالعزم اِنسانیت نے فطرت

کی پُراسرار قوتوں کی بیخ کُنی کی ہے۔ انسان نے دشتِ فطرت کے ناسازگار ماحول کے کوہ گراں کو کاٹ کر ایک سازگار فضا کی جُوئے شیر نکالی اور صحرائے تجسس کو حقائق کے لالہ وگُل کی رنگینی سے رشک چمن بنادیا۔

انسان نے پہلے دریائے نیل کو واہمہ کے آئینے میں طاقتور، اور جابر دیکھا۔ پھر وہ اس طاقت سے محبت کرنے لگا۔ انسان نے دریائے نیل میں جھانک کر اپنی خواہشات کا عکس دیکھا۔ برسوں یہ سلسلہ جاری رہا ہوگا۔ لیکن ایک دن خواہشات کے آتش فشاں نے پھٹ کر جذبات کا لاوا اُگلنا شروع کردیا۔ انسان نے خود دریائے نیل جیسا طاقت ور بننا چاہا اور اس آدرش کی صفات کی پرستش شروع کردی۔ اس طرح دُنیا کے سب سے قدیم ادیب عالیہ یعنی مذہب کا دانشہ طور پر آغاز ہوا۔ یہ ادبِ عالیہ اُس وقت کی انسانی زندگی کی جدوجہد کی مکمل تصویر پیش کرتا ہے۔ منطق اور استدلال کے سرچشمے کی تلاش بھی یہیں کی جاسکتی ہے۔ یہ اظہارِ خیال کا پہلا طریقہ تھا جو انسانیت نے سیکھا اور اظہارِ خیال نے انسانیت کو اسی اجتماعیت کا درس دیا اور اس درسِ حیات کو ایک نیا آفاقی سماج قائم کرنے کے سلسلے میں آج ہم پھر دُہرا رہے ہیں۔

☆☆☆

# باب سوم

اگلی بحث سے ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دُنیا کے سب سے قدیم ادبی شہ پارے اقوامِ عالم کی مذہبی صحائف ہیں۔ یہ مذاہب واہمہ کا نتیجہ ہی سہی، لیکن ان کا سماجی افادیت سے بڑا گہرا اثر ہے۔ دراصل یہ قدیم مذاہب سماج افادیت کا نتیجہ تھے۔ان کا ابتدا میں ماورائیت سے کوئی تعلق نہ تھا۔زمانہ قدیم کے فلسفی نے دانستہ یا نادانستہ خدا کا کوئی ماورائی تصور قائم نہیں کیا تھا۔فطرت کی مہربانی قوتوں کے سامنے اپنے آپ کو بے بس جان کر انھیں دیوتا اور اوتار بنا ڈالا۔ یہ تصور اس کے تخیل رنگین کی شعبدہ بازی نہ تھی۔ جب کہ آسمان پر سے ماہِ درخشاں نُور کی بارش برساتا ہے، چاند کی تابانی کو اور درخشاں کرنے کے لئے کہکشان لاتعداد انجم ہائے فلک سے روشن ہو جاتا ہے اور ایوانِ شب سُبک سیر ہواؤں کے قہقہوں سے گونج اُٹھتا ہے یا کبھی کبھی کوئی لکہ ابرِ رَواں چاند کے نرم و نازک سیمیں عذار چُوم لیتا ہے۔آج کا فلسفی گوشۂ تنہائی میں یہ سوچ سکتا ہے کہ 'خدا' کی کیا حقیقت ہے۔لیکن زمانۂ قدیم کے مردِ مُجاہد کے سامنے صرف بقاء کا مسئلہ تھا اور ہر چیز کی قیمت صرف افادیت کے سکون میں لگائی جاتی تھی۔ نیکی اور بدی کا تصور تخریب کے سکون میں لگائی جاتی تھی۔ نیکی اور بدی کا تصور، تخریب اور تعمیر کا فلسفہ سماجی افادیت کا نتیجہ تھے۔ بقولِ کسے: ''تمام گناہ بدصورتی ہے اور تمام نیکی حُسن ہے'' اور مذاہب جنھیں بظاہر خرافات اور زیادہ عمیق طور پر مُلاحظہ کرنے کے

بعد رسم ررواج کہا جا سکتا ہے، صرف سماجی افادیت کے آئینہ دار ہیں۔ دوسرے الفاظ میں انسانی بقاء کا تقاضا سماجی افادیت ہے، اور سماجی افادیت کا نتیجہ انسانہ واہمہ کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے اور اس واہمہ کا بتدریج ارتقاء ہوا ہے۔ تخیل اس واہمہ کی اعلیٰ ترین شکل ہے یا دوسرے الفاظ میں سماجی افادیت کا نتیجہ انسانی واہمہ ہے اور قوتِ متخیلہ سماجی افادیت کا تقاضا ہے۔ واہمہ اور قوتِ متخیلہ کے آپس کے تعلق کو سمجھنے کے لئے انسانیت کی تاریخ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ عہدِ ماضی کے انسان نے دریائے نیلم کے سامنے اپنے آپ کو بے بس تصور کیا تھا اور جب اُس نے دیوتائے نیل کی عظمت کے راز کو سمجھنے کی کوشش کی تو اُس کی اپنی خواہشات کا وہ طوفان اُسے خش و خاشاک کی طرح بہالے جاتا ہے، وہ خود اُس دیوتا جیسا جلیل القدر اور عظیم المرتبت بننا چاہتا ہے۔ وہ اس دیوتا کے وجود میں اُن تمام صفات کو یکجا کر دیتا ہے، جن کی طلب خود اُس کے دل میں کسی زیرِ سنگ کلی کی طرح چٹکتی اور اس طرح جب قوتِ متخیلہ میں ادراک کے عنصر کے بدلے خواہش نے جگہ لی۔ نتیجہ واہمہ ہوا۔ یہ انسانی شعور کے ارتقاء کے مختلف مدارج تھے۔ قوتِ متخیلہ کے مدد سے انسان نے اس خواہش کو حقیقت بنانے کی سعی کی اور نتیجہ اخذ ارتقا ہوا، جذبات کا ارتقاء، ذوقِ جمال کا ارتقاء، برسوں یا یہ کہیے کہ صدیوں کی تخم ریزی کے بعد گلاب یا کیکٹس یا سُنبل یا لالہ کے پھول سے انسانی ذوقِ جمال نے جلا حاصل کی ہوگی، اور پھر اسی جذبے کے تحت صحراؤں کو لالہ زار بنانے کا عزم پیدا ہوا اور پھر شاعر چیخ اُٹھا

ہے صحرا اب بھی صحرا مگر خُونِ پا کا فیض
سیرابِ چند خارِ مُغیلاں ہوئے تو ہیں

بذاتِ خود فنونِ لطیفہ ہو یا ادبیاتِ عالیہ، مُدعا دونوں کا یہی رہا ہے، اور ہر

آرٹسٹ اور مصنف کا خواہ وہ اُوتار یا پیغمبر یا فلسفی یا شاعر کا لبادہ اوڑھے ہوئے آیا، یہی منشاء تھا کہ وہ اس آدرش کو اپنائے۔ یہ جذبہ ایک عالمگیر جذبہ ہے جو آفاقیت کے اُصولوں پر مبنی ہے اور ہر انسانی سینہ میں اس کا منبع تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے وہ 'ادب' جو ان بنیادی اصولوں کا قائل نہیں کبھی ادب عالی کا درجہ حاصل کر نہیں سکتا۔ وہ ادب جو آفاقیت کو تسلیم نہیں کرتا ادب عالی کہلانے کا مستحق نہیں۔ اور ادبِ عالی خواہ وہ دُنیا کی کسی بھی زبان میں ہو، اپنے آفاقی کردار کو نُمایاں کیئے ہوئے رہا۔ یہ قوم و ملک کی قید سے آزاد ہے اور انسانیت کی میراث ہے۔ ادبِ عالیہ کی اوّلین شرط اُن، جذبات کا اظہار ہے جو عالمگیر نوعیت کے ہیں۔ ادبِ عالیہ کا نصب العین اجتماعیت پیدا کرنا ہے، اس کی ایک بہت بڑی وجہ ہے انسان ہر مشکل کا اجتماعی طور پر سامنا کرتا ہے۔ انسان اپنے ماحول میں یکسانیت پیدا کرتا آیا ہے۔ اس کے برعکس دیگر ''مخلوقاتِ عالم'' کا کوئی دیدہ و دانستہ قائم کیا ہوا سماج نہیں۔ اُن کے ماحول میں نیرنگی ہے یک رنگی نہیں، بے ترتیبی ہے سلیقہ نہیں۔ بے آہنگی ہے، ہم آہنگی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ارتقائے عمل اور ردِ عمل کے دوران جب ماحول تبدیل ہو گیا تو آفرینش کی بقا اسی میں تھی کہ وہ اپنی تشکیل ماحول کے مطابق کرے۔ لیکن جس وقت انسان وجود میں آیا تو اُس کی کوشش یہی رہی ہے کہ اپنے ماحول کو تابع کرے۔ اس آزمائش میں اُس کی پہلی منزل زبان کی بازیافت ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زبان کی نشو و نُما نے زوال پذیر انسانیت کو لازوال بنا دیا۔ اس کے ذریعہ سے خیالات کا اظہار کیا جو خود سوچا دوسرے کو بھی اُس پر سوچنے کا پیغام دیا اور اسی عمل سے انفرادیت اپنے قلب ماہیت یعنی اجتماعیت میں ظاہر ہوئی اور اس طرح انسانی سماج وجود میں آیا۔ پس دوسرا نتیجہ جو ہم اخذ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ خود انسان کا وجود اس کی زبان اور اُس کے

کلچر کا وجود، ماحول کے تقاضوں کا نتیجہ تھا اور اس ماحول کو تابع کرنے کی خواہش بھی ماحول کا نتیجہ تھی۔ جیسا کہ باب دوم میں مُفصل طور پر واضح کیا گیا ہے۔ پس یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ اس پس منظر میں اَدب کو سماج کو غلام سمجھنا بڑی سنگین غلط فہمی ہے۔ سماج کا مفاد، انسانی اظہار خیال پر مُبنی ہے۔ ادبِ عالی اور فنونِ لطیفہ اظہار خیال کا سب سے موثر ذریعہ ہیں۔ پس ادب عالی کا تخلیق کار ایک تاریخ دان ہی نہیں جو صرف داستانِ زمانہ کو صفحۂ قرطس پر نقش کر کے مقتدائے زمانہ ہونے کا دعویٰ کرے اور یہ جانے کہ انسانی عزم کی چند داستانوں کو تقویم پارینہ ہونے سے بچا کر اس نے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔ بلکہ اس تخلیق کار کا فن پارہ اتنا آفاقی ہوتا ہے، جتنا کہ اُس کی اپنی شخصیت وقیع ہوتی ہے۔ اس کی انگلیاں نبضِ ہستی کو ٹٹولتی رہتی ہیں اور اگر آپ ثبوت چاہیں تو اجنتا اور ایلورا کی جیتی جاگتی تصویروں اور مُورتوں کو دیکھئے۔

تاج محل کو دیکھئے وہ کس طرح اس کی جوازیت فراہم کرتا ہے، شیکسپیئر کے نوکِ قلم کے بکھرے ہوئے موتی آج بھی انسانی ذہن کو چکا چوند کرتے ہیں۔ وہ آج بھی اتنے ہی درخشاں ہیں جتنا کہ خود اُنہیں اپنے خالق نے دیکھا تھا۔ غور کیجئے کہ کیا گوئٹے کی شاعری ہمالہ کی چوٹیوں کی طرح وہ جلال لئے ہوئے نہیں ہے جو ہمارے دل و دماغ کو مرغوب کئے بغیر نہیں رہتا؟ کیا غالب نے قطرہ میں دجلہ دیکھنے کی تاکید ہیں نہیں کی؟ کیا عقل افلاطونی دو ہزار سال کے دبیز پردوں میں سے جھانک کر جب بھی ہمیں اپنا جلوہ دکھاتی ہے ہم یہ نہیں کہتے ہیں کہ افلاطون کا صحیح مقام آج بیسویں صدی میں بھی تعین کیا جا سکتا ہے؟ اور بالکل اسی طرح ہر صدی میں علما نے افلاطون کی نسبت یہی فتویٰ صادر کیا تھا۔

ان حضرات کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہ لوگ آفاقیت کے علمبردار ہیں۔

زندگی کی ظفریابی آفاقیت کو حاصل کر کے اپنی معراج حاصل کر لے گی۔ ہماری زندگی کا محور فتح وشکست ہی تو ہے۔ ہماری فتح یابی میں بھی ہماری ہزیمت کے نشان پنہاں ہیں اور ہماری شکست خوردگی پر بھی عزم ظفر مندی کے نقش ثبت ہیں۔ فرق صرف زاویوں کا ہے، جن سے ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ ادب عالی کا خالق زندگی کا وہ رُخ پیش کرتا ہے جو کامیابی اور کامرانی کی تصویر ہماری نگاہوں میں لے آئے۔ منزلِ شوق کو دو قدم جان کر ہماری رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ زمانے کے کڑے کوس طے کرنے والا راہی سہاروں کا متلاشی نہیں ہوتا اور ہو بھی کیوں؟ کیا جب منزلیں پکارتی ہیں، راستے آسان نہیں ہوا کرتے؟ زندہ رہنے کا عزم صمیم اور زندگی کو بہتر بنانے کا احساس ادبِ عالی کے زرین مقاصد میں سے ہے۔ اس جذبہ کا دوسرا نام ذوقِ جمال ہے۔ ہر وہ چیز جو انسانیت کے مفاد کو تقویت پہنچائے حسین ہے۔ جمالیات کا یہ تصور جس دوسرے نظریئے کو منظر عام پر لاتا ہے وہ فلسفۂ محبت ہے۔ اگر مفادِ انسانی ہی ایک محک ہے جس پر آفاقی اقدار کو پرکھا جاسکتا ہے تو محبت ایک بہت ہی عظیم جذبہ کہلانے کی مستحق ہے۔ کیونکہ محبت خود غرضی نہیں، بے غرضی ہوتی ہے اور انسان جب بے غرض ہو جائے تو اجتماعیت وجود میں آتی ہے۔ اجتماعیت جسے انسانی برادری بھی کہا جاسکتا ہے۔ انسانی برادری کا یہ جذبہ ایک نہایت ہی اَرفع تر مطمحِ نظر کے تحت یُوں اظہار پاتا ہے۔

"محبت فاتحِ عالم!"

یا ایک نہایت محدود پیمانے پر شاعر کی زبان سے یُوں ادا ہوتا ہے:

اک لفظِ محبت کا اِتنا سا فسانہ ہے
سِمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

اگر آپ پھر بھی محبت کی انشراح چاہتے ہیں تو اس جذبے کو اُس کے متنوع رُوپ میں دیکھیئے، کیسے یہ جذبہ ایک عورت کو بچہ جننے کی مشین کے طور پر نہیں بلکہ ایک لیلیٰ، ایک عذرا، ایک شرین کے روپ میں پیش کرتا ہے اور بالکل اسی طرح آج بھی ک کتنے قیس نجد کے ویرانوں میں گریبان چاک ہیں۔ کتنے فرہاد ہیں جن کے تیشوں کی حرارت چٹانوں کو موم کی طرح پگھلا دیتی ہے۔ اس زمانے میں تخت و تاج کو ٹھکرانے والے ایڈورڈ بھی موجود ہیں۔ یہ چند مافوق البشر حضرات کے افسانے نہیں بلکہ یہ ایک کہانی زمانۂ ماقبل از تاریخ کے عاشقان سے لے کر عصرِ حاضر کے لاکھوں گُمنام رومیو ور جیولٹ کی کہانی بھی ہے۔ یہ پر اُس شخص کی کہانی ہے جس نے دُنیا میں محبت کی اور دُنیا میں کوئی ایسا شخص ہے جس نے محبت نہیں کی؟ جذبۂ محبت ایک موجِ بے قرار ہے، جو ساحلِ زندگی سے ستیزہ کار ہے، یہ جانتے ہوئے کہ موج اور ساحل کا اختلاط نہ کبھی ہوا ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود بھی کتنا عجیب سا جنون ہے، کتنی عجیب شوریدگی کتنی فضول سی تمنا ہے کہ سیلاب میں اُمڈے ہوئے دریا کی وحشی موجیں بار بار جا کر ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ خطوط اور دائرے بناتے ہوئی خوب صورت اور حسین جیسے مانی و بہزار کے نقش ہوں، دِل نشیں و دِلفریب!

لیکن یہ نقش پائیدار نہیں ہوتے۔ جیسے ہی طوفان تھم جاتا ہے سکوتِ موج کا مزار ہے۔ ان کی قسمت اور جھیل کی نیلگوں خفائے آب ہے۔ ان بے نام نام سے افسانوں کا مدفن! لیکن موجِ تیز خرامیدہ نے ساحل کے کناروں کو نوچا اور جیسا چاہا ویسا ہی تراشا! یہی زندگی ہے! یہ ہی زندگی اور محبت کا مقدس رشتہ!

زندگی کو بھی تراشتا ہے انسانیت نے اپنے منشا کے مطابق ورنہ کون جانے، انسان اپنا اصلی مقام کھو بیٹھے اور برسوں کی ارتقاء کے مساعی جمیلہ مُشبِ غبار بن کر

حالات کے طوفان میں بکھر جائیں۔ ابھی تک اس رجعت قہقہری کا آغاز ہوا ہے ۔لیکن حالات اس رجعت کے درپے ہیں۔ تباہ کُن بموں اور مُہلک آلات کی ایجاد ایک منحوس شگون ہے۔ آئن اسٹائن کے الفاظ میں تیسری جنگِ عظیم کے بعد بھی زمانۂ ما قبل از تاریخ کا دور شروع ہوگا۔ پس آج بھی فاتحِ عالم بننے کے لئے ہمیں محبت درکار ہے۔ محبت جو کبھی شریں وفرہاد کی صورت میں جلوہ گر ہوئی، محبت جو قبیلے کی شکل میں ہمارے سامنے آئی۔ محبت جو ہوریشس کی حُب الوطنی بن کر جاگی تھی۔ یہ محبت کی ماں کی ممتا بن کر ہمارے رُوح میں، ہمارے وجود میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

یہ محبت جو یسوع کے سینے سے خون کی دھار بن کر پھُوٹی تھی اور ہر فولادی نیشتر کو گل ولالہ کی رنگینی بخش دی۔ خُون کے ننھے ننھے قطرے پر آہنی نوکِ خار پر اس طرح لرز اُٹھے تھے، جیسے صُبح کے وقت گلاب کی پنکھڑی پر شبنم کے قطرے شعشعہ نُور کی آمد پر تھرتھرا اُٹھیں۔ اس شکستگی و کسمپرسی میں بھی سارے زخم تبسم آفریدہ تھے۔ درد کی ہر ٹھیس پر جو نشتر اُتر گئے، یُسوع ہنس دیئے۔ یہ ہنسی حُسن تجلّی کے لئے، یہ تبسم عصمت لالہ لئے، یہ مُسکراہٹ تقدیس گل لئے یا خود جلوۂ یزداں کا عکس لئے، غم کے اندھیروں کو کالعدم کرتی ہوئی انسانیت کے لئے صُبح اُمید بن گئی۔ یا یُوں کہیے کہ ایک شاداب و دلکش پھول خزاں کی یلغار میں تھا۔ جو ہنستے ہنستے مُرجھا گیا اور خزاں کو رعنائیاں بخش دیں۔

☆☆☆

# باب چہارم

ابو بابِ گزشتہ میں قاری نے دیکھا کہ کس طرح اُسلوبِ تمثیلی نے آفاقیت کے بخیئے اُدھیڑ کر رکھ دیئے۔ معلوم ہوا کہ آفاقیت کا منشاء صرف بقائے انسانی نہیں ہے بلکہ آفاقیت کا صحیح مقصد کائنات کو مسخر کرنا ہے اور انسان کو فطرت کا سرتاج بنانا ہے۔ یہ فطرت جس کی قوتِ استبداد پیغارہ بن کر انسانیت کو چیلنج دیتی رہی ہے اور بن مانس کو مجبور کر دیا کہ وہ فطرت کی صاف و شفاف آنکھوں میں جھانک کر اپنی بے بس اور مسخ صورت کو دیکھ لے۔ لیکن انسان نے نارِسیس کے دیوتا کی طرح خود اپنے عکس سے محبت شروع کر دی اور تمام کائنات لامحدود انسانی تصور کی لپیٹ میں آکر ایک نقطۂ بے مایہ سے بھی زیادہ حقیر اور محدود ہو گئی۔ یہ عاشق کا تصور تھا۔ آج ہم جس نام سے بھی چاہیں اُسے پکار لیں۔ ہم اس کو ادبِ عالی کہیں یا فنونِ لطیفہ، فلسفہ کہیں یا اسے سائنسی فتوحات میں شمار کر دیں، ہیں تو یہ سب عشق کی کرشمہ سازیاں۔ عشق جو انسان کو اپنے آپ سے ہوا ہے، وہ عشق جو انانیت کا سرچشمہ ہے۔ پس اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ہر آفاقی قدر انانیت کی آئینہ دار ہے۔ انانیت کیا ہے؟ یہ غُرور گھمنڈ ہی نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ یہ شدید احساس برتری کا نتیجہ ہے یا اسے انسانی فطانتِ طبعی کہیں جو ہر انسانی فعل کو ایک مقصد عطا کرتی ہے۔ یہ فطانت صرف انسان کا خاصہ نہیں۔ اگر غور سے دیکھئے، فطانت قدرت کی تمام مُعجز نمائیوں میں جلوہ گر ہے۔ شش جہت فقط اژدہامِ رنگ و بُو نہیں بلکہ فطرت کی فطانت کا نگار خانہ ہے۔

نازکیِ طبع کے لئے مسرت وراحت آفتابِ نیم شبی کی مدقوق شعاع ہے۔

لیکن اگر اس کی ضیا پاشی دائمی ہو جائے تو شعشعہ بے مایہ وحقیر کی یخ بستہ و کُہر آلودہ آگ تمام کائنات کو مفلوج بنا کر رکھ دے۔ اس کے برعکس قدرت کی فطانت ملاحظہ ہو۔ شباب موسم رنگ وصورت میں تابشِ خاور غرور وبرنائی کے سبب نسیم صُبح گاہی کی سُنہری زلفیں شانہ کائنات پر بکھیرتا ہے۔ اور تجلائے سحر کے حُسنِ یگانہ سے بے خود ہو کر اس کی عنبریں اور مرمریں پیکر کو آغوش میں لے لیتا ہے اور پھر بہارِ خوش نگاہ وصُبح کے دہنِ شریں سے آبِ حیات نوشِ جان کرتا ہے۔ اس منظر حسین کے سامنے شاعرِ حُسن پرست کا تخیل افلاس زدہ اور دریوزہ گر نظر آتا ہے۔ یقین نہ ہو تو شاعرِ فطرت ورڈز ورتھ سے استفسار کیجئے جو سالہا سال ازلی حُسن بے پناہ کی جلوہ طرازیوں کے سامنے کشکولِ گدائی لئے دستِ سوال دراز کرتا رہا اور بالآخر اپنے فریبِ نظر پر خود صورت آئینہ حیران وششدر رہ گیا۔ ہمیں تسلیم کہ اس شاعر کا ہر شعر شفق کے رنگ میں رنگا ہوا اور زرین کرنوں سے مرصع کر ہے۔ لیکن کیا یہ ہوش باختہ دیوانہ فرطِ انبساط کی شوخی میں آکر چند ساعقہ بردوش ساعتوں کی جادوگری سے مرغوب ہو کر فطرت پرستش پر آمادہ نہیں ہو گیا تھا؟ قانونِ فطرت کی محرک شورشِ پنہاں نے شاعر کی سادگی پر ضرور زہر خندہ کیا ہوگا!

آپ کبھی کہکشاں کی طرف نگاہ اُٹھائیے اور دیکھئے کہ کس طرح اجرام کی کشش کے تحت شہابِ ثاقب فضائے لامُحدود کو جولانگاہ بنائے ہوئے اشہبِ فنا پر سوار سبک خرامی سے منزلِ عدم کی جانب رواں ہیں۔ آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ آیا ابدی قوانین فطرت کے استقرار کا نتیجہ ہیں، یا ان کا دراصل کوئی وجود نہیں اور اپنے گردوپیش کو سمجھنے کے لئے اُنہیں ہماری قوتِ استنباط نے فحترؔ کیا ہے؟ استصواب

کس سے کیا جائے؟

غور کیجئے، کیوں ضابطہ لیل ونہار ہے؟ کیوں شاہدِ قمر پر ہی ہمارے شاعروں کی طرح مدوجزر بحرِ بے پایاں فریفتہ ہیں؟ کیوں نہایت کاوش جگری اور باقاعدگی کے ساتھ ہر روز مداد شب، صُبحِ اتوار کو پکارتی ہے؟ کیوں خلوتیانِ غیب نے کچھ اس سلیقہ کے ساتھ کالی گھٹاؤں کی نشوونما کی کہ میخانے خمر آلودہ ہوگئے اور پھر شاعر وہم وگُمان کے لئے کسی زُلفِ تابہ کمر ابرِ سیاہ کی سرمستیاں اور اُدھ کھُلی مست اَنکھڑیاں حریفِ مے ناب بن گئیں!۔

فطرت دراصل نظم وضبط کا نام ہے۔ یہ صرف چند مظاہر پر ہی موقوف نہیں بلکہ تمام کائنات قانون وانضباط کے تابع ہے۔ آئن سٹائن کے دیدہ حکمت سے دیکھئے اور ذوقِ استفہام کو کہیے کہ اقبال سے پُوچھ لے۔

لُہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّہ کا دِل چیریں

ہر ذرّہ ناچیز خود ایک کائنات ہے۔ مجوف نہیں جیسا کہ نگاہِ نارسیدہ کی گرہ کشائی سے متحقق ہے۔ برعکس اس کے ہر ذرّہ ناچیز شانِ کبریائی کا دعوے دار ہے۔ ہر ذرّہ بے مایہ اپنے ثوابت وسیار لئے ایک مکمل نظامِ شمشی ہے۔

یہ کہنا دُرست ہوگا کہ ہمارے عارفانِ جدید کا تفوض سقیم الحال (اور اس کا اعتراف نیوٹن نے خود کیا ہے) ثبوت بہم پہنچائے یا اس میں ناکام رہے کہ اس آئینہ خانہ نیست ونابود میں تخریب بھی دراصل تعمیر کا کوئی اُصول ہے اور نیست کچھ بھی نہیں، ہمارا اپنا واہمہ ہے۔ کُہسار شعلہَ بار بلاوجہ اور بے معنی اپنی حدت ضایع نہیں کرتے۔ وقتِ مقرر سے اِذنِ مباح حاصل کرکے آتش فشانی پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ طغیان زدہ بحرودریا کو صرف اپنے مباہات کی نمائش مقصود نہیں۔ یہ بیچارے تو خود محصورینِ

متابعث میں سے ہیں۔ محض اتھاہ ساگر کے تفننِ طبع کے لئے جوار بھاٹا نہیں آتا۔ برق ورعد کے خطرات، عالمِ نباتات کی ربوبیت لئے ہوئے ہیں۔ ناگہانی بھونچال کسی مخفی دارد گیر کی لغویت نہیں۔ یہ سایہ پروردۂ اسباب اپنے ان آقاؤں کے احکام نہ بجا لائیں تو کیا کریں؟ دراصل ہستی قوانینِ فطرت کے پھندوں میں گرفتار ہے۔ طوفان کی جغرافیائی تقسیم ان کے خصایص پر کی گئی ہے۔ ہواؤں کے رُخ متعین ہیں۔ خزاں کی تاریکیوں سے ہی صُبحِ بہاراں درخشاں ہے۔ تخریب کے بغیر تعمیر ممکن نہیں۔ تعمیر کا کوئی تصور تک قائم نہیں کیا جاسکتا۔ تخریب دراصل تعمیر کا دوسرا نام ہے۔ اس کائنات میں اگر تخریب کچھ بھی نہیں تو فنا بھی صرف لفاظی ہے۔ ہم مادّہ کو اگر فنا بھی کریں تو طاقت کو کون فنا کرے گا؟

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم مادہ کو بھی فنا نہیں کر سکتے۔ صرف اُس کی ہیئت بدل کر اُسے طاقت کا روپ دے سکتے ہیں۔ ہستی قانونِ دوام کے تابع ہے۔ اس لئے ہستی طاقت یا مادّہ'' کی شکل میں موجود ہے اور نیستی کچھ بھی نہیں۔ موجوداتِ عالم اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ البتہ اگر کوئی نافہم ورق گردانی روزِ شب میں کردگار کے قائم کردہ نظم وضبط کے نکتہ ہائے دقیق اور رمزو کنایہ کو نہ سمجھ سکے اور پھر محقق اور محشی ہونے کا دعویٰ کرے تو ہم اس کے سوا ''سرِ تسلیم خم ہے۔ جو مزاجِ یار میں آئے'' اور کیا کہیں؟ یعنی اگر کوئی غبی فحوائے قدرت کا مفہوم اور ارتقاء نہ سمجھے اور نہایت وثوق کے ساتھ فتویٰ صادر کرے کہ کائنات کا ارتقاء ہوا ہے تو بتائے قصور کس کا ہے؟ ورنہ غور کیجئے کہ کیا موالید ثلاثہ کی تقسیم اس بات کی گواہی نہیں دیتی کہ فطرت ارتقاء کو تسلیم نہیں کرتی۔ کیونکہ ارتقاء کا مطلب قوانین کے پھندوں کو توڑ دنیا ہے اور چونکہ ایسا ممکن نہیں، اس لئے فطرت میں ممارست کی بھی گنجائش نہیں۔ دراصل فطرت نے تمام موجودات کو

خود کفیل بنایا ہے، کائنات میں کہیں بھی سُقم نہیں، کوئی ناقص نہیں، کوئی مرجح نہیں، کوئی مخذول نہیں۔

ایک ذرّہ ناچیز سے لے کر بحرِ ذخّار تک سب اپنی جگہ بہترین طور پر مکمل ہیں۔اس لئے دوسرا نتیجہ جو ہم اخذ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس کائنات میں نہ تو ارتقاء اور نہ ہی انقلاب یا دوسرے الفاظ میں نہ تو کائنات میں تخریب ہے اور نہ تعمیر بلکہ صرف ''ہستی'' ہے۔اس کائنات کی کوئی ابتداء نہیں اور نہ ہی اس کی اِنتہا ہے۔یہ کائنات ہمیشہ سے ایسی تھی اور ہمیشہ ایسی رہے گی۔قوتِ مدد کہ اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتی کہ کائنات اولاً صرف طاقت تھی اور آہستہ آہستہ طاقت نے مادہ کی شکل اختیار کی اور اس طرح مادہ آفرینش اور بالآخر موالید ثلاثہ کے رُوپ میں ظاہر ہوئی، یہ ممکن نہیں۔کیونکہ طاقت مخصوص قوانین کے تحت پابندہ ہے۔طاقت نے ان قوانین کی سلاسل حدید کیونکر پگھلائی ہوگی؟ مادہ اور طاقت ہمیشہ سے موجود تھے اور ہمیشہ موجود رہیں گے۔آفرینش میں بھی ارتقاء ممکن نہیں، ورنہ تمام سابقہ کڑیوں کو ختم ہونا چاہیے اور صرف ترقی یافتہ اور اعلیٰ اقسام کو موجود رہنا چاہیے تھا۔

موالیدِ ثلاثہ میں مماثلت اس قدر ہے کہ ہم استعجاب سے گزر کر ایقان کے ساتھ اس رشتہ مواخات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں اور پھر فرض کرتے ہیں کہ ارتقاء ہوا ہے۔حتیٰ کہ نباتات یا جمادات یا عالم حیوانات اپنے قوانین کے پھندوں میں گرفتار ہیں۔اگر موالید ثلاثہ میں مماثلت ہے تو وہ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ''ہستی'' کسی نطین قوت کی تخلیق ہے۔موالیدِ ثلاثہ ہمیشہ سے موجد تھے اور ہمیشہ موجود رہیں گے۔ دراصل ارتقاء نامکمل ہے۔مکمل ہونے کی ایک ابدی اور لازوال خواش ہے۔لیکن جو چیز اپنی ضرورت، موقعہ اور محل کے مطابق اکمل ہو اُسے مقاومت کی کیا ضرورت محسوس

ہوسکتی ہے۔ دُنیا میں ہر ایک چیز کوششِ ناتمام سے زندہ نہیں بلکہ قوانینِ قدرت کی متابعت سے زندہ ہے۔ کوئی راز کارگاہِ ہستی جو اہلِ شعور پر منکشف ہوا تو موجد اور مُحقق ہونے کا دعویٰ کر بیٹھے۔ چاند پر اگر مصنوعی سیارہ بھیجا تو ایک خاص رفتار پر جو کشش ثقل کے تابع اور فطرت کے اُصولوں کے مطابق ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ فطرت کے قوانین کی جو نیدگی ہمارے بس میں ہے، اُنہیں بدل دینا ہماری استطاعت نہیں۔ ہم فطرت کے مُسلّمہ اُصولوں پر عمل کر کے کوئی خاص نتیجہ برآمد کرتے ہیں اور اُسے ایجاد کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ صرف انکشاف ہوتا ہے۔

عصرِ حاضر کے مشہور فلسفی اور سائینسدان آئن اسٹائن نے انکشاف کیا ہے کہ کائنات میں نہ تو اضافہ کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کمی۔ کائنات محدود اور معین ہے اور یہ ان معنیٰ میں ممکن ہے کہ ہماری آفاقی قدریں قطعی اٹل اور مُدام ہیں۔ البتہ آفاقی قدروں کو جانچنے کے لئے ایک دوسرے میں تناسب قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

اس مقام پر اس سوال کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اگر فطرت ارتقاء کی قائل نہیں اور ہستی قوانین کے تابع ہے اور کائنات کوشش ناتمام سے نہیں بلکہ فطرت کے مُسلمہ اصولوں سے قائم ہے، تو پھر انسان کا دل اختیارِ تمیزی کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اگر خالقِ کائنات نے ہستی کو ازلی اور اٹل قوانین کے تابع کر دیا ہے، جن کے حلقہ اثر کو نہ تو خفیت کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی جن سے تجاوز کی گنجائش ہے، تو اس کائنات کو مسخر کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اگر ہم کشاکش واستقرا سے خوادق عادت نتائج حاصل کرنے میں ناکام و نامراد ہیں تو فطرت کو مفتوح بنانے کی سعی لاحاصل کیوں؟ ہستی کوششِ ناتمام سے کیسے زندہ ہے؟ انسان کس مساعیٔ جمیلہ کا متمنی ہے؟ اگر ہمارے لاکھوں برس کے تجربات مُدوِن ہونے کے باوجود حقیر زادِ راہ میں ہیں تو ہم ان منطقی راہوں پر

کیوں گامزن ہیں؟ ہم کس منزل پر پہنچنا چاہتے ہیں؟ کیا انسانیت سے ارفع تر اور اعلیٰ بھی کوئی منزل ہے؟ اگر نہیں تو انسانیت کا نصب العین کیا ہے؟ کیا انسانیت اپنا نصب العین خود متعین کر سکتی ہے یا وہ نصب العین بھی فطت کا مقرر کردہ ہے؟

آپ اگر ان سوالات کی تہہ تک پہنچنا چاہیں تو بغیر کسی ذہنی اشتقاق و مجاہدہ کے روزمرہ کی زندگی کا غور سے مشاہدہ کریں اور دیکھیں کہ فطرت کیسے خود بخود اس معمہ کا تصفیہ کرتی ہے!

طفلکِ نادان نہایت معصومیت اور سادگی سے اپنے گرد و نواح کے متعلق پوچھے گا۔ آخر کیوں؟ لاتعداد برگ و گیاہ و خار و خش کیوں اس طرح متعجب نہیں ہیں؟ عصافیر حیوانات اور حشرات الارض کیوں صرف جبلتوں سے زندہ ہیں؟ وہ کیوں اپنے ماحول سے متاثر نہیں ہوتے؟ انسان کو مُستثنیٰ قرار دیجئے اور پھر سوچئے۔ موالید ثلاثہ میں قوتِ استعجاب اس قدر عدیم و نایاب کیوں ہے؟ صرف انسان کی نگاہِ تحیر رموزِ فطرت کی رنگینیٔ ادا پر سرخوش و سرشار کیوں ہے؟ کیا خالقِ کائنات نے انسان کو قوتِ استعجاب اس لئے بخشی کہ وہ معرفت حاصل کرے؟

ہماری تمام تر سعی لازوال تو اس لئے ہے کہ ہم توبرتو پردے ہٹا کر شادابیٔ حُسنِ ازل سے اپنی مژ مُردہ اور تشنہ کام نگاہِ شوق کو سیراب کریں، اسے پھر جو بندگی بخش دیں اور ہر نئی جلوہ گری پر شعلۂ آرزو کی مدھم لو کو اس قدر تیز کر بین کہ ہجوم تجلی کی بے پناہ یلغار کے سامنے رموزِ فطرت کی تاریکیاں ہتھیار ڈال دیں۔ یہ کامرانی کی منزل ہے۔ صوفیائے کرام نے اسے معرفت اور عرفان کہا ہے۔ فلسفی کے الفاظ میں سحر طراز قوتِ استعجاب کی بدولت ضغطۂ غیب سے آفاقی اقدار کے غنچہ ہائے ناز کو نکال کر انسان نے انہیں جوش نُمو عطا کیا اور خونِ تمنا سے ایسی کاوش جگری کے ساتھ سینچا اور

شبستانِ وجود میں کچھ ایسے گُل کھلائے، کچھ ایسی گُلکاریاں کیں کہ صحرائے تجسس کو دیکھ کر جب بہار گُلفام و آتشیں نگار کے جشنِ شاہانہ مناتی ہوئی چمنستان آرزُو سے گزری اُس کی نظر جوشِ عیقدت سے شرما گئی۔

پس رموزِ فطرت کو پالینا اور عرفان اور معرفت حاصل کرنا ادب عالیہ اور فنونِ لطیفہ کا زرین نصب العین ہے۔

☆

"رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرفِ صوت
مُعجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمُود!"

اقبالؔ

# باب پنجم

ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ شعورِ انسانی نئی منزلوں کی تلاش میں ہے۔ اس شورش و تگاپو کی تلافی آفات اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ رہوارِ استعجاب کو بادیہ پیمائی کے لئے نت نئی جولانگاہ میسر ہے۔ اس صحرائے ذخار میں وہ نخلستان آرزو کونسا ہے، جہاں یہ سمندِ شوق رُکے؟ کسے معلوم، یہ گُم کردۂ منزل ریگ رازِ تجسس میں صرف اپنی وحشتِ پنہاں لئے، اپنا سوزِ دروں سنبھالے خم کاکُل سے شدید جادہ کٹھن پر بھی یُوں محورِ رفتار ہے جیسا کہ وہ چاہتا ہے:

''ہمت بلند چنگل ازیں تیز ترِ بدوٗ''

پس جیسا کہ ہم نے سابقہ باب میں نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انسانیت کا منشاء فطرت کو مسخر کرنا بلکہ فطرت کو سمجھنا ہے۔ تمام علوم وفنون کی بنیاد اسی جذبہ پر قائم ہے۔

اس لئے اَدب عالیہ اور فنون لطیفہ بھی اِس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ اَدب جو آفاقیت کا علمبردار نہیں کسی بھی صورت میں ادب عالیہ نہیں ہو سکتا۔ وہ فن پارہ جو آفاقیت کا آئینہ دار نہیں، فنون لطیفہ کہلانے کا مستحق نہیں۔

ہم فنونِ لطیفہ یا ادبِ عالیہ کی طبقاتی تقسیم نہیں کر سکتے وہ ایک غیر فطری اقدام ہوگا۔ فنونِ لطیفہ اور ادب عالیہ کا سرچشمہ آفاقی انداز ہیں۔ انہیں سمجھ لینا اور ان کی ترویج واشاعت ادب عالیہ کا زرّین نصب العین ہے۔ فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ کی

تخلیق ایک فطری عمل ہے اور آفاقیت اس کی مُحرک ہے۔ ہم اسی جذبہ کی بدولت زندہ ہیں۔ انسانی جبلتیں اپنے ماحول سے شدید طور پر متاثر ہوتی ہیں اور اس تاثر کا اظہار فنونِ لطیفہ یا ادب عالیہ کہلاتا ہے۔ چونکہ ہماری جبلتوں میں نسل یا فرقہ یا قبیلہ یا مُلک کی بناء پر کوئی افتراق نہیں اور اگر کوئی فرق ہے تو وہ نشوونُما کا ہے تو وہ نسوونُما کا ہے۔ انسانی جبلتیں یکساں طور پر افراد میں ودیعت ہوئی ہیں۔ اس لئے ہمارے تمام جذبے آفاقی ہیں اور یہ جذبے جس تفکر کو جنم دیں گے وہ بھی آفاقی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ادبِ عالیہ اور فنونِ لطیفہ کا صرف ایک ہی معیار ہے اور وہ ہے آفاقیت۔ اس کسوٹی پر ہی کسی شہ پارے یا فن پارے کو پرکھا جاسکتا ہے۔ جذبۂ محبت کو لیجئے، وہ آفاقی ہے، جذبہ نفرت کو لیجئے وہ آفاقی ہے، جذبۂ حسد کو لیجئے وہ بھی آفاقی ہے۔ ہمارے حواسِ خمسہ کو لیجئے، کون ہے جو کسی مخصوص قبیلہ کسی خاص نسل یا قوم یا ملک سے تعلق رکھتی ہے؟ ان میں کیا ہے جو آفاقی نہیں؟

جو لوگ ادبِ عالیہ یا فنونِ لطیفہ کی طبقاتی تقسیم کرنا چاہتے ہیں، اُن کے پاس ایسا کرنے کا کیا جواز ہے؟

ہمیں تسلیم کے تان سین کے فن کی داد موسیقی سے آشنا کان ہی دے سکتے ہیں۔ اُس کے فن کی باریکیاں کسی وحشی کے ذوقِ سماعت کے لئے بارِ گراں بھی ثابت ہوسکتی ہیں۔ پال روبسن کی نغمۂ سرائی کسی بہرے یوگو نگے کی نظروں میں کیا وقعت رکھ سکتی ہے؟ فان گاگ کی مصوری سے حظ نگاہِ باریک میں ہی اُٹھاسکتی ہے۔ لیکن اگر غور کیجئے، فرق اقوام وملل کا نہیں، بلکہ صرف جبلتوں کی نشوونما کی ضرورت ہے۔ پھر نہ تو تان سین ہندوستانی رہتا ہے اور نہ پال روبسن امریکی یا فان گاگ فرانسیسی رہتا ہے۔

تاں سین کی موسیقی سے متعلق حکایت ہے کہ وہ زخمہ ور بربطِ دل کے ہر تارِ

شکستہ کو یُوں طاقتِ گویائی بخشتا اور ایسے مُجروح نغمے الاپنا کہ سنگ وخِشت تک سوزِ زندگی سے درد آشنا معلوم ہوتے، اور فضائے بسیط کے طائرانِ آزاد کا ذوقِ تکلّم۔ یاس واُمید کی زنجیر لئے ان معصومانِ فطرت کو اسیرِ محفل بنا دیا اور شمعِ کُشتہ فروزاں ہو کر شمعِ شبستان بن جاتی، جس کی کششِ حُسن غم، لاتعداد پتنگوں اور پروانوں کو قصہ بے نیازی حُسن اور افسانہ بے تابی عشق کی تجدید پر آمادہ کرتی۔

بالکل اسی طرح برسوں بیت جانے کے بعد بھی مرقع فان گاگ میں شاخِ گُل کی آتشِ خنداں آج بھی شرربار نظر آتی ہے اور ہم پر ایسی کیفیتِ افسون طاری ہوتی ہے۔ یعنی اقبال کی زبان میں:

"نظارے کو یہ جُنبشِ مژگاں بھی بار ہے<br>نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی"

پال روبسن کی نغمہ سرائی ہماری رُوحِ گرفتار کے ہر حلقہ زنجیر کی گرہ کھول دیتی ہے۔ یہ لوگ آفاقیت کے علمبردار ہیں۔ ان کا کوئی مُلک نہیں۔ ان کی کوئی قوم نہیں۔ یہ کسی قبیلہ سے تعلق نہیں رکھتے، ان کا مذہب انسانیت ہے۔ ان کے جذبات و تفکر آفاقی ہیں۔ ان کا کردار آفاقی ہے۔ یہ غالبؔ کی طرح قطرہ میں دجلہ دیکھنے کے متمنی ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ ہر فردِ واحد بذاتِ خود اِک محشرِ خیال ہے۔ یہ فردِ واحد کی ذات کی اہمیت کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ اس کی انفرادیت کو قائم رکھ کر انسانیت کو آفاقیت کا سبق سکھاتے ہیں۔ آخر افراد سے ہی تو دُنیا قائم ہے! دانشورانِ عالم کی باریک بین نگاہیں بغیر کسی تعویق کے ان نکتہ ہائے دقیق کو جان لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادبِ عالیہ اور فنونِ لطیفہ کے تخلیق کار نے ہمیشہ فردِ واحد کو منتخب کیا۔ ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے۔ آج کے ادیب اور آرٹسٹ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ

فرد واحد کو نظر انداز کر رہا ہے اور اس کے بجائے گروہ، اجتماع اور طبقات پر زور دے رہا ہے۔ شخصیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ادب کی تخلیق سیاسی مصلحتوں کی بناء پر نہیں کی جاسکتی۔ شخصیت اپنی منفرد حیثیت کے باوجود عالمِ انسانی کی ترجمان ہوا کرتی ہے۔ اس کا ثبوت اگر آپ چاہیں تو شیکسپیر کے لازوال ڈرامہ ہملٹ سے طلب کیجئے۔

ہملٹ کو غائر نگاہ سے دیکھئے کہ وہ انسانی جذبۂ غم کی کیفیتوں سے بھرپور ہے، جن سے ہم سب اپنی صاعقہ بردوش سی زندگی میں کبھی نہ کبھی آشنا ہوتے ہیں۔ اس جذبہ کی ترجمانی ہملٹ سے بہتر کوئی کردار ڈرامہ کا نہیں کرتا۔

ہملٹ ایک دِل گرفتہ انسان کے پریشان دماغ اور رُوحِ بے تاب کی کہانی ہے۔ جو شمعِ طاق کی طرح اپنے سوزِ دُروں میں پگھل پگھل کر فروزاں ہے۔ اُس کی رُوحِ بے تاب، پیکرِ محسوس تو کیا سینۂ سنگ کو آمادۂ اضطراب کرسکتی ہے۔ ہملٹ ایک موجِ بے قرار ہے، جس کا کوئی ساحل نہیں!

ہملٹ ایک ایسا ملاّح ہے، جس کی شکستہ ناؤ ہنگامہ طوفان سے ہی سہارا مانگتی ہے!

ہملٹ ایک تشنہ کام ریگ زارِ ہستی میں اپنے بہرُوپ کے سرابوں سے سہارے کا متلاشی ہے۔

ہملٹ ایک ایسی بہار ہے، جسے شادابی چمن کا کچھ علم نہیں! ہملٹ ایک ایسا ہی راہی ہے جو اپنی ناکامیوں کو نشانِ راہ بنا کر جادۂ ظفریابی کی تلاش میں ہے!

ہملٹ جذبات کا ایک آتش فشاں ہے جو وقتاً فوقتاً لاوا اُگاتا ہے۔ ہملٹ کو پڑھتے وقت ہماری بے حسی ایک قطرۂ بے بُود کی طرح فنا ہوجاتی ہے۔ ہم اُس کی مایوسی کو

پہچان لیتے ہیں۔ ہم اُس کا درد جان لیتے ہیں۔ ہم اُس کے تذبذب کا احترام کرتے ہیں۔

ہملٹ ایک ایسا غُبار آلودہ آئینہ ہے، جس میں صرف ہماری وحشتِ پنہاں کی پرچھائیاں نُمایاں ہیں!

ہملٹ ایک انسانی مقناطیس ہے جو ہماری عزیزی کیفیات کے لئے بے پناہ کشش رکھتا ہے۔ وہ کسی مخصوص طبقے سے تعلق نہیں رکھتا۔ وہ نہ تو سرمایہ دار ہے اور نہ ہی جاگیردار اور نہ ہی مزدور۔

وہ ایک انسان ہے، جسے اپنی کمزوریوں کا اعتراف بھی ہے اور اپنی قوتوں کا احساس بھی ہے۔

وہ ایک آفاقی کردار ہے!

یہ ڈرامہ کے فن کی معراج ہے کہ ڈرامہ نویس ایک فردِ واحد کے کردار کو آفاقیت عطا کر کے اُسے تمام عالمِ انسانی کے جذبۂ رنج ومحن کا ترجمان بنا دیتا ہے۔

☆

''یا مُردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار

جو فلسفہ لکھا نہ گیا خُونِ جگر سے''

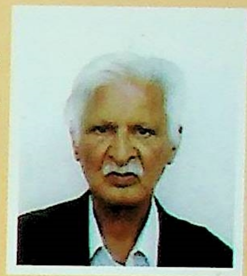
اقبالؔ

# حرفِ آخر

''میں نے آفاقیت جیسے کٹھن موضوع پر قلم اُٹھانے کی جرأت کی ہے اور فنونِ لطیفہ اور ادبِ عالیہ کے آفاقی کردار کو آشکارا کیا ہے۔ میں نے ایک فلسفۂ حیات کو قاری کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، مجھے معلوم نہیں کہ قاری اُسے مردہ پائے گا یا نزع کی حالت میں گرفتار''...... میں نے الفاظ کے پیچوں میں اُلجھنے سے بچنے کی ہر ممکن سعی کی ہے اور خیالات پیش کردہ پر میری ساری توجہ مرکوز رہی ہے، اِس اُمید پر کہ یہ خیالات قاری کے ذہن میں بھی ایسے ہی خیالات کی تولید کا باعث ہوں گے۔ اس رسالے کے مضامین میں وقتاً فوقتاً قلم برداشتہ تحریر کئے گئے تھے۔ مجھے اپنی کمزوریوں کا اعتراف ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ان مضامین میں ادبی نقطہ نظر سے خامیاں ہوں گی۔ لیکن قاری سے التماس ہے کہ وہ میری مشکلات کو مدِ نظر رکھے۔ ایک فلسفیانہ موضوع پر اُردو میں کچھ تحریر کرنا بہت ہی کٹھن کام تھا۔ خیالات کے اظہار کے لئے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ مقالہ لکھتے وقت میں نے ان کی کمی کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ کئی باتیں ایسی بھی تھیں جو میں نے کہنا چاہیں اور نہ کہہ سکا۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے، قاری سے یہ عرض ہے کہ باب اول، دوم اور سوم میں، میں نے ادبِ عالیہ اور فنونِ لطیفہ کے آفاقی کردار کا جائزہ سائینسی اور تاریخی پسِ منظر میں لیا ہے۔ لیکن جہاں تک باب چہارم کا تعلق ہے۔ اُس میں، میں نے اپنا نجی نقطۂ نگاہ پیش کیا ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ اس میں اور دیگر مضامین میں کچھ تضاد ہو۔ جہاں تک باب پنجم کا تعلق ہے، وہ عصرِ حاضر کے دانشورانِ نکتہ داں سے ایک مودبانہ گزارش ہے کہ وہ شخصیت کو نظر انداز نہ کریں۔ آفاقیت کی اَساس شخصیت پر ہی قائم کی جاسکتی ہے۔''

☆☆☆

ساہتیہ اکیڈمی دہلی کو از خود اس کتاب کا نوٹس لینا چاہئے۔ یہ کتاب کسی سفارش کی محتاج نہیں۔ یہ کتاب ذہن چونکا دینے والی تحریر ہے۔ یہ ایک طرف ادب عالیہ کا بہترین مرقع ہے تو دوسری طرف کشمیر کی تاریخ سے متعلق کئی سوالات کی نشاندہی کرتی ہے۔ جو ہنوز بھی جواب طلب ہیں۔ تصدق صاحب نے مولانا عبدالحلیم شرر اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کے احیا کی سعی کی ہے چونکہ یہ طرز تحریر اب اُردو دان طبقہ میں کمیاب نظر آتا ہے۔ اس لئے یہ سعی قابلِ ستائش ہے۔



نام: تصدق حسین، پیدائش: ۱۳، اکتوبر سرینگر ۱۹۳۹، پیشہ: وکالت-ایڈیشنل پبلک پراسیکوٹر کشمیر صوبہ اور سٹینڈنگ کونسل یونین آف انڈیا کے بطور خدمات انجام دینے کے علاوہ اور کشمیر یونیورسٹی کے سینر وکیل کے طور پر بھی کام کیا اور تینوں عہدوں سے مستغفی ہو کر اپنی دنیاوی ترقی کی راہیں خود مسدود کر دیں چونکہ انہیں کشمیر سے عشق ہے۔ اور خودکشی کرنا عشق کی انتہائی منزل ہے۔ ڈاکٹر اقبالؔ نے کہا ہے:

میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں!

شغل: تصنیف وتالیف۔ تا کہ اس دار فانی سے کوچ کرنے کے بعد بھی ان کے خیالات کے کھنڈرات کچھ کھوج کرنے والوں کو دستیاب ہوں۔ ابھی تک موصوف نے کشمیر سے متعلق چھ کتابیں تحریر کی ہیں۔ مگر انکی تشہیر سے ناشرین کو منع کر دیا ہے کہ ابھی وقت موزون نہیں ہے۔ خاندان: شادی خانہ آبادی، ۱۴ ستمبر ۱۹۶۸- اہلیہ عذرا حسین- اولاد ایک لڑکا، مجتبیٰ حسین اور دختر شہلا حسین ارادے: نیک ہیں- فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبالؔ کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے:

اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے
اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے!



Kitab Mahal
SRINAGAR-KASHMIR
Email:infokitabmahal@gmail.com

History / Literature
ISBN 978-93-87244-21-4
INR.899
9 789387 244214
US $.21.99

ساہتیہ اکیڈمی دہلی کو ازخود اس کتاب کا نوٹس لینا چاہئے۔ یہ کتاب کسی سفارش کی محتاج نہیں۔ یہ کتاب ذہن چونکا دینے والی تحریر ہے۔ یہ ایک طرف ادب عالیہ کا بہترین مرقع ہے تو دوسری طرف کشمیر کی تاریخ سے متعلق کئی سوالات کی نشاندہی کرتی ہے۔ جو ہنوز بھی جواب طلب ہیں۔ تصدق صاحب نے مولانا عبدالحلیم شرر اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کے احیا کی سعی کی ہے چونکہ یہ طرز تحریر اب اُردو دان طبقہ میں کمیاب نظر آتا ہے۔ اس لئے یہ سعی قابلِ ستائش ہے۔



نام: تصدق حسین، پیدائش: ۱۳، اکتوبر سرینگر ۱۹۳۹، پیشہ: وکالت۔ ایڈیشنل پبلک پراسیکیوٹر کشمیر صوبہ اور سٹینڈنگ کونسل یونین آف انڈیا کے بطور خدمات انجام دینے کے علاوہ اور کشمیر یونیورسٹی کے سینئر وکیل کے طور پر بھی کام کیا اور تینوں عہدوں سے مستعفی ہو کر اپنی دنیاوی ترقی کی راہیں خود مسدود کر دیں چونکہ انہیں کشمیر سے عشق ہے۔ اور خودکشی کرنا عشق کی انتہائی منزل ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے:

میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں!

شغل: تصنیف و تالیف۔ تاکہ اس دار فانی سے کوچ کرنے کے بعد بھی ان کے خیالات کے کھنڈرات کچھ کھوج کرنے والوں کو دستیاب ہوں۔ ابھی تک موصوف نے کشمیر سے متعلق چھ کتابیں تحریر کی ہیں۔ مگر انکی تشہیر سے ناشرین کو منع کر دیا ہے کہ ابھی وقت موزون نہیں ہے۔ خاندان: شادی خانہ آبادی، ۱۴ ستمبر ۱۹۶۸۔ اہلیہ عذرا حسین۔ اولاد ایک لڑکا مجتبیٰ حسین اور دختر شہلا حسین ارادے: نیک ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے!



Kitab Mahal®
SRINAGAR-KASHMIR
Email:infokitabmahal@gmail.com
ISBN 978-93-87244-21-4
INR.899
History / Literature
9789387244214
US $.21.99